

اردو
کی
ادبی
تاریخ
پروفیسر عبدالقادر سروری

نام کتاب ـــــــــــــ اردو کی ادبی تاریخ
نام مصنّف ـــــــــــــ عبدالقادر سروری
کتابت ـــــــــــــ جی این ڈار (سوپور)
قیمت ـــــــــــــ 50/=
تعداد ـــــــــــــ 1000
بار اول ـــــ سنہ ۱۹۸۷ء ـــــ
بار دوم ـــــ سنہ ۱۹۹۳ء ـــــ

ـــــ پبلشرز: ـــــ
گلشن پبلشرز۔ گاؤکدل چوک سرینگر
شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجران کتب
ایکسچینج روڈ۔ گاؤکدل چوک سرینگر کشمیر
فون نمبر: ۷۲۰۸۱

فہرست مشتملات

دوسری طباعت کے لئے

اُردو اَدب کو اس کے ارتقا کے مختلف ادوار میں تاریخی اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ پیش کرنے کی یہ پہلی کوشش اردو کے علماء اور طلباء کے مطالعے میں جگہ پیدا کر سکی، چنانچہ کئی یونیورسٹیوں میں یہ شامل نصاب بھی کی گئی ہے۔ اس کی پہلی طباعت کے نسخے عرصہ ہوا ختم ہو چکے تھے لیکن میری اپنی دوسری مصروفیتوں کے سبب سے، مجھے اس پر تفصیلی نظر ثانی کرنے اور طباعت کا انتظام کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ کتب فروش اصحاب اور یونیورسٹیوں کے مسلسل تقاضے اور طلب کی وجہ سے، اس کے بعض حصوں پر ضروری نظر ثانی کے بعد اس کی دوسری اشاعت اب قارئین کرام اور اُردو ادب کے طلبا کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

'عبدالقادر سروری'
سرینگر (کشمیر)
مورخہ ۹ مئی سنہ ۱۹۷۰ء

چند کلمے

ادب حیات کا سایہ رو ہے اور اسی کے سہارے نشو و نما پاتا ہے۔ اس کا خمیر، زبان کے بولنے والوں کی سیاسی، سماجی، معاشی اور فنی روایات سے تیار ہوتا ہے۔ اسی لئے ادب کو قوم کے ذہنی میلانات کی تاریخ کا آئینہ دار کہا گیا ہے انسان کا ذہن اور اس کی نفسیات ہزار شیونات رکھتی ہے اور مختلف زبانوں میں قوم کے داخلی میلانات یا خارجی محرکات جو رخ اختیار کرتے ہیں۔ اُن کے لحاظ سے، ادبی اظہارات میں کم یا زیادہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور نئے نئے پہلو ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ قومی نفسیات کسی ایک زمانے میں فن کاری کے کسی خاص رخ کی طرف، زیادہ مائل ہو سکتی ہے اور اظہار کے خاص خاص اسلوب اختیار کر سکتی ہے۔ ان سب کا پرتو قوموں کی ادبیات میں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ قومی مذاق جب ایک پہلو سے ترقی کرتا ہے، تو دوسرے

پہلو سے وہ تنزل نہیں کر سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ قوم کا ذہن چھوٹے بڑے خانوں میں بٹ جائے جن میں سے بعض میں اچھے آثار کے مظہر ہوں اور بعض سے برے رجحانات ظاہر ہوں۔ ذہن جب تغیر کا رخ کسی ایک خاص رخ کی طرف بڑھتا ہے تو زیادہ غیر ادبی کارناموں میں بھی وہ اس کے مماثل اور متشابہ رخ کی طرف بڑھے گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کی مخالف سمت میں نشو ونما پائے؟ یہ صحیح ہے کہ بعض وقت مناسبتوں کو تلاش کرنا آسان کام نہیں رہتا۔

آئندہ ادبی تاریخ لکھنے والے کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ادبی مظاہر کو سیاسی معاشی، سماجی اور فنی ماحول میں پیش کرنے کی کوشش کرے۔ ہماری سیاسی تاریخ تو مدون ہے۔ لیکن معاشی، سماجی اور فنی تاریخ اتنی مرتب نہیں ہے کہ اس کا مسالہ ایک چھوٹی کتاب میں آسانی سے فراہم کیا جاسکے اور اس کے ساتھ ادبی مظاہر کی نشو ونما کو جوڑ کر سب کے عمل اور ردعمل کو نمایاں کیا جاسکے۔ یہ مختصر سی کتاب اس سعی کا آغاز سمجھی جاسکتی ہے۔ اس میں ادبی تاریخ کو خود مکتفی شعبہ زندگی کی حیثیت سے، اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے ہٹا کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ جہاں تک مواد دستیاب ہو سکا ہے، ہر عہد کے کارناموں کو ان کے سیاسی، سماجی اور فنی ماحول کے درمیان پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ مروجہ نوعیت کی تفصیلی تاریخ ادب نہیں ہے۔ اس میں رجحانات محرکات پر زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ یہی ادب کے مزاج کو بناتے ہیں اور خود ادیبوں

اور شاعروں کی ذہنی ساخت کے بھی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس مخصوص نقطۂ نظر کے لحاظ سے یہ غیر اہم بات ہو جاتی ہے کہ ذیلی تفصیلات اس میں ہوں یا نہ ہوں۔ چنانچہ ایک ہی رجحان کے بہت سے لکھنے والوں کی تفصیلات دینے بلکہ اُن کی طرف اشارہ کرنے کی بھی، ان صفحات میں گنجائش کم نکل سکی۔ اور ان تفصیلات پر اسے حادی بنانے کا منشا بھی نہیں تھا۔ اس لئے اس کی کوشش بھی نہیں کی گئی ہے۔

اُردو کی ادبی تاریخ کی یہ مختصر سی اولین کوشش ہمارے ادبی اظہارات کو اگر کسی حد تک بھی دلچسپ اور زندگی کے ہم قرون رجحانات کے ساتھ تھوڑا بہت بھی ہم آہنگ بنا کر قارئین اور طالب علموں کے سامنے رکھ سکے، اور یہ آئندہ کی وسیع ادبی تاریخ کا تخم ثابت ہو سکے تو میں اس سعی کو ممنون سمجھوں گا۔

عبدالقادر سروری

حمایت نگر، حیدرآباد
مورخہ ۱۹ اگست سنہ ۱۹۵۸ء

قدیم ہندوستان
عظیم ہندوستان

ہندوستان کی تاریخ، ہندوستان کی تہذیب اور ہندوستان کی زبان کی کہانی بڑی پرانی کہانی ہے۔ شمال میں سربلند پہاڑوں سے محفوظ اور جنوب میں گہرے سمندروں سے گھری ہوئی اس سرزمین پر کیا کیا حادثات پیش آئے اس کی تفصیل اب کوئی نہیں بتا سکتا۔ ماہر ارضیات تو کہتے ہیں کہ اس ملک کی جو صورت اس وقت ہے، ہزاروں برس پہلے ایسی نہیں تھی۔ زمین سکڑتی گئی اور پہاڑ ابھرتے گئے۔ جنوب میں راون کا دیش ہمارے دیش سے الگ نہیں تھا۔ اور اب لنکا کے اور بھارت کے درمیان جہاں سمندر ہے وہاں زمین تھی۔ یہ رامائن کے دور سے بھی برسوں پہلے کی بات ہے

یہاں کے قدیم بسنے والے آسٹرک نسل کے لوگ تھے۔ لیکن وہ کہاں کہاں آباد تھے پتہ نہیں چلتا۔ انھوں نے اپنی زبانوں کا جو اثر چھوڑا، وہ

ہماری زبانوں میں سرایت کر گیا ہے۔ یہاں کے پرانے رہنے والے دراوڑ لوگ بھی تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ بھی باہر سے آئے تھے۔ دراوڑ لوگ اب جنوبی ہند میں کھسک کر آ گئے ہیں۔ لیکن کسی زمانے میں شمال میں بھی انہیں کی بستی تھی۔ مشرق میں وہ اڑیسہ سے پرے اور مغرب میں شاید ایران تک پھیلے ہوئے تھے۔ بلوچستان میں اُن کے زبان کے آثار براہوئی کی شکل میں اب بھی موجود ہیں۔ سندھ میں موہنجوڈارو اور ہڑپا کی کھدائیوں سے ان کی تہذیب اور شائستگی کے بہت سے آثار ملے ہیں۔ بعد میں یہاں بڑہن آئے، سیتھین آئے، آریا آئے، یونانی آئے، عرب آئے، ایرانی آئے افغان آئے، انگریز آئے، غرض ساری دنیا کی نسلوں اور قوموں کا ساتھ یہاں ملتا ہے۔ کچھ آریا کہتے ہیں کہ ہم باہر سے نہیں آئے بلکہ یہ دیش ہمارا پرانا دیش ہے۔ ہمارے پہلے آباؤ اجداد اسی سرزمین پر ابتدا میں آباد تھے۔ سرسوتی ندی کے قریب ہمارا پہلا گھر تھا۔ وہیں سے بڑھ کر آریا افغانستان، ایران، اور یورپ کے ملکوں کو گئے۔ لیکن محققوں کا کہنا ہے کہ آریا لوگ پہلے پہل روس کے گھاس کے میدانوں میں بستے تھے یہ گورے چٹے خانہ بدوش لوگ تھے اور گلہ بانی کرتے تھے۔ جب ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تو وہ اپنے مویشیوں کے لئے گھاس کے میدانوں کی تلاش میں نکلے کچھ قبیلے مغرب کی طرف گئے اور یونانی آسٹریا، ہنگری، یوگوسلاویہ، فرانس، ہسپانیہ، اور جرمنی میں بس گئے۔ کچھ سمندر پار کر کے انگلستان بھی پہنچ گئے۔ ان کے کچھ اور قبیلے ایران

اور افغانستان میں گئے اور وہیں بس گئے۔ انہیں میں سے کچھ قبیلے آگے بڑھ کر ہندوستان آئے۔

ہندوستان میں وہ سب ایک وقت اور ایک ساتھ نہیں آئے بلکہ سالہا سال کے وقفوں سے آتے رہے اور نئے آنے والے پرانے لوگوں کو دھکا دے کر نکالتے اور اُن کے دیس میں خود آباد ہوتے رہے۔ کچھ اطراف کے مقامات میں بھی پھیل گئے۔

ان کے الگ الگ قبیلے الگ الگ مگر ملتی جلتی بولیاں بولتے تھے۔ ان میں تہذیبی روایات کی ابھی نشو و نما نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ان کے پرانے تجربوں نے انہیں کچھ اعتقادات دے دیئے تھے اُن کی مقدس اور مذہبی کتابوں کے شلوک بھی تھوڑے سے بہت ان میں رائج ہو چکے تھے۔ بعد میں اُن کی مقدس کتابیں رگ وید، اتھروید، اور یجر وید مدوّن ہوئیں برہمنوں کے گیت لکھے گئے اور "اُپنشد" کی صورت میں ان کے فلسفہ کی بھی تدوین ہوئی۔

آریا جب پنجاب اور اس کے بعد مدھیہ پردیش اور اس کے اطراف و اکناف میں بس گئے اور اپنی خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے کھیتی باڑی کرنے لگے۔ تو ان میں تہذیبی روایات نشو و نما پانے لگیں۔ وہ ذہین لوگ تھے۔ اور فلسفہ، ادب اور آرٹ سے ان کو دلچسپی تھی۔ ان میں کئی زبانیں رائج تھیں۔ جنہیں "پراکرتوں" یا "ابتدائی پراکرتوں" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ پراکرتیں پانچ یا چھ تھیں۔ ان میں سب سے اہم

مہاراشٹر پراکرت سمجھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ دوسری اہم پراکرت شورسینی تھی۔ جو مدھیہ پردیش کے رہنے والے بولا کرتے تھے۔ سندھ کے لوگ وڈاچڈ پراکرت میں بات چیت کرتے تھے۔ اور پنجاب کے لوگوں میں پیشاچی رائج تھی لیکن شورسینی کا اثر و نفوذ وہاں تک بھی پھیلا ہوا تھا۔ مشرق میں ماگدھی اور اردھ ماگدھی کا چلن تھا۔ اجین میں جو پراکرت بولی جاتی تھی، اُسے آونتی کا نام دیا جاتا ہے۔

لیکن ان میں جلد ہی ایک شستہ اور معیاری زبان بھی نشوونما پانے لگی، جسے ہم سنسکرت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ سنسکرت کے معنی شستہ کے ہیں۔ اس معیاری زبان میں آریوں کا بہت سا مذہبی ادب محفوظ ہے ویدوں کے علاوہ "برہمن"، مہابھارت، رامائن، اُپنشد، گیتا اور بہت سے عمدہ عمدہ ناٹک اسی زبان میں ہیں۔ یہ شاعری کی بھی زبان ہے اور الفاظ اور قواعد کے اعتبار سے بڑی مالا مال ہے۔ پانی نی وہ پہلا مشہور عالم ہے، جس نے اس زبان کے قواعد مدوّن کئے۔

ویدوں کا زمانہ بعض علماء نے دو ہزار پانچ سو قبل مسیح متعین کیا ہے۔ لیکن سنجیدہ محققوں کی رو سے یہ زمانہ ایک ہزار پانچ سو قبل مسیح کا ہے اس زمانے میں ویدیں، "برہمن" یعنی برہمن مذہب کے پوجا اور بھینٹ کے گیت اور "اپنشد" کی تدوین عمل میں آئی۔ ۱۵۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۶۰۰ ق م تک کا زمانہ ہند آریائی زبانوں کا قدیم دور تھا۔ ۶۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ عیسوی تک درمیانی ہند آریائی کا دور متعین کیا گیا ہے۔

اس عرصہ میں پراکرتوں کا ادبی نشو و نما ہونے لگا۔ نہ ان میں کچھ نظمیہ ادب اور ناٹک لکھے گئے۔ پراکرت ناٹکوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مختلف ذاتوں کے لوگ اور مختلف طبقوں کے اداکار مختلف پراکرتیں بولتے ہیں۔ عام طور پر برہمن سنسکرت میں بات چیت کرتے ہیں چھتری۔ شورسینی میں، عورتیں مہاراشٹری میں، گاؤں میں بھی عموماً مہاراشٹری پراکرت استعمال ہوتی تھی۔ ادنیٰ ملازم ماگدھی یا اردھماگدھی بولتے ہیں۔

اسی زمانے میں ایک اور پراکرت کی نشو و نما ہوئی۔ یہ پالی کہلاتی ہے۔ پالی کے بارے میں خیال یہ ہے کہ یہ کوئی مغربی پراکرت ہے، جسے بدھمت کے عالموں نے اپنے مذہب کے عقائد اور ادب لکھنے کے لئے برہمنوں کی زبان سنسکرت کے مقابلے میں استعمال کیا۔ بعض لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ پالی ایک عوامی زبان تھی، لیکن جب وہ تحریری اغراض کے لئے استعمال ہونے لگی تو تحریری پالی کی نشو و نما رک گئی۔ اور عوامی بول چال کی پالی برابر ترقی کرتی رہی۔ اس بول چال کی پالی کے آخری روپ اور اردو کے ابتدائی روپ میں بہت کچھ مشابہت ہے۔

۱۰۰۰ء سے جدید ہند آریائی زبانوں کی نشو و نما ہونے لگی اور مختلف پراکرتوں سے کئی کئی بولیاں پیدا ہوئیں۔ اور ان میں سے بعض ادبی اغراض کے لئے استعمال ہونے لگیں اور معیاری زبانیں بن گئیں۔ ان میں پیشاچی پراکرت سے مشرقی پنجابی اور لہندی نشو و نما پائی۔ وراچڈ پراکرت سے سندھی زبان، مہاراشٹری سے مرہٹی، ماگدھی پراکرت سے بہاری

اڑیا، بنگالی اور آسامی کی نشوونما ہوئی۔ اور اردھ ماگدھی سے مشرقی ہندی نمودار ہوئی۔ ان زبانوں میں سے ہر ایک کی کئی کئی بولیاں بھی ہیں۔ شورسینی پراکرت سے جن زبانوں کی نشوونما ہوئی ان کے مجموعی گروہ کا نام مغربی ہندی دیا گیا ہے۔ مغربی ہندی کی بولیاں بندیلی، قنوجی، برج بھاشا، کھڑی بولی اور ہریانی مانی جاتی ہیں۔ کھڑی بولی کا نام ایک سہولت بخش نام کے طور پر اردو اور ہندی کی بنیادی زبان کے لئے استعمال اب ہونے لگا ہے۔

لیکن بعض اور علماء کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ اردو کی نشوونما پنجابی کے اس روپ سے بتاتے ہیں، جو ملتان اور اس کے اطراف میں بولی جاتی تھی۔ اس پر شورسینی کا بھی گہرا اثر تھا کیونکہ شورسینی مدھیہ دیس کی زبان تھی۔ اور مدھیہ دیس، زمانہ قدیم سے سارے ہندوستان کا تہذیبی اور لسانی کعبہ رہا ہے۔ اس لئے یہاں کی علمی اور تہذیبی روایات اس کے بولنے والوں کے ساتھ مشرق، اور مغرب میں دور دور تک پہنچتی تھیں۔

ہندوستان کی مقدس کتابوں کی تدوین کے بارے میں ہندو یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر پران ناتھ کا خیال ہے کہ ان کی تدوین اور خاص طور پر رگ وید کی تدوین، ہندوستان میں نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر شام میں ہوئی تھی چنانچہ انھوں نے اس مقدس کتاب میں بہت سے سامی اثرات کا پتہ دیا ہے۔ آریوں کے ہندوستان آنے کا زمانہ

سات ہزار قبل مسیح سے لے کر پندرہ سو قبل مسیح تک بتایا جاتا ہے لیکن عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ۲۵۰۰ قبل مسیح میں وہ ہندوستان آچکے تھے۔

ہندوستان میں آریوں کو دراوڑ لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑا بالآخر انھوں نے دراوڑ لوگوں کو مغلوب کر لیا اور رفتہ رفتہ انہیں جنوبی جزیرہ نما کی طرف دھکیل دیا۔ آریا دراوڑ لوگوں کے بارے میں بہت اچھا خیال نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ انہیں انسانیت کے درجے سے گرا ہوا جانتے تھے لیکن جب انہیں دراوڑ لوگوں پر فتح حاصل ہو گئی، اور وہ یہاں بس گئے تو تصورات اور تہذیبی اجزا کا لین دین شروع ہوا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دراوڑ لوگ بہت متمدن تھے۔ جس کا ثبوت ہم کو موہنجوڈارو اور ہڑپا کے آثار سے بھی ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے فاتحین آریوں کو تہذیبی حیثیت سے مغلوب کر لیا۔ کیونکہ نووارد آریا خانہ بدوشوں کے پاس تہذیبی روایات کا فقدان تھا۔ اس کے مقابلے میں آریوں نے عام طور پر اپنے مذہب کو دراوڑ لوگوں میں پھیلایا۔ دراوڑ دیوتاؤں کو بھی انھوں نے اپنے مذہبی دیوتاؤں میں شامل کر لیا۔ اسی طرح سے دراوڑ اور آریا عناصر سے ایک تہذیب کی نشو و نما ہوئی، جس پر بعد کو کچھ یونانی اور ایرانی اثرات بھی پڑے۔

آریا ہند آنے کے بعد برہمن، چھتری، ویش اور شودر چار ذاتوں پر بٹ گئے تھے۔ علما کا خیال یہ ہے کہ دراصل آریہ ذات نظام میں تین ذاتوں

فضا میں بھی رہتے تھے اور زمین پر بھی۔ ان میں اہم اندر اگنی، سوما اور درد مانے جاتے تھے۔ پرجاپتی تخلیق کے دیوتا تھے۔ وشنو اور رودر اشیوا کی اہمیت زیادہ نہیں تھی۔ قدیم ویدی دیو مالا کے لحاظ سے برھما سب دیوتاؤں کے سردار تھے۔

ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کے چینی اور عرب سیاحوں اور سنسکرت ناٹکوں سے پتہ چلتا ہے کہ بدھ اور جین مت اس وقت زوال آمادہ تھے ویدی مذہب میں بہت کچھ تبدیلی ہو چکی تھی۔ اور شیو پوجا، مذہب جمہور بن گئی تھی۔ ابوزید الحسن سیرانی جو اس زمانے میں ہندوستان آیا تھا لکھتا ہے کہ کئی فقیر اُسے ایسے نظر آئے جو اپنے گلے میں انسانی کھوپڑیوں کا ہار بنا کر پہنے رہتے اور انہیں میں کھاتے پیتے تھے۔ یہ لوگ شیو کو ماننے والوں میں سے ایک خاص فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جو "کاپالیکا" کہلاتا تھا شہرستانی اپنی کتاب "الملل والنحل" میں بسو یا فرقے کا بھی ذکر کرتا ہے جو دراصل وشنو کے ماننے والا تھا۔ البیرونی کے زمانے میں شمالی ہند میں شیو کے ماننے والوں کی تعداد بہت گھٹ گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں وشنو فرقے کے لوگ زیادہ تھے۔

ملتان اور اس کے آس پاس سوما فرقے کے لوگوں کی کثرت تھی جس کا تذکرہ چینی سیاح ہیون سانگ، اور عرب سیاحوں میں ابن حوقل اور اصطخری نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ گنپتی یا گنیش، سکند اور چندرا کے پوجنے والے فرقوں کی تعداد بھی کافی تھی

بدھ مت کا آغاز برہمنیت کی مخالفت کے جذبے سے ہوا تھا۔ اسی لیئے روح اور خدا کے بارے میں جو برہمنی تصورات تھے، بدھ مت نے ان کی نفی کی۔ کائنات کو اس مذہب میں ایک اتفاقی تنظیم مانا جاتا تھا۔ برہمنی مذہب کے عقیدۂ تناسخ کا بھی یہ مذہب قائل نہیں تھا۔ اس مذہب کی ریاضتوں کا مقصد "نروان" یا نجات تھا۔ بدھ مذہب کے دو فرقے ہنایانہ اور مہایانہ تھے۔ جن میں کچھ ذیلی اختلافات تھے۔ ہنایانہ فرقہ کا رجحان حقیقت پسندانہ اور مہایانہ کا تصور پسندانہ تھا۔

جین مت کی اہمیت، ہندوستان کے مذاہب میں اُس کے فلسفیانہ مذہبی نظام کی وجہ سے ہے۔ جین مت وجود مطلق کا قائل نہیں بلکہ حقیقت کو دو نفس اور غیر نفس میں تقسیم کرتا ہے۔ نفس کے ماتحت دو طرح کی چیزیں آتی ہیں ایک تو غیر متحرک جیسے دھاتیں، آگ، پانی، ہوا، پودے وغیرہ اور دوسرے متحرک جن میں سارے ذی روح شامل ہیں۔ اُن میں سب سے اونچے وہ ہیں جو حواس خمسہ سے متصف ہیں۔

ہندوؤں کے تین بڑے فلسفیانہ نظام ہیں (۱) وشنوا یا گوت (۲) شیوا (۳) تانترک۔

وشنو نظام پنچرانا، یا بھاگوتا نظام بھی کہلاتا ہے۔ اس میں وشنو حقیقت مطلق مانا جاتا ہے۔ شکتی وہ توانائی ہے جو وشنو کا مظہر ہے شکتی کے دو رخ ہیں ایک کو "کریا شکتی" کہتے ہیں اور دوسرے کو "بھوتی شکتی" کریا شکتی وشنو کی مشیت ہے اور بھوتی شکتی رحم یا منبع کائنات۔ کریا شکتی

کے اعتبار سے تخلیق کے پہلے مظاہر خدا کی صفات، علم، خدائیت، قوت، لطافت، زور اور عظمت ہیں۔ تخلیق کے دوسرے مظاہر اوتار اور تیسرے اور آخری مظاہر ہیں کائنات ہے۔ تخلیق کا ایک دور ہوتا ہے جس کے بعد تخریب شروع ہوتی اور کائنات وشنو میں جہاں سے وہ پیدا ہوئی جذب ہو جاتی ہے۔

شیوا نظام فلسفہ کا آغاز دوسری صدی قبل مسیح میں ہوا تھا۔ بعد میں اس کے کئی دبستان ہو گئے۔ اس نظام میں شیو، وہ ذات مطلق ہے جو تخلیق، تحفظ تخریب، تخفیف اور بخشش کی قوتوں سے متصف ہے۔ منفرد روح متحرک، خود شعوری ہے۔ اور اس کا وجود بھی ذات مطلق کے ساتھ ابدی ہے۔ اس میں کبھی کبھی کھوٹ بھی پیدا ہو جاتا ہے، جسے نیک عمل، یوگ، مراقبے اور "چریا" یعنی ضبط کے ذریعے سے دور کیا جا سکتا ہے۔ نیک اعمال، منتروں کا جپنا، اور رسوم کا ادا کرنا ہے۔ یوگ، سانس کا روکنا ہے اور ضبط میں تپس شامل ہے۔ روح آزاد ہونے کے بعد خود شیو سے جا ملتی ہے لیکن اپنی انفرادیت برقرار رکھتی ہے۔

شیو نظام فلسفہ پر اعتقاد رکھنے والوں میں ایک فرقہ پاشو پتیا یا ملامتیہ تھا۔ یہ مراقبے کے ذریعہ سے ترک عمل کرتے تھے۔ یہاں تک کہ صرف احساس باقی رہ جاتا۔ یہ جسم پر تین مرتبہ بھبوت ملتے اور ایسی حرکات کرتے جن پر لوگ ملامت کریں۔ ایک فرقہ کپالیکا، یا کالا سکھا بھی تھا۔ یہ لوگ گلے میں انسانی کھوپریوں کا ہار پہنتے تھے۔ اور ہاتھوں میں سونٹے برچھے، شراب کے مٹکے لئے پھرتے اور راکھ پھانکتے۔ یہ لوگ کشمیر سے تعلق رکھتے تھے لیکن بعد میں

دکن تک پھیل گئے تھے۔

نجات کا ایک طریقہ بھگتی کا بھی تھا، جس میں اپنے دیوتا کی پرستش محبت کے جذبات کے ساتھ کی جاتی تھی۔ بھگتی پر سب سے پہلی کتاب جو ملتی ہے وہ بھگوت گیتا ہے۔ اس میں شری کرشن یہ بتاتے ہیں کہ ان کے تصور میں غیر متزلزل طریقے پر غرق رہنے سے اُن تک رسائی ہو سکتی ہے۔

بھگتی کے عقائد کی نشو ونما بدھ مت کے مہایانہ دبستان میں ہوئی۔ اس کا مرکز بدھ، بدھی ستوا اور خاص طور پر امی تابھا کی ذات تھی، جو ابدی دیوتا ہے۔ اور اپنی سکھ دتی یا جنت میں رہتا ہے اس کے بھگتیوں کا مقصد نروان نہیں بلکہ اس کی بارگاہ میں حضوری ہے۔

ادبی اور فنی اعتبار سے قدیم ہندوستان کے کارنامے یہاں کی قدیم تہذیب کے ارتقا کے مدارج پر روشنی ڈالتے ہیں۔ قدیم ہندوستان میں ادبی اظہارات کا واحد ذریعہ سنسکرت زبان تھی۔ نظم اور ناٹک قدیم ہندوستان کے نہایت ترقی یافتہ اصناف تھے۔ رامائن اور مہابھارت کے علاوہ بھگوت گیتا ہندوستان کے لازوال ادبی کارنامے ہیں۔ گپت عہد کی علمی سرپرستی کے باعث سنسکرت علم و ادب کو بڑی ترقی ہوئی۔ ناٹک لکھنے میں بھی ہندوستان کے ادیبوں نے بڑی ترقی کرلی تھی۔ چنانچہ "شکنتلا"، "بال چرتم" وغیرہ دنیا کے شہ کاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ناٹک کی حد تک یونان کے علاوہ شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے ناٹک لکھنے کے لیے اصول مدون کئے تھے۔ یہ اصول بھرت کی "نٹیہ شاستر" میں اکٹھے کردیئے گئے ہیں۔ ان میں ناٹک کی قسموں، اداکاری

کی لو عبتوں ۔ ناٹک کے عناصر، عمل، خاکے، موسیقی، گانوں غرض ہر پہلو پر تفصیلی بحثیں لکھی گئی ہیں۔

تعمیر کاری کے فن کے علاوہ تصویر کشی اور مورت گری کے فنوں کو بھی اہلِ ہند نے بلند ترین مدارج پر پہنچا دیا تھا۔ تعمیر کاری کے سب سے قدیم نمونے ہڑپا اور موہنجوڈارو میں ملتے ہیں۔ یہ آثار اور تہذیب کے دور سے تعلق رکھتے ہیں، یہاں تعمیر کاری کا جو اندازہ ملتا ہے وہ کافی ترقی یافتہ اور فن کارانہ ہے۔ بعد میں آریوں کا دور آتا ہے۔ جس میں تعمیر کاری کے دراوڑ اور آریائی مذاق کے ملے جلے نمونوں کی نشوونما ہوئی۔ بدھ مت کی تحریک نے بھی ہندوستان تعمیر کاری کو کافی اونچا اٹھایا۔

اشوک کے عہد کی تعمیر کاری، اعلیٰ فنی خصوصیات کی حامل تھی تعمیر کاری کی فنی خصوصیات کے لحاظ سے اشوک کے شاہی محل کا مقابلہ ایران کے بادشاہ دارا کے محل سے کیا گیا ہے اور اس میں ایرانی اثرات کا پتہ چلایا گیا ہے۔ اشوک کی لاٹیں بھی ہمارے ملک کی قدیم تعمیر کاری کے ذوق کا اچھا نمونہ ہیں۔ اس کے عہد میں بہت سے اسٹوپ بھی بنائے گئے۔ جن میں بھرہت کا اسٹوپ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جو دوسری صدی قبل مسیح سے تعلق رکھتا ہے۔ سانچی کی تعمیروں میں ہندوستانی فن کاری کے ارتقاء کی تاریخ مل جاتی ہے۔ یہ تعمیریں زیادہ تر ابتدائی بدھ مت دور کی یادگار ہیں۔ سانچی کے چار دروازے، یہاں کی فن کاری کا نچوڑ سمجھے جاتے ہیں۔ بدھ مت کے ماننے والوں کی تصویر کاری، دراصل ان کے لئے مذہبی عقیدے کا ایک جز تھی۔ اور مذہب کے پرچار کا ایک

ذریعہ ۔

گندھارا کی فنکاری ایک نئے اثر کی غمازی کرتی ہے ۔ اس پر یونانی فن کاری کا اثر تھا ۔ اسی لئے اس میں بدھ اور بدھی ستواؤں کی مورتیاں بھی ملتی ہیں ۔ گندھارا کے زمانے کا ایک دبستان فن کاری، متھرا کا تھا ۔ جہاں بدھ مت دور میں کئی اسنوپ تعمیر کئے گئے ۔

فنون لطیفہ میں مصوری بھی ہندوستان کا خاص فن رہا ہے ۔ اس فن کو بھارت میں کب سے عروج حاصل ہونے لگا تھا ۔ ہماری موجودہ تاریخیں اس پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں ۔ مدھیہ پردیش کے کیمور شکار گاہوں میں چند غار ہیں جو پہلی صدی قبل مسیح کی مصوری کے نمونے رام گڑھ اور جوگی مار کے غاروں میں ملتے ہیں ۔ بودھ دور میں مورت گری کے ساتھ ساتھ مصوری کو بھی بہت ترقی ہوئی ۔ بدھی فن کاری نے مشرق کی فن کاری پر گہرا اثر ڈالا ۔ چنانچہ لنکا جاوا، نیپال، برما، سیام، تبت، جاپان اور چین کی مصوری کے ارتقا پر اس کا اثر نمایاں ہے ۔ بدھی مصوری کے شاہکار کو ہم کو اجنٹا کی دیواری تصویروں میں ملتے ہیں ۔ یہ تصویریں تناسب اعضا، تیور، رنگ، کاری غرض فن مصوری کے ہر پہلو کے لحاظ سے قابل قدر ہیں ۔ مصور کے قلم نے یہاں رنگوں اور خطوط کی ایک دنیا بسا دی ہے ۔ یہ بدھ مت کے پرچار کا بھی بڑا وسیلہ تھے ۔ ان تصویروں کے بارے میں ہمارے زمانے کے ایک شاعر سکندر علی وجد نے کہا ہے ؎

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے
نزاد و دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذّتِ دردِ جگر دی ہے
کھلیں کے راز، اس ڈر سے دہن پر مہر گردی ہے
یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پر تحیتر خانہ مانی
مشکّل ہے شباب و حسن کی تخئیل انسانی
تقدّس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی
گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

نئی لہر

ساتویں صدی عیسوی کا زمانہ بھارت کے مغرب میں زندگی کی نئی لہروں کے ابھرنے مچلنے اور ساحل سے گذر کر اطراف واکناف میں پھیل جانے کا زمانہ تھا۔ زندگی کی یہ نئی لہر، ملک عرب میں حجاز سے اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ مشرق میں ایران، افغانستان اور ہندوستان تک پھیل گئی۔ شمال مغرب میں عراق، فلسطین، شمالی افریقہ، اس کے شوق نامحدود کی دسترس میں تھے ہی، اور کوئی ڈیڑھ صدی کے اندر اندر ہسپانیہ بھی اس کی آغوش میں تھا اور لہروں کا تموج فرانس کی سرحدوں سے ٹکرا رہا تھا۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ روما کی سلطنت بھی اسی کے بہاؤ کی تاب نہ لا سکی اور قسطنطنیہ ان لہروں کی زد میں آ گیا۔

زندگی کا یہ تموج مکہ میں پیغمبر عرب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام

کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوا تھا۔ اس پیغام کا سب سے اہم پہلو خدا کی وحدانیت پر زور اور انسان کی برادری کا پرچار تھا۔ جس زمانے میں یہ پیغام عربوں کو دیا گیا، وہ قبیلہ داری کشمکش میں مبتلا تھے۔ اور سماجی اعتبار سے ان کی زندگی پارہ پارہ تھی۔ اس پیغام نے ایک احساس اتحاد اور ترقی ان کے دلوں میں پیدا کیا عرب کی بعض مخالف قوتوں نے انہیں اس پیغام کی اشاعت سے باز رکھنا چاہا۔ انہیں اذیتیں دیں اور لڑائیاں کیں۔ لیکن اس پیغام کو دبا نہ سکے۔ عرب جو نئی زندگی کا شعور لئے ہوئے اٹھے تھے، ان سے مقابلہ آسان نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یکے بعد دیگرے سارے پڑوسی ملک ان سے ہار مان گئے اور ان کے اثر و نفوذ کے لئے راستہ کھل گیا۔ ایونیا (یونان کا ایشیائی حصہ) فلسطین اور شام رفتہ رفتہ اس عالمی برادری میں شامل ہو گئے۔ ایران ان کے قبضہ میں آگیا ادھر مغرب میں شمالی افریقہ کے علاقے مصر اور بربر ان کے اقتدار کے تحت آگئے۔

ہندوستان سے عربوں اور ایرانیوں کے تعلقات بڑے پرانے تھے۔ آدم کا نزول اسی سرزمین پر ہوا تھا۔ سراندیپ یا لنکا وہ سرزمین بتائی جاتی ہے جہاں حضرت آدم نازل ہوئے تھے۔ لنکا کے شہر سکے لیا میں کوہ آدم واقع ہے اور کوہ آدم پر حضرت آدم کے قدم کے نشان بتائے جاتے ہیں۔ اب بھی وہاں ہزاروں زائرین زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ لنکا کے بارے میں ماہرین ارضیات بتاتے ہیں کہ یہ جزیرہ نما کبھی بھارت ہی کا ایک حصہ تھا۔ آدم کے تعلق سے بھارت کو عرب ملکِ بدوہ

(FATHER-COUNTRY)

سمجھے تھے۔

بھارت کے ساتھ ایران کا تعلق بھی بہت پرانا ہے۔ ہندوستان کے آریا اور ایران کے آریا آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ ان کی زبانیں سنسکرت اور پرانی فارسی بھی بہنیں بہنیں ہیں۔ ایرانیوں کی پرانی عظمت کے زمانے میں بلوچستان اور بھارت کے علاقہ سندھ پر اکثر شاہانہ ایران کا قبضہ رہا کیا ایرانی فوج میں بھارت کے جاٹوں کا بھی ذکر آتا ہے۔ اس تعلق سے لسانی اور تہذیبی لین دین ایران اور بھارت کے درمیان پرانے زمانے سے چلا آیا ہے۔

ہندوستان سے عربوں کی تجارت بھی بہت قدیم زمانے سے چلی آتی تھی۔ سامی نسل کے لوگ قبل تاریخ زمانے میں بڑے مہم پسند تھے۔ یہ لوگ مشرق اور مغرب کے ملکوں کے درمیان تجارت کا واسطہ تھے ہندوستان سے وہ مسالے، چاندی، ہاتھی دانت، لنگور، مور وغیرہ لے کر مغربی ملکوں تک پہنچاتے تھے۔ یہ اشیاء عرب ہندوستان سے لے چلتے اور بیروت سے فنیقی تاجر، جو سامی قوم ہی سے تعلق رکھتے تھے اور جو کنعانی اور آرامی کے نام سے بھی یاد کئے جاتے ہیں، اُن اشیاء کو یورپ کی منڈیوں میں پہنچاتے تھے۔ حضرت سلیمان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن کو مور، لنگور، چاندی ہاتھی دانت ہندوستان سے حاصل ہوتے تھے۔

عربوں نے بابل کے قریب، جدّہ کی بندرگاہ بنائی تھی۔ اس کے علاوہ عدن اور شہر بھی ایسے مقامات تھے جو خلیج فارس سے گذرنے والے جہازوں

کے لئے ضروری ساز وسامان مہیا کرتے تھے۔ سابی لوگ بڑے اچھے جہاز راں اور ملاح ہوتے تھے۔ عرب مصر اور شام سے چل کر خشکی کے راستے سے، بحر احمر کے کنارے کنارے حجاز کو طے کر کے یمن تک پہنچ جاتے تھے۔ وہاں سے وہ بادبانی کشتیوں کے ذریعہ افریقہ اور حبشہ چلے جاتے یا سندھ کی بندرگاہ دیبل (کراچی) اور اس سے آگے بڑھ کر گجرات اور کاٹھیاواڑ کی بندرگاہ تھانہ اور کھمبایت پہنچ جاتے۔ یہاں سے بھی آگے بڑھ کر وہ کالی کاٹ، راس کماری، سراندیپ اور انڈمان جاتے تھے۔ مدراس کی بندرگاہوں سے گذر کر خلیج بنگال میں پہنچ جاتے۔ اور برما اور سیام کے راستے سے چین بھی جاتے۔ یہی راستہ اُن کی واپسی کا بھی تھا۔ اس تعلق کی وجہ سے عربوں کی ایک خاصی تعداد قبل اسلام زمانے ہی میں جنوبی ہند میں آکر بس گئی تھی۔ اور چاول، کلیان، اور سوپارا میں ان کی بستیاں تھیں۔ ہندوستان سے تجارت میں ایرانی بھی عربوں کے ساتھ شریک تھے۔ عربوں اور ایرانیوں کا یہ اقتدار ہندوستان کے مغربی ساحلوں پر، پرتگیزیوں کے عروج تک برابر قائم رہا۔ عرب جو ہندوستان ساحل مالابار کے کئی شہروں میں آباد ہو گئے تھے۔ عموماً صابئی تھے لیکن اسلام کے شیوع کے بعد جب سارے عربستان نے مذہب اسلام قبول کر لیا تو ہندوستان میں بسنے والے عرب بھی مسلمان ہو گئے۔

اسلام کی اشاعت نے جو نیا جذبۂ اتحاد عربوں میں پیدا کیا تھا اُس کے نتیجے کے طور پر، ان کی وسعت پذیری کی وہ امنگ تیز تر ہو گئی، جو شیوع اسلام سے قبل ہی شروع ہو چکی تھی۔ اور جلد ہی شام اور ایران اُن کے اقتدار

میں آ گئے۔ اور عرب تاجروں کی حیثیت سے ہندوستان کی جنوبی ساحلوں پر چھا گئے۔

سب سے پہلا اسلامی بیڑا حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں ۶۳۹ء میں تھانہ پہنچا تھا۔ اسی زمانے میں بھڑوچ اور دابل تک بھی اسلامی فوجیں پہنچی تھیں۔ حضرت عمرؓ کی خلافت ہی کے زمانے میں ہندوستان خشکی کے راستے دریافت ہو گئے تھے۔ جس کا نتیجہ بعد میں سندھ کی فتح کی صورت میں ظاہر ہوا۔

حجاج بن یوسف، جس زمانے میں عراق کے گورنر تھے، اُن کے طریقوں سے ناراض ہو کر کئی مسلمان کوکن اور راس کماری کے قریب آکر آباد ہو گئے تھے انہیں کی اولاد نوائط اور لبے کہلاتی ہے۔ جزیرہ لنکا میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ جنوبی ہند میں بسنے والے مسلمانوں میں تبلیغی سرگرمیاں بھی جلد شروع ہو گئی تھیں۔ نویں صدی عیسوی کے اوائل تک مسلمان عرب اور کچھ ایرانی تاجروں کی بستیاں جنوبی ہند کے سارے مغربی ساحلوں پر پھیل چکی تھیں۔ اور ان کے عقائد اور طور طریق اور خاص طور پر ان کے سماجی نظام مساوات نے، مقامی ہندوؤں میں ایک ہل چل سی پیدا کر دی تھی۔ جنوبی ہند میں حالات ایسے تھے کہ برہمنیت نے بدھ اور جین مت کا قلع قمع کر دیا تھا۔ تاہم ان کے اثرات ہندو عقائد سے دست بہ گریبان تھے۔ سیاسی اعتبار سے بھی یہ زمانہ پر سکون نہیں تھا۔ پرانی چیرا حکومت کمزور پڑ گئی تھی اور نئے خاندان اُبھر رہے تھے۔ ایسے زمانے میں خاص طور پر عقائد کا جہاں تصادم پہلے سے

برپا ہوا، ہندوؤں میں اہل فکر لوگوں کا اسلامی عقائد کی سادگی اور سماجی نظام کے مساوات سے متاثر نہ ہونا اچھنبے کی بات ہوتی۔ چنانچہ نویں صدی کے ربع اول کے ختم ہوتے ہوتے، ملابار کے پیرد مال راجا چیرامن پیرومال نے مذہب اسلام قبول کرلیا۔ کہتے ہیں کہ اسے اسلام کی حقانیت پر عقیدہ شق القمر کے واقعے کو خواب میں دیکھنے سے پیدا ہوا۔ اور اس نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کا اسلامی نام عبدالرحمٰن سامری رکھا گیا۔ مسلمان ہونے کے بعد، وہ حج کو گیا۔ اور مکہ سے اس نے کئی سربرآوردہ عالموں اور حافظوں کو ملابار روانہ کیا تاکہ وہ اس کی قلمرو میں اسلامی عقائد پھیلائیں۔ عبدالرحمٰن کا انتقال مکہ ہی میں ہوا۔

عبدالرحمٰن کے مسلمان ہونے کے بعد اسے برہمنوں نے ذات سے باہر کردیا تھا۔ چنانچہ ٹروان کور کے راجاؤں کی تخت نشینی کے وقت وہ سارے رسوم روایتاً ادا کئے جاتے تھے۔ جو عبدالرحمٰن کے ذات باہر کرنے کے وقت ادا کئے گئے تھے۔ اس کا سر مونڈھا جاتا تھا۔ اور مسلمانوں کا لباس پہنایا جاتا تھا۔ اور اس کے سر پر تاج ایک ماپلا پہناتا تھا۔ تاج پوشی کے بعد، راجا کے ساتھ ذات باہر ہندو کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اسے کوئی نائر نہیں چھوتا اور وہ اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ بیٹھ کر کھا پی نہیں سکتا تھا۔ یہ راجا اپنے مکہ گئے ہوئے جد کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ تاج پوشی کے وقت وہ یہ الفاظ کہتا تھا "میں اس تلوار کی اس وقت تک حفاظت کروں گا جب تک میرا چچا مکے سے واپس نہ آجائے"۔

مسلمانوں کی بڑی آؤ بھگت کچھ تو ان کی کردار کی وجہ سے ہوتی تھی اور کچھ اس سماج کے رکن کی حیثیت سے، جس میں انسانی برادری اور اس کا احترام درجہ کمال کو پہنچ گیا تھا۔ اس زمانے میں مسلمان مقامی راجاؤں کی فوج میں ملازم بھی رکھے جاتے تھے۔ اور ان کی وفاداری پر راجا، خود اپنے لوگوں سے زیادہ بھروسہ کرسکتا تھا۔ اسی لئے راجا ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ اور سامریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی قلمرو میں یہ حکم دے رکھا تھا کہ ہر مچھیرے کے خاندان میں جتنے مرد بچوں کی ممکن ہوسکے مسلمان کی طرح تربیت کی جائے اس طرح مذہبی تبلیغ کی ہمت افزائی، مسلمانوں کو خود اہل ملک کی طرف سے ہوئی۔ انہیں مسجد بنوانے کی نہ صرف اجازت دی جاتی تھی، بلکہ زمین بھی مفت دی جاتی۔ کچھ عرصہ کے بعد جنوبی ہند میں بسنے والے یہ مسلمان "مایلا" کے معنی بعض لوگوں نے "مہتمم بالشان بچے" کے بتائے ہیں اور بعض اس کے معنی "دولہا" کے بھی بتاتے ہیں۔ جنوبی ہند میں ایک اعزاز کا لقب سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ کچھ عیسائی بھی اعزاز کے طور پر اس لقب سے ملقب کئے جاتے تھے۔ لیکن مسلمانوں سے امتیاز کرنے کے لئے وہ "نصرانی مایلا" کہلاتے تھے۔ مشرقی ساحل پر ان کی بڑی بڑی آبادیاں تھیں۔ جن میں، کائل پٹم کی آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہاں ٹوٹے برتنوں اور سکوں کے جو آثار ملے ہیں اُن سے ۱۰ہجری دسویں صدی عیسوی سے مسلمانوں کا یہاں آباد ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ جنوبی ہند کے شہروں، ترچناپلی، ترنی سوار پلی اور مدراس میں بعض مسلمان صوفی

گیارہویں صدی عیسوی کے لگ بھگ آکر رہ گئے تھے، اور ارشاد و ہدایت کے مرکز بن گئے تھے۔ ان میں نتھڑ ولی یا نظہر ولی (وفات ۱۰۳۹ء) اور حضرت علی بادشاہ (مدورا۔ وفات ۱۱۸۲ء) قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کی تبلیغ کے نتیجے کے طور پر جنوبی ہند میں بے شمار لوگوں نے گیارہویں صدی تک اسلام قبول کرلیا تھا۔

ساحل کارومنڈل، عرب تاجروں کا راستہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اس کا نام معبر یعنی گذر گاہ رکھ دیا تھا۔ معبر کی حدیں گولم سے لے کر نیلاور (نیلور) تک بتائی گئی ہیں۔ اور یہ فاصلہ تین سو فرسخ بتایا گیا ہے۔ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اس علاقے کے حکمران کو "دیور" کے لقب سے موسوم کرتے تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں چین ماچین کے عجائبات اور ہند سندھ کی پیداوار جہازوں میں لدی ہوئی ہر وقت آتی جاتی رہتی ہے۔ یہ بڑے بڑے جہاز پہاڑ جیسے نظر آتے ہیں جو بادبانوں کے بازوں کے ساتھ سمندر کی سطح پر حرکت کرتے رہتے ہیں۔ خلیج فارس کی قیمتی اشیاء اور وہ ساری چیزیں جو عراق، خراسان، روم بلکہ یورپ کی زینت کا کام دیتی ہیں، معبر ہی سے بھیجی جاتی ہیں معبر گویا ہندوستان کا دروازہ بن گیا تھا۔

اس طرح عرب اور کچھ ایرانی مسلمان، جنوبی ہند میں سب سے پہلے مغربی ساحلوں پر ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں آباد ہو چکے تھے مشرقی ساحلوں پر ان کا ورود دسویں صدی میں ہوا۔ اور تھوڑے عرصہ کے اندر اندر ہی وہ سارے ساحل پر پھیل گئے۔ اُن کا کردار اور ان کی تنظیم ایسی تھی کہ وہ

جلد ہی ملک کی سیاسی اور سماجی فضا پر اثر انداز ہونے لگے۔ سربرآوردہ مسلمان بعض وقت مقامی راجاؤں کے وزیر اور امیر البحر مقرر کئے گئے۔ وہ ایسے معتمد علیہ ہوتے تھے کہ کبھی کبھی انہیں سفیر مقرر کر کے دوسرے راجوں مہاراجوں کے دربار میں بھیجا جاتا تھا۔ مسلمان علماء کی ذاتی زندگی کے پاکیزہ نمونوں اور ان کے ارشاد و ہدایت کے اثر سے ہزاروں مقامی باشندوں کو ان کی طرف متوجہ کیا، اور وہ اسلام قبول کرنے لگے۔ انہوں نے کئی مسجدیں بنائیں جو ان کے مدرسے اور ان کی علمی اور سماجی زندگی کے مرکز بھی ہوتے تھے۔ ان چیزوں کا اثر ہندو عوام اور خواص پر پڑا، اور اُن کے مذہبی عقائد بھی متاثر ہونے لگے۔

ہندو مذہبی تصورات کے ارتقاء پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی تک اُن میں تسلسل برقرار رہا۔ ہندوؤں کی ساری مذہبی اور تہذیبی تحریکیں اُس زمانے تک شمال سے اٹھیں۔ اور انہوں نے جنوبی ہند میں راہ پائی۔ چنانچہ سارے صحائف مذہبی شمال میں لکھے گئے۔ بدھ مت اور جین مت وہیں سے اٹھے، فلسفے کے سارے نظام وہیں نشوونما پائے۔ رام چندر جی، سری کرشنا گوتم بدھ، مہاویر سب وہیں پیدا ہوئے۔ لیکن آٹھویں صدی عیسوی میں پانسہ پلٹ گیا۔ اب تک شمال کو قیادت حاصل تھی اور جنوب اس کا پیرو تھا۔ لیکن اب جنوب نے شمال سے قیادت چھین لی۔ اور اسے اپنا پیرو بنا لیا۔ آٹھویں صدی سے لے کر پندرہویں صدی تک ہندو مذہب میں اصلاح کی جتنی تحریکیں اٹھیں، وہ جنوبی ہند سے اٹھیں۔ بھگتی کی تحریک پہلے پہل جنوبی ہند کے وشنو اور شیو فرقوں کے قائدین نے پیدا کی تھی۔ شنکراچاریہ

اور بسوا نے نئے مذہبی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور ولبھ اچاریہ اور مادھو فرقے کی اصلاحی تحریکیں رونما ہوئیں۔

شنکر اچاریہ سنیاسی ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے دنیا ترک کر کے مذہبی اصلاح کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ جب ان کی ماں کا انتقال ہوا تو برہمنوں نے ان کی تجہیز و تکفین کی رسمیں ادا کرنے سے منع کیا۔ لیکن شنکر اچاریہ نے ان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اور ساری رسمیں ادا کیں۔ یہ ہندو مذہب کے خلاف تھا۔

شنکر اچاریہ ملک بھر میں گھوم چکے تھے۔ اور مختلف علما سے بحث و مباحثہ میں حصّہ لیا تھا۔ ان کا مرکز ملابار تھا۔ جہاں مسلمانوں کی آبادی کافی تھی شنکر اچاریہ نے بدھ مت کے باقی آثار کو بھی مٹا دیا۔ ان کی اصلاحی مساعی کے برہمن بڑے مخالف تھے۔ سنسکرت زبان کو مذہبی امور میں اب تک جو دخل رہا تھا اس کو انہوں نے ختم کر دیا۔ اور عوام کی زبان اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اختیار کی شنکر اچاریہ کی کوششوں کا ماحصل ہندو مذہب کی کمزوریوں کو دور کرنا تھا۔ انہوں نے ہندوؤں میں فرقہ پرستی کو دور کرنے کی سعی کی۔ اور یہ ثابت کیا کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں سب ایک ہی حقیقت کو آشکار کرتی ہیں۔ اور وہ وحدانیت ہے، جس پر انہوں نے زور دیا۔ اور کہا کہ خدا کی ذات وحدہٗ لاشریک ہے۔ خدا کے جسمانی اوصاف کے بھی وہ منکر تھے۔ دنیا ان کی نظر میں ایک مظہر ہے حقیقت نہیں۔ انہوں نے اسے "مایا" بتایا۔ خدا کی وحدانیت کو ثابت کرنے کا منطقی طریقہ شنکر اچاریہ نے اختیار کیا تھا وہ معمولی آدمیوں کی سمجھ

بوجہ سے اونچا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گرو یا پروہت کا واسطہ ضروری ہوگیا۔ اور عام آدمی ان کا دست نگر بن گیا۔ شنکر اچاریہ کی یہ تعلیمات میں اسلامی عقائد کا عکس صاف جھلکتا ہے۔

راما نوجا سنہ ۱۰۱۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ کنجی ورم کے رہنے والے تھے اور پہلے پہل شنکر اچاریہ کے ایک پیرو، یادوا پرکاش سے انہوں نے استفادہ کیا تھا۔ بعد میں انہیں اپنے استاد سے اختلاف ہوگیا اور سری رنگم کے یمونامی کے پیرو ہوگئے۔ منی جی کے انتقال کے بعد وہ ان کے جانشین قرار دیئے گئے اور سنیاس اختیار کرکے اپنے چیلوں کے ساتھ ملک بھر میں گھومتے پھرے۔ وہ کشمیر میں گئے تھے۔ پھر سری رنگم واپس آکر انہوں نے کئی تصانیف لکھیں۔ لیکن چولا حکمراں کلوتنگا اول (۱۰۹۵) نے انہیں وشنو مت چھوڑ کر شیو مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اس لیے راما نوجا بھاگ کر ہوسیلا راجا یادوا کی قلمرو میں چلے گئے۔

راما نوجا نے شنکر اچاریہ کے وحدانیت مطلق کے عقیدے کی تردید کی اور دنیا کو "مایا" سمجھنے کے بھی وہ مخالف تھے۔ ان کی تعلیم کے مطابق "برہمن" یعنی ہستی مطلق اپنی ذات اور صفات دونوں اعتبار سے بلند و برتر ہے۔ وہ بے چون و چرا ہے۔ وہ خالق کل ہے لیکن وہ عدم مطلق سے وجود میں نہیں لاتا۔ بلکہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کرتا ہے۔ انفرادی وجود "برہمن" ہی کے مظہر ہیں۔ وہ اعلیٰ ذاتوں کی برتری کے قائل تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ نیچ ذات والوں کو بھی خاص خاص موقعوں پر مندروں میں جانے کی بھی

انہوں نے گنجائش رکھی تھی۔

تصوف، عرفان اور بھگتی کے تصورات ہندوستان کے لئے نئے نہیں تھے لیکن اس زمانے میں جنوبی ہند اور خاص طور پر ملابار سے نئے تصورات اور اصلاحات کی جو لہر اٹھی تھی، وہ دراصل اسلامی تصوف اور تصورات کے اثر کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس علاقے میں مسلمان کافی تعداد میں آچکے تھے اور جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے۔ ملابار کا حکمران، چیرامن پیرومال اسلام قبول کر چکا تھا اس طرح یہ بات ایک اتفاقی بات نہیں سمجھی جا سکتی کہ اس زمانے میں یعنی نویں صدی سے لے کر پندرہویں صدی عیسوی تک ہندو مذہب کی ساری اصلاحی تحریکیں جنوبی ہند سے اٹھیں۔ شنکراچاریہ، رامانوجا اور بسوا اسی علاقے سے پیدا ہوئے اور اسلامی عقائد سے متاثر تھے۔

بسوا لنگایت مذہب کے بانی تھے۔ وہ مروجہ ہندو عقائد و مراسم کے مخالف تھے۔ لنگایت مذہب میں بہت سے عقائد ایسے ہیں جو عام طور پر ہندو مذہب سے بالکل الگ ہیں۔ وہ صرف ایک خدا کو مانتے ہیں۔ بسوا خدا کے اوتار ہیں۔ جنہیں "علامہ پربھو" کہا جاتا ہے۔ اُن میں بہت سے صفات جو بیان کئے جاتے ہیں آنحضرت سے ملتے جلتے ہیں۔ اس کے علاوہ بسوا کے چار بڑے اصحاب ربوان، مرول، اکورا ما اور پنڈت دراصل پیغمبر اسلام کے چار یار ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، اور علیؓ کے مماثل ہیں علامہ پربھو میں علامہ کا لفظ خود عربی ہے۔

شادی بیاہ کے بارے میں اُن کے عقائد مسلمانوں سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ اُن کے یہاں عقد ایک اختیاری چیز ہے جس میں دلہن کی رضامندی ضروری ہے۔

بیوہ کے عقد ثانی کی بھی اجازت ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ عام ہندو فرقوں کے برخلاف لنگایت مردوں کو جلاتے نہیں بلکہ گاڑتے ہیں۔ مرنے والے کو غسل بھی دیا جاتا ہے۔ وہ تناسخ کے قائل نہیں ہیں۔ لنگایت اپنے آپ کو "ویرشیوا" بھی کہتے ہیں جس کے معنی ششیوا کے بہادر پجاری کے ہیں۔

جنوبی ہند اور ملابار میں مذہبی عقائد کی یہ نئی نشوونما دراصل اسلامی تصورات کے اثرات کا نتیجہ تھا۔

تہذیبی لین دین

نویں صدی عیسوی میں ہرش کی مملکت کے خاتمے کے بعد ہمارا دیس چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں بٹ گیا تھا۔ اور راجپوت قبیلوں نے اقتدار حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ہمالیہ کی ترائیوں سے لے کر دکن تک سارے علاقوں پر راجپوت سرداروں نے اپنی حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ لیکن اُن کے آپس میں اتحاد اور اتفاق نہیں تھا۔ راجپوتوں کے مرکز قنوج، گوالیر، دہلی، اجمیر وغیرہ تھے اور پرانے تہذیبی مرکز جیسے مگدھ، پاٹلی پتر، گیا، کپیلا وستو وغیرہ اجڑ رہے تھے۔ مذہبی اعتبار سے بدھ مت اور جین مت کا اثر، ہرش کے بعد گھٹتے گھٹتے برائے نام رہ گیا تھا۔ برہمنوں کا اثر بڑھ گیا تھا اور سیتھین، ہن، بلکہ گونڈوں اور بھیلوں کو بھی وہ راجپوت بنا کر، انہیں اپنے مذہب کے حلقۂ اثر میں لا رہے تھے۔ راجپوت شیو مذہب کے پیرو تھے اور اُن کے حکمراں

یار انا، اپنے آپ، کو شیو کا دیوان یا نائب کہتے تھے۔

ادھر بھارت دیس کے مغرب میں اسلام کی اشاعت نے زندگی کی جن تنظیمی قوتوں کو ابھارا تھا، وہ تشکیل پا رہی تھیں۔ ۸۶ھ م ۷۰۵ء میں اموی خلیفہ ولید جب تخت پر بیٹھا تو حجاج بن یوسف کو عراق، ایران، مکران اور بلوچستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس نے ہندوستان سے تعلقات بڑھائے۔ اس زمانے تک جنوبی ہند میں مالابار کے علاوہ مسلمانوں کی کافی تعداد سراندیپ یعنی لنکا میں بھی آباد ہو چکی تھی۔ ایک واقعہ ایسا ہوا کہ جس کے باعث حجاج اور سندھ کے راجہ داہر میں لڑائی ٹھن گئی۔ جو عرب لنکا میں تجارت کرتے تھے، ان میں سے بعض کا انتقال ہو گیا تو لنکا کے حکمران نے ان کے بچوں اور عورتوں کو جہاز کے ذریعے عراق بھیج دیا۔ اسی جہاز کو دیبل کے قریب بحری ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور عورتوں اور بچوں کو پکڑ لیا۔ حجاج نے سندھ کے راجہ داہر سے ان عورتوں اور بچوں کو حفاظت کے ساتھ اپنے یہاں بھیجنے کے لئے لکھا۔ راجہ نے اس کی تعمیل سے انکار کیا۔ بلکہ کچھ ڈاکوؤں اور عرب مجرموں کو بھی اس نے پناہ دی۔ اس پر ۹۲ھ میں حجاج نے اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو فوج دے کر بھیجا جس نے پنجاب (جسے عرب چھوٹا کشمیر کہا کرتے تھے) کی سرحد ملتان سے لے کر کچھ اور مالوہ کی سرحد تک قبضہ کر لیا۔ اس زمانے میں بدھ مذہب سندھ میں برہمنیت کے خلاف اپنی آخری ہار کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس لئے اہل سندھ آپس میں گتھے ہوئے تھے۔

ولید کے بعد جب سلیمان دمشق کے تخت پر بیٹھا تو اس نے محمد بن قاسم کو بھی سندھ کی حکومت سے ہٹا دیا اور حجاج سے ذاتی دشمنی کی بنا پر محمد بن قاسم کو

قتل کرادیا۔ محمد بن قاسم کے بعد سندھ پر گورنر مقرر کئے جاتے رہے۔ امویوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد عباسیوں نے ان کی جگہ لے لی۔ اور دارالخلافہ کو دمشق سے ہٹا کر بغداد میں منتقل کیا۔ عباسیوں کے دور میں بھی سندھ پر گورنر مقرر کیا جاتا تھا۔ معتصم باللہ کے بعد (۲۲۷ھ) جب خلافت کمزور پڑ گئی تو سندھ ایک حیثیت سے خود مختار ہو گیا اور بعد کو ہندو راجاؤں نے اس پر قبضہ بھی کرلیا تھا۔

اس ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں سندھ میں اسلامی اور سندھی تہذیب کا کافی اختلاط عمل میں آتا رہا۔ عرب جغرافیہ نویسوں، مورخوں، تاجروں، سیاحوں اور علماء نے ہند کے بارے میں کافی معلومات اسلامی دنیا کے لئے فراہم کی ہیں۔ ابن خرداذبہ نے ہندوستان کا جو جغرافیہ لکھا تھا اس میں وہ بہت سے شہروں کا ذکر کرتا ہے۔ اور سات ذاتوں کا بھی تذکرہ کرتا ہے، جن میں مشہور چار ذاتوں کے علاوہ تین اور ذاتیں کھتری، چنڈال، جو کھلاڑی اور کلاونت ہوتے تھے اور ذنب یعنی ڈوم یا گانے بجانے والوں کی تھیں۔ وہ ہندوستان میں بیالیس مذاہب کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جن میں خدا کو ماننے والے اور اس کے منکر سب شامل تھے بزرگ بن شہریار ایک جہازران تھا۔ جو اپنے سفر کے دوران میں سندھ کے ساحلوں سے لے کر چین اور جاپان تک گھوما کرتا تھا۔ اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے مشاہدات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر دیئے ہیں، جس کا نام "عجائب الہند" ہے اس میں ایک خاص واقعہ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ الرا الارم کے ہندو راجہ نے قرآن کا ترجمہ ایک مسلمان عالم سے ہندی میں کرایا تھا، جسے

وہ سنا کرتا تھا۔ اس ہندی زبان کے بارے میں کچھ کہنا اس وجہ سے مشکل ہے کہ عرب ہندوستان کی ساری زبان کو جس میں سنسکرت بھی شامل تھی، ہندی کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ بعض نام اس نے ایسے بھی لکھے ہیں۔ جن سے ہند کی بول چال کی زبانوں کا بھی تھوڑا بہت علم ہوتا ہے۔ مثلاً ہندوستان کے تاجروں کے لئے وہ "بنیانیہ" کا لفظ استعمال کرتا ہے جو یقیناً "بنیا" کا عربی روپ ہے اسی طرح کشتیوں کے لئے وہ "باجہ" کا لفظ استعمال کرتا ہے جو ہندوستانی لفظ "بیڑا" کا معرب سمجھا جاتا ہے۔ ایک اور لفظ "بلنج" ہے جو "پلنگ" کا عربی روپ ہے۔ مسعودی جو ایک مشہور مورخ ہے، اس نے اپنی تاریخ "مروج الذہب ومعدن الجواہر" میں ہندوستان کے حالات لکھے ہیں اور یہاں کی بولیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ وہ ۳۰۳ھ میں ہندوستان آیا تھا اور لکھتا ہے کہ سندھ کی زبان ہندوستان کی زبان سے الگ ہے۔ مانگیر یعنی گجرات کی زبان وہ کھریبی بتاتا ہے اور تھانہ، چیمور اور سوپارہ کی زبان وہ لاری لکھتا ہے۔

عربوں اور ایرانیوں کے بھارت سے واقفیت اور تعلق کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ عربی میں بہت سے ہندوستانی لفظ داخل ہونے لگے تھے۔ ان میں سے کچھ لفظ جہازرانوں میں مستعمل تھے، جیسے "دونیج" جو ڈونگی کا معرب ہے، ناخدا کا لفظ دراصل "ناؤ" اور "خدا" کا مرکب ہے۔ جس کے معنے "ناؤ کا مالک" کے ہیں ہندوستانی اور فارسی لفظوں کا ایسا مرکب، دراصل گہرے میل جول کی نشاندہی کرتا ہے۔

جو چیزیں عرب ہندوستان سے لے جاتے تھے، ان کے نام بھی وہ ساتھ

لے جاتے جیسے صندل (چندن) کافور (کپور) قرنفل (کنکھ پھل، لونگ) بہط (کھات) ابیج (انب، انبہ، آم) مسک (موشکا مشک) فلفل (پیلی پیلا گول مرچ) زنجبیل (زرنجابیرد، سونٹھ) نیلوفر (نیلوکھل) ہیل (ایل، الائچی) شطرنج (چترنگ) نارجیل (ناریل)۔ اس کے علاوہ عباسی خلفاء کی حکومت مستحکم ہونے کے بعد انہیں علم وفن کو ترقی دینے کی جو خواہش ہوئی تھی، اس کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ ہارون الرشید اور مامون کے زمانے میں بہت سے ہندو عالم ہندوستان سے بغداد بلائے گئے تھے۔ تاکہ وہ ایسے علوم وفنون کا ترجمہ عربی میں کریں جو ان کے خاص علوم تھے۔ اس کی ابتدا کہتے ہیں کہ برامکہ نے کی تھی۔ برامکہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خاندان اسلام سے پہلے ایران میں بدھی "نو وبہار" (وہار) کے افسر یعنی "پرمانگ" تھے۔ جہاں سے ان کا خاندانی نام "برامک" اور "برامکہ" رواج پایا۔

عربی میں جو کتابیں سنسکرت سے ترجمہ ہوئی تھیں، ان میں طب، نجوم فلسفہ، ہیئت، بیطاری، موسیقی کی بہت سی کتابیں شامل ہیں۔ عربی کے اعداد جنہیں عام طور پر ہندسہ کہا جاتا ہے، دراصل ہند ہی سے لئے گئے تھے۔ عربی میں ان کے لئے "ارقام ہند" مستعمل ہے۔ ان علوم کے ساتھ بہت سی اصطلاحیں عربی میں منتقل ہوئیں۔ چنانچہ لفظ "اوج" کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ سنسکرت "اوچ" (اونچا) کا معرب ہے اور اُزین (اجین) جو ہیئت کی ایک اصطلاح ہے۔

علوم وفنون کے علاوہ، عربی میں ہندوستان کی کئی ادبی کتابوں کا بھی

ترجمہ ہوا۔ ان میں زیادہ تر قصے کہانیوں کی کتابیں شامل ہیں۔ ان میں سندباد کا افسانہ مشہور ہے۔ قصہ در قصہ دراصل ہندوستان کی افسانہ گوئی کا پرانا فن ہے۔ اس سلسلے میں "پنچ تنتر" اور "ہنا اپدیس" کے افسانے بھی عربی میں منتقل ہوئے۔ "کلیلہ دمنہ" کا ماخذ ہندوستانی کہانی ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ "الف لیلہ" کی کہانیوں میں بھی کئی کہانیاں ہندوستانی ہیں۔ "الف لیلہ" کی کہانیاں ہندوستانی کہانیوں کے نمونے پر لکھی گئی ہیں۔

یہ علمی لین دین دراصل آگے چل کر ہندوستان کی نئی تہذیب اور نئی زبان کی نشو و نما کی تمہید ثابت ہوا۔ سندھ پر عربوں اور ایرانیوں کے براہ راست ربط کے بعد سے اس اختلاط کے مواقع بہت زیادہ ہو گئے۔

سندھ میں عربوں کی حکومت کم و بیش تین سو برس تک قائم رہی۔ محمد بن قاسم کے بعد دمشق سے یہاں گورنر ہو کر یہاں آتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ علاقہ دو ریاستوں میں بٹ گیا تھا۔ جن میں سے ایک ملتان کی ریاست تھی۔ اور دوسری سندھ کی۔ ملتان، پہلی ریاست کا صدر مقام تھا اور منصورہ یعنی موجودہ بھکر سندھ کا۔ اس زمانے کے سیاحوں کے بیانات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندھ میں ہندوستانیوں، ایرانیوں اور عربوں میں، مذہب کے اختلاف سے قطع نظر، زندگی کے بہت سے شعبوں میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ سیاح ابن حوقل لکھتا ہے کہ یہاں مسلمان اور ہندو سب ایک طرح کا لباس پہنتے تھے۔ ان کے بالوں کے چھوڑنے کا طریقہ بھی ایک جیسا تھا۔

سندھ کے علماء عربی جانتے تھے اور عرب اور ایرانی سنسکرت اور ہندی

زبان سے واقف تھے۔ اور علمی تصانیف بھی کر سکتے تھے۔ موجودہ سندھی زبان ابھی نشوونما نہیں پائی تھی۔ تاہم قدیم سندھی جو وہاں کے لوگ بولتے تھے، عرب اور ایرانی بھی بولتے تھے۔ اسی طرح سندھ کے لوگ بھی عربی اور فارسی آسانی سے بول سکتے تھے۔ بزرگ بن شہریار ملاح نے ایک واقعہ بیان کیا ہے، جس سے ایک حقیقت آشکار ہوتی ہے۔ سندھ میں الور کے راجا نے منصورہ کے حکمران کو لکھا تھا کہ ایک ایسے مسلمان کو اس کے پاس بھیجا جائے، جو اُسے اس کی زبان میں اسلام کی خوبیاں سمجھا سکے۔ اس کام کے لئے ایک عراقی مسلمان منتخب کیا گیا جو ہندوستان کی کئی زبانیں جانتا تھا۔ جب وہ راجا کے دربار میں گیا تو اس نے ہندی میں اپنا قصیدہ سنایا۔ اسی عالم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نے قرآن کا ترجمہ بھی سندھی میں کیا تھا۔

تہذیبی معاملات میں سودا ایک طرفہ کبھی نہیں ہوتا۔ اس کے ماسوا، جو تہذیب اور زبان سیاسی یا علمی اعتبار سے برتر ہوتی ہے۔ وہ دوسری تہذیب اور زبان کو متاثر کرتی ہے۔ چنانچہ عربوں کی تہذیب اور عربی زبان نے ایرانی تہذیب اور فارسی زبان کو متاثر کیا تھا لیکن عربوں کی تہذیب بھی ایرانیوں سے کافی متاثر ہوئی تھی۔ سندھ میں عربی اور عربی سے متاثر فارسی، دونوں کے مقامی تہذیب اور زبان کو متاثر کیا۔ عرب اور ایرانی لوگ اسلام قبول کرنے کے بعد ایک عالمی برادری میں منسلک ہو گئے تھے۔ جب وہ سندھ آئے تو اپنے ساتھ نئے عقیدے لائے۔ خدا کی وحدانیت، حضرت محمدؐ کی رسالت اور دنیوی زندگی میں انسانوں کے آپس میں اخوت اور مساوات کا پیغام ان کے مذہبی اور سماجی

عقائد کا نچوڑ تھا۔ ان کے عقائد کے ساتھ نئے لفظ بھی آئے تھے۔ جن میں اللہ رسول، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قرآن، حدیث، اسلام اور اس طرح کے بہت سے لفظ تھے۔ نیا نظم ونسق جو آیا تھا۔ اس میں بادشاہ، حاکم، دربار، عامل، دیوان، صوبہ، صوبہ دار، تحصیلدار، خزانہ، جیسے بے شمار الفاظ تھے۔ جو اس نظم ونسق کے ساتھ رائج ہو گئے تھے۔ انصاف اور عدالت کا نیا انتظام قاضی، منصف، عدالت، وکیل اس سلسلے کے سارے تصورات کے لیئے نئے لفظ چاہتا تھا۔ فوجی تنظیم میں سپہ سالار، جمعدار، زین، رکاب، جیسے لفظ آئے۔

عربیرانی پکوان اور کھانے، بھارت کے کھانوں سے الگ تھے، وہ بھی بھارت میں رائج ہوئے۔ پلاؤ، زردہ، بریانی، قورمہ، کباب، فیرنی، نان کتنے ہی ایسے مزہ دار نام ہیں۔ باہر سے آنے والی مٹھائیاں جیسے برفی، قلاقند، جہانگیر، گلاب جامن، شکرپارے، سارے ملک میں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں چنانچہ آج بھی انتہائی جنوب تک میں یہ مٹھائیاں ملتی ہیں۔

اسی طرح ان کے لباس، کرتہ، پاجامہ، رومال، شلوار، جامہ، شال، دوشالہ اور ایسی سینکڑوں چیزیں بھارت نے لیں، نئے کپڑے مخمل، کمخواب، مشجر، اطلس، تن زیب، جامہ دار، جامدانی، کامدانی تھے۔ نئے پھل انگور، انار، سیب، انجیر، نارنگی، بادام، کشمش، خوبانی، چلغوزہ وغیرہ بھی آئے۔ کچھ نئے جواہرات آئے جیسے لعل، عقیق، زمرد، پشپ، فیروزہ، نئے زیورات میں پازیب، گلوبند، طوق، مرزابے پروا، سرپیچ، گوشوارے

جیسے بنیوں ہیں۔ آرائش و زیبائش کے سامان میں طرّہ، کلغی، غازہ قابلِ ذکر ہیں۔

سندھ میں عربوں کی حکومت پہلی صدی ہجری کے آخری عشرہ سے لے کر تیسری صدی ہجری کے وسط تک رہی۔ اس ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں تین سال محمد بن قاسم کی حکومت رہی۔ محمد بن قاسم کے بعد، کچھ راجاؤں نے اکثر حصوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن جلد ہی دمشق کی طرف سے یہاں گورنر مقرر ہو گیا۔ اموِیوں کے عہد میں کوئی دس گورنر یہاں حکومت کرتے رہے۔ بیچ میں سندھ کے گورنر منصور بن جمہور کلبی نے خود مختار بننے کی بھی کوشش کی تھی۔ پھر عباسیوں کے زمانے میں اکتیس گورنر یہاں حکومت کرتے رہے۔ خلیفہ المتوکل کے عہد میں عمر بن عبدالعزیز ہباری نے یہاں کی گورنری حاصل کر لی تھی، لیکن وہ جلد ہی خود مختار ہو گیا۔ اور سلطنت ہباریہ کی بنیاد ڈالی۔

سندھ کے دو حصے تھے ایک الور اور دوسرے ملتان۔ جو بعد میں سندھ اور ملتان سے موسوم ہوئے۔ سندھ کا دارالخلافہ دیبل یعنی موجودہ کراچی تھا۔ اور ملتان کا شہر ملتان۔ عربوں نے کچھ نئے شہر بھی آباد کئے تھے۔ اموی عہد کے ساتویں گورنر حکم بن عوانہ کلبی نے سندھ میں اپنا دارالخلافہ الگ بنوایا۔ اس شہر کا نام محفوظہ تھا۔ بعد میں اس نے شہر منصورہ (بھکر) بسایا۔ اور اس کو پایۂ تخت بنا لیا۔ عرب سیاحوں میں سے اکثروں نے اس شہر کی رونق اور چہل پہل کی تعریف کی ہے۔ اس کے مقابلے میں ملتان اور اندرون ملک تھا۔ یہاں کی زندگی پُرسکون تھی۔ اس لئے اکثر علماء اور صوفیائے کرام کا یہ مرکز بن گیا تھا۔

ان علماء میں سے کچھ تو عرب اور ایران سے آئے تھے۔ لیکن خود سندھ اور ملتان سے بھی کئی علماء پیدا ہوئے۔ جن میں اکثر نومسلم تھے۔ انھوں نے حدیث، تفسیر، فقہ، اور علم نحو اور ادب میں نمایاں مقام پیدا کیا۔ صوفیائے کرام میں بھی ملتان اور دیبل کے کئی بزرگ نمایاں رہے۔ انہیں اس زمانے میں "زاہد" کہا جاتا تھا۔ شیخ ابو العباس احمد بن عبداللہ دیبلی اور ہارون بن عبداللہ ملتانی کے نام اس سلسلے میں سرفہرست آتے ہیں۔ ان زاہدوں اور عالموں نے مقامی باشندوں کی تبلیغ اور رشد و ہدایت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس غرض کے لئے وہ مقامی زبان استعمال کرتے تھے۔ ہارون بن عبداللہ عالم تھے اور شاعری کا بھی انہیں اچھا ذوق تھا۔ ایک اور شاعر ابو ضلع سندھی تھے۔ جنہوں نے ہندوستان کی خوبیوں پر عربی میں ایک نظم لکھی تھی! کہتے ہیں۔

"میری جان کی قسم، یہ وہ سرزمین ہے، جب اس میں پانی برستا ہے تو

"وہ، ایسے موتی اور یاقوت اس سے اُگتے ہیں"

"اس کی خاص چیزوں میں مشک، کافور، عنبر، عود، اور قسم قسم کی خوشبوئیں اُن کے لئے جو میلے ہوں۔

اور قسم قسم کے عطریات اور جائے کپل اور سنبل اور ہاتھی دانت اور ساگوان کی لکڑی اور خوشبودار لکڑی اور صندل اور اس میں توتیا سب سے بڑے پہاڑ کی طرح ہے اور یہاں شیر، چیتے اور ہاتھی اور ہاتھی کے بچے ہوتے ہیں اور یہاں پرندوں میں کلنگ اور طوطے اور مور اور کبوتر ہیں اور

درختوں میں یہاں ناریل اور آبنوس اور سیاہ مرچ کے درخت ہیں۔
اور ہتھیاروں میں تلواریں ہیں جن کو کبھی صیقل کی حاجت نہیں اور
ایسے نیزے ہیں کہ وہ جب وہ ہلیں تو فوج کی فوج ان سے ہل جاتے ہیں۔
تو کیا بے وقوف کے سوا کوئی اور بھی ہندوستان کی ان خوبیوں کا انکار
کر سکتا ہے؟"

نئی تہذیب ۔ نئی زبان

ھباریوں نے سندھ میں کبھی بابری طرح کوئی ڈھائی سو برس حکومت کی۔ لیکن ان کا آخری زمانہ قرامطہ کے مذہبی فسادات کی وجہ سے بڑا بحران کا زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں وسط ایشیا سے ترک اٹھے، اور اپنے اطراف کے ملکوں پر انہوں نے ترکتازیاں شروع کیں۔ ترکوں کے ان قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ تاہم عربوں کی اسلامی روایات کا رنگ ان پر گہرا نہیں چڑھنے پایا تھا، کہ یہ قبیلے ایران اور افغانستان پر چھاپے مارنے لگے۔ اس کی ابتدا سبکتگین سے ہوئی۔ اس نے غزنین کو اپنا صدر مقام بنایا تھا۔ سنہ ۳۸۷ھ میں سبکتگین کا انتقال ہوا۔ اور اس کا بیٹا محمود اس کا جانشین ہوا۔ اس نے ۳۳ برس حکومت کی۔ اس عرصہ میں وہ ہندوستان کی طرف بھی بڑھا۔ اور پنجاب پر قبضہ کر کے سنہ ۱۰۲۱ء میں اسے اپنی سلطنت کا صوبہ بنا لیا۔ محمود نے کشمیر، قنوج، متھرا،

نگرکوٹ اور گجرات پر بھی حملے کئے اور اُسے اکثر معرکوں میں فتح ہوئی۔ لیکن یہ علاقے غزنین کی سلطنت کا جز نہیں بنے۔ محمود کے ہندوستان پر حملے مذہبی جذبے کا نتیجہ نہیں تھے۔ بلکہ اُسے دولت سمیٹنے کا بڑا شوق تھا۔ جن مقامات پر بھی اس نے حملے کئے وہ اسی جذبے کے تحت کئے۔ سے ہندوستان کے ہاتھی بہت پسند تھے۔ جن کے بل بوتے پر وہ بغداد کے خلیفہ کو بھی دعوت مبارزت دینے کو تیار تھا۔

پنجاب پر قبضے کے بعد محمود نے اپنے غلام ایاز کو یہاں کا انتظام سپرد کیا۔ اس کے علاوہ اس نے کئی ہندوؤں کو معزز عہدے دیئے۔ اس کی فوج کا سپہ سالار سوبندرائے تھا۔ جس پر محمود کو بہت اعتماد تھا۔ محمود کی فوج میں ہندوستانیوں کی ایک بڑی بھاری تعداد تھی۔ وہ ہندوستانی زبانوں کا قدردان تھا۔ اور اس کے سکوں پر سنسکرت عبارت بھی لکھی ہوئی تھی۔

محمود کے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ حیرں کہ اس ترکتازیوں کا مقصد اشاعت اسلام نہیں تھا۔ اس نے ہندوؤں یا دوسرے مذہب کے ماننے والوں کو مسلمان بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

محمود علم و ادب کا بڑا شیدائی تھا۔ اس کے دربار میں چارسو شاعر تھے جن میں فردوسی، اسدطوسی، عسجدی، منوچہری، حکیم سنائی وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

محمود کے بعد سلطان محمد اس کا جانشین ہوا، لیکن جلد ہی اس کے بھائی سلطان مسعود نے اُسے بے دخل کر دیا یہ زمانہ سلجوقیوں کے عروج کے آغاز کا

تھا. چنانچہ ان کا سیلاب غزنین تک بھی آیا. اور سلطان مسعود اپنے باپ کا ہندوستان سے سمیٹا ہوا مال غنیمت لے کر پنجاب آ رہا تھا کہ راستے میں قتل کر دیا گیا. اس بحران کے دور میں کوئی نو دس غزنوی شہزادے برسر اقتدار آئے. لیکن انہیں امن و امان کا زمانہ نصیب نہ ہو سکا. آخر میں ۱۱۹۲ء م ۵۸۸ھ میں غزنوی سلطان ملک خسرو کی وفات سے اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا.

غزنوی سلاطین کو اپنے جد اعلیٰ محمود سے حکومت اور علم دوستی گویا ورثے میں ملی تھی. چنانچہ اس خاندان کے اکثر سلاطین نے علماء اور شعراء کی سرپرستی کی. محمود کے بعد، علم و ادب کے بڑے سرپرست، سلطان مسعود اور سلطان ابراہیم گذرے ہیں. اہل ہند کا علمی سطح پر عربوں سے میل جول ہارون الرشید اور مامون الرشید کے عہد میں شروع ہو چکا تھا. لیکن عباسیوں کے عہد میں ایرانیوں اور ایرانی تہذیب سے متاثر ترکوں کو جو عروج ہوا، ان کا ہندوستانیوں سے قریبی ربط اور میل جول محمود غزنوی کے زمانے سے پنجاب میں ہونے لگا. محمود کے جانشینوں، مسعود، ابراہیم اور بہرام کے زمانے سے یہ ربط اور بھی قریب تر ہو گیا.

اس زمانے میں علماء کی تبلیغی مساعی بھی بہت بار آور ہونے لگی تھیں اور پنجاب کے لوگ روزانہ بڑی تعداد میں اسلام قبول کرتے جا رہے تھے. یہ نومسلم ہندوستان کے آئندہ تہذیب و شائستگی کے ڈھرے کو اٹھانے اور نقشے کے بنانے میں بہت اہم ذریعہ ثابت ہوئے. ان کی زبان ظاہر ہے

ر قدیمی پنجابی تھی، لیکن اُن کو تہذیب اور شائستگی میں ایرانی، ترکی اور عرب مسلمانوں سے قریب تر آنا تھا۔ قریب تر آنے کے اسی ذہنی اور فطری رجحان نے مسلمانی تہذیب، اور زبان کے لئے راہ ہموار کر دی۔ ان نومسلموں کے ساتھ ساتھ بیرونی مسلمان بھی ہندوستان سے ذہنی طور پر قریب تر ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ البیرونی کی مساعی سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

البیرونی خوارزم کے ایک قریئے بیرون میں پیدا ہوا تھا۔ اُسے تحصیل علوم کا بڑا شوق تھا۔ کچھ عرصہ وہ والی جرجان و طبرستان، شمس المعالی قابوس کے دربار میں رہا، جو البیرونی کے علم و فضل کا بڑا قدر دان تھا۔ یہیں البیرونی کی ملاقات بوعلی سینا سے ہوئی تھی۔ محمود نے جب خوارزم پر قبضہ کر لیا تو البیرونی غزنین چلا آیا۔ لیکن اسے ہندوستان کے علوم و فنون سیکھنے کا اتنا شوق تھا کہ وہ سنا۱۰۱۷ھ کے قریب ہندوستان آیا اور دس برس یہاں رہ کر یہاں کی علمی زبان سنسکرت سیکھی اور علوم و فنون میں دست گاہ پیدا کی۔

البیرونی نے ہندوؤں کے مذہبی عقائد اور تمدن کو سمجھنے میں بڑی سعی بلیغ کی ہے۔ .... ور اپنی کتاب "کتاب الہند" میں اس بارے میں مستند معلومات فراہم کی ہیں۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں، وید، پران وغیرہ کے علاوہ اُن کے علم نحو اور شعر، رسم الخط، حساب وغیرہ کے بارے میں بھی اس نے کافی مواد چھوڑا ہے۔

ہندوستان کی زبانوں کے بارے میں اس نے جو باتیں لکھی ہیں، اُن سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہاں علماء کی زبان الگ تھی۔ اور عوام کی زبان الگ۔ ان دونوں کو وہ "ہندی" کہتا ہے۔ عوامی زبان کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ اسے صرف بازاری لوگ استعمال کرتے ہیں۔

ہندوستان کے طبقاتی نظام کی بھی البیرونی نے واضح تصویر پیش کی ہے وہ لکھتا ہے کہ موجودہ زمانے میں طبقات یا ذاتوں کا نظام دنیا کی ساری قوموں سے زیادہ ہندوؤں میں سخت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کا بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمان آپس میں سب کو برابر سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے پر فضیلت صرف تقویٰ کی بنا پر دیتے ہیں۔ ہندوؤں کے طبقوں، برہمن، کشتری، دیش اور شودر میں سے ہر ایک کے کام اور فرائض گنانے کے بعد وہ ایک اور ذلیل طبقے کا بھی ذکر کرتا ہے جو "انتر" کہلاتا تھا۔ یہ ذلیل ترین لوگ سمجھے جاتے تھے۔ ان کے بھی وہ آٹھ فرقے گنا تا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) دھوبی (۲) موچی یا چمار (۳) نٹ یا بازیگر (۴) ٹوکریاں اور ڈھال بنانے والے (۵) ناؤ کھینے والے (۶) مچھیرے (۷) چڑی مار (۸) جلاہے۔

کچھ لوگ وہ ایسے بھی بتاتا ہے جو کسی فرقے میں شامل نہیں تھے۔ ان میں ہاڈی، ڈوم، چنڈال اور بدھتو کا وہ ذکر کرتا ہے۔ ان کے فرائض ذلیل ترین کام کرنا اور گندگی کی صفائی تھے۔

البیرونی محمود کے جانشین مسعود کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا۔ اسی زمانے کے لگ بھگ پنجاب میں اور کئی علماء اور شعراء ایسے تھے، جن کے بارے میں اس بات کا یقین ہے کہ وہ ہندوستان کی زبان اور خاص طور پر پنجاب اور لاہور

کے آس پاس کی زبان یا زبانیں جانتے تھے۔ ان علما کے توسط سے ہندوستانی زبانیں ایران اور اس سے پرے مغرب تک پہنچ گئی تھیں۔ اور ان کا تھوڑا بہت اثر بھی مقامی زبانوں پر پڑا تھا۔ چنانچہ فردوسی "شاہ نامہ" میں "کوتوال" کا لفظ استعمال کرتا ہے، جو ہندوستانی لفظ ہے اور غالباً لاہور، اور اس کے اطراف کی بول چال کی زبان سے ایران پہنچا تھا۔ "کوتوال" لفظاً "کوٹ" (قلعہ) اور "وال" یعنی والا مرکب ہے جس کے معنی قلعہ کا نگہبان کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہیلاج، بیلک (دو شاخہ تیر) لکھن (لگھن، روزہ) کے الفاظ بھی مستند فارسی تحریروں میں آئے ہیں۔ "برشگال" کے بارے میں بھی بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ بھی ہندوستانی دخیلی لفظ ہے جو "ورش" (برسات) اور "کال" (موسم) سے مرکب ہے۔ شطرنج بھی ہندوستانی لفظ ہے جو "چترنگ" اور "رنگ" سے مرکب ہے۔ جس کے معنی چار رنگ کے ہیں۔

حکیم سنائی نے اپنے ایک شعر میں ہندوستانی لفظ "پانی" استعمال کیا ہے۔

عثمان مختاری نے "مار" (مارنا کا امر) کا لفظ اپنے ایک فارسی شعر میں استعمال کیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مذکورہ بالا نمونے تنہا الفاظ کے ہیں یہ جملے اور مربوط کارنامے نہیں لیکن اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ کوئی زبان نشو ونما کے خواہ کتنے ہی ابتدائی مرحلے میں کیوں نہ ہو، تنہا الفاظ کی حالت میں نہیں رہتی۔ بلکہ جملے مربوط خیال اور تصور کے اظہار کے ذریعے اس کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ زبانوں کی نشو ونما میں یہ ہوتا ہے کہ جب دو نسل کے لوگ جو الگ الگ زبانیں

کبھی بولتے ہوں، معاشی یا سیاسی اسباب کی بنا پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے سہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو ایک نئی زبان نشو و نما پانے لگتی ہے اس کے اجزا دونوں کی زبانوں سے ترکیب پاتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ کسی سمجھوتے کے ذریعے سے کچھ لفظ ایک زبان کے اور کچھ لفظ دوسری زبان کے لے کر مطلب پورا کیا جائے بلکہ الفاظ اور قواعد کے روپ میں ترکیب عمل میں آتی ہے ایک زبان جو کسی حیثیت سے برتر زبان ہوتی ہے۔ اساس بن جاتی ہے اور فطری انتخاب اور بقائے موزوں کے عمل کے مطابق زبان تشکیل پانے لگتی ہے۔

ایک اور بات یہ بھی ہوتی ہے کہ اجنبی زبان بولنے والے جب کسی نئے ملک میں بڑی تعداد میں جا کر آباد ہو جاتے ہیں، تو وہ مقامی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کو جو ان سے قریب ترین اور سہولت بخش ہوتی ہے اختیار کر لیتے ہیں عرب جب ایران گئے تو انہوں نے یہی کیا۔ صوبہ فارس کی زبان کو انہوں نے اختیار کیا۔ جس کی وجہ سے اس زبان کا ارتقا دوسری زبانوں کے مقابلے میں عمل میں آیا۔ اردو زبان کی صورت میں بھی یہی ہوا۔ باہر سے آنے والے اور نو آباد کار ترکوں ایرانیوں اور عربوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اکثروں نے یہیں شادی بیاہ بھی کیا تھا، اس لئے فطرتاً یہیں کی زبان ان کی گھر کی اور رفتہ رفتہ کاروباری زبان بن گئی۔

پنجاب میں اس دور کے مربوط اردو آثار نہیں ملتے۔ تاہم اس کے تذکرے ملتے ہیں کہ ہندی میں شعر کہے جاتے تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود نے ۱۰۲۲ھ میں جب کالنجر فتح کیا تو کالنجر کے راجہ نندا نے سلطان کی مدح میں

ایک قصیدہ لکھ کر گذرانا تھا۔ یہ قصیدہ محمود کو اتنا پسند آیا کہ وہ اُسے ہند اور عرب کے علماء کو دکھاتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس قصیدہ سے متاثر ہو کر سلطان نے نندا کو پندرہ قلعوں کی حکومت عطا کی تھی۔

مسعود سعد سلمان کے بارے میں بھی یہ روایت مسلسل چلی آرہی ہے کہ اس نے عربی، فارسی کے علاوہ ایک دیوان ہندی میں بھی چھوڑا تھا۔

مسعود سعد سلمان سلطان مسعود ثالث کے عہد میں گذرا ہے۔ وہ لاہور ہی میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں اُس کے باپ سعد سلمان کو مسعود غزنوی نے متوفی مستوفی الممالک، کے عہدہ پر مقرر کر کے بھیجا تھا۔ اکبر کے عہد کے مشہور مورخ عبدالقادر بدایونی نے اس کے ہندی دیوان کو دیکھا تھا۔ امیر خسرو نے بھی اس ہندی دیوان کا تذکرہ کیا ہے۔

فاتح مفتوح

غوریوں کا بڑھتا ہوا طوفان، غزنین سے محمود کی اولاد کو ہٹا کر پنجاب تک پہنچا دینے کے باوجود نہ تھما۔ بلکہ جلد ہی پنجاب کی طرف بھی بڑھا۔ اور اور ان کی پونے دوسو برس سے بنائی ہوئی تہذیبی عمارت کو ڈھا کر، اس کے بکھرے ہوئے آثار کو دوآبے تک پہنچا دیا۔

سلطان شہاب الدین غوری نے سنہ ۵۸۲ھ م ۱۱۸۶ء میں پنجاب کے آخری غزنوی حکمراں، ملک خسرو کو شکست دی اور اس کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس زمانے میں سندھ اور ملتان میں قرامطہ کا زور تھا جن کی فتنہ انگیزیوں سے شہاب الدین برافروختہ تھا۔ ہندوستان پر اس کے حملے کا ایک مقصد یہ بھی بیان کیا ہے۔ پنجاب پر حملہ کرنے کے لئے شہاب الدین کو جموں کے راجہ چکر دیو نے دعوت دی تھی۔ دہلی میں اس وقت چوہان خاندان کے راجپوت راجہ

پرتھوی راج کی حکومت تھی۔ شہاب الدین نے جب بھٹنڈا پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا، تو پرتھوی راج، جس کی قلمرو میں یہ علاقہ تھا، جوابی کارروائی کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ شہاب الدین کا مقابلہ پرتھوی راج سے ہوا، اور شہاب الدین کو شکست ہوئی۔ لیکن ۵۸۸ھ مطابق ۱۱۹۳ء میں شہاب الدین پھر ہندوستان آیا اور اس مرتبہ پرتھوی راج کو شکست ہوئی۔ اور اس کے سارے علاقے پر . . . شہاب الدین کا قبضہ ہوگیا۔ اپنے غلام قطب الدین ایبک کو دہلی میں اپنا نائب السلطنت مقرر کرکے سلطان محمود غزنین واپس چلا گیا۔

قطب الدین ایبک اچھا سپہ سالار اور مدبر تھا۔ اس کی نئی قلمرو کے خلاف بغاوتیں ہوئیں۔ لیکن اس نے سب کو فرو کیا اور میرٹھ اور علی گڑھ کے علاقے مزید اس کے قبضے میں آگئے۔ گجرات اور اجمیر پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا۔ اور مشرق میں بنگالہ کو بھی اس کے جنرل اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی نے اس کی قلمرو میں شامل کردیا۔

سلطان کے انتقال کے بعد، اُس کے تین ترک غلام جو سلطنت کے مختلف حصوں پر مامور تھے، اپنے اپنے حصّے کے حکمراں بن بیٹھے۔ تاج الدین یلدز نے غور پر اپنا قبضہ جمالیا۔

ناصر الدین قباچہ نے سندھ کی حکومت لے لی۔ اور دہلی قطب الدین ایبک کے قبضے میں رہی۔ ان تینوں میں اقتدار کی کشمکش بھی ہوئی۔ جس میں ناصر الدین قباچہ کو اپنی سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور وہ قطب الدین ایبک کے ہاتھ لگ گئی۔ لیکن تاج الدین یلدز سے اس کی پیش نہ گئی۔ اس لئے اُسے ہندوستان

کی حکومت ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ اس طرح غور سے اُس کے تعلقات ٹوٹ گئے۔

قطب الدین ایبک نے پانچ برس حکومت کی سنہ ۶۰۲ھ م سنہ ۱۲۰۵ء تا سنہ ۶۰۷ھ م سنہ ۱۲۱۰ء) وہ غلامی کے درجے سے ترقی کرتا ہوا بادشاہ بنا تھا اس لئے عوام کے مصائب سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اُسے اچھی تعلیم بھی میسر آئی تھی۔ اس کے علاوہ اچھی سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے نئی سلطنت کا بہت اچھا نظم و نسق قائم رکھا۔ وہ فیاض انسان بھی تھا اور عوام میں "لکھ بخش" کے لقب سے مشہور ہو گیا تھا۔

ایبک کو بیس سال دہلی میں حکومت کرنے کا موقع ملا جس کے آخری چار ساڑھے چار برسوں میں وہ خود مختار حکمراں بھی رہا۔ اسے نئی سلطنت کے استحکام میں سعی بلیغ کرنی پڑی اور نظم و نسق قائم کرنے میں ہمہ تن منہمک رہنا پڑا۔ پھر بھی وہ تہذیب و شائستگی کے کاموں سے غافل نہیں رہا۔ اس کے متوسلین میں بہاء الدین محمد اوشی اور جمال الدین محمد نصیر جیسے ادیب اور شاعر تھے۔ شیخ صدر الدین محمد بن حسن نظامی نیشاپوری، جو اپنے زمانہ میں فن تاریخ کے امام مانے جاتے تھے۔ دہلی میں موجود تھے اور ایبک کی فرمائش پر انہوں نے مملوک سلاطین کی پہلی تاریخ "تاج المآثر" لکھی۔

ایبک کے زمانے تک ہندوستان کے نومسلمان بھی علوم و فنون میں بہت ترقی کر چکے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شیخ ابوالرضا رتن بن کرپال ہندی تھے جنہوں نے حدیث اور رجال میں اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ عالم اسلامی کے بڑے بڑے ائمہ فن اُن سے استفادہ کے لئے آتے تھے۔

زاہدوں اور صوفیوں میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی سرفہرست ہیں آپ کے علاوہ ہندوستانی نژاد علماء میں شیخ یعقوب بن علی لاہوری بھی قابل ذکر ہیں۔

ایبک کے بعد شمس الدین التمش نے چھبیس برس تک حکومت کی۔ اسکے انتقال پر اس کے بیٹے فیروز اور بیٹی رضیہ میں کشمکش رہی، ۶۳۴ھ ۱۲۳۶ء سے ۶۳۷ھ ۱۲۴۰ء تک رضیہ نے بھلی بری جس طرح بن پڑا حکومت کی پھر معز الدین، بہرام شاہ، علاء الدین مسعود اور ناصر الدین محمود یکے بعد دیگرے حکومت کرتے رہے۔ اس عرصہ میں غیاث الدین بلبن نے اپنے تدبر سے بڑی ترقی کرلی اور وزارت عظمیٰ پر فائز ہوگیا تھا۔ سلطان ناصر الدین محمود کی وفات (۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء) کے بعد وہ تخت نشین ہوا اور اکیس برس بڑی خوبی سے حکومت کی۔

حقیقت میں مملوک سلاطین میں وہ آخری عظیم الشان حکمران تھا کیونکہ اس کے بعد معز الدین کیقباد اور شمس الدین کیومرث جو اسکے جانشین ہوئے، کمزور بادشاہ تھے۔ ان کے عہد حکومت میں خلجیوں کے بڑھتے ہوئے حوصلے، حکومت کے لئے خدشہ کا باعث بنے ہوئے تھے۔ باہر وسط ایشیا سے خانہ بدوش منگولوں یا مغلوں کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ التمش کے زمانے میں مغلوں کے ٹڈی دل نے چنگیز خاں کی قیادت میں اسلامی سلطنت کے تار وپود بکھیرنے شروع کر دیئے تھے۔ پھر وہ ہندوستان کی طرف بڑھنے لگے تھے لیکن بلبن نے اپنے حزم اور دانائی سے اس سیلاب کو ہندوستان کی طرف

بڑھنے نہیں دیا۔ سندھ، ملتان اور لاہور پر اُن کے حملے ہوتے رہے۔ اور پنجاب پر مغلوں اپنا حق جتاتے رہے۔ تاہم انہیں ہندوستان کی طرف پیش قدمی کرنے کی ہمت نہ ہوسکی۔ اس عرصے میں مرکزی حکومت کی کمزوری نے خلجیوں کو قدم جمانے اور رسوخ حاصل کرنے کا موقع دے دیا۔ چنانچہ آخری مملوک سلطان شمس الدین کیومرث کے مرتے ہی، اقتدار خلجیوں کے ہاتھ میں آگیا۔

مملوک سلاطین کا عہد ہندوستان کی نئی تہذیبی روایات کے ساتھ ساتھ اُردو کی تشکیل اور ابتدائی نشو ونما کے اعتبار سے بھی بہت اہم ہے۔ مملوک سلاطین عام طور پر علم وفضل کے دلدادہ تھے ان میں بھی التمش، بلبن اور ناصر الدین خصوصیت رکھتے ہیں۔ اشاعت علوم کی جو تحریک خود ایبک کے زمانے سے شروع ہوئی تھی۔ وہ ناصر الدین کے عہد میں ترقی پر پہنچ گئی تھی۔ اس لئے اس کے عہد کو "خیر الاعصار" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے بلبن کے عہد تک تبلیغ، رشد وہدایت کے وہ سارے عناصر، جو ملتان اور لاہور میں جمع تھے۔ کھنچ کر دہلی چلے آئے تھے۔ بلبن نے شیخ سعدی کو بھی ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی، علماء میں امام رضی الدین حسن بن محمد صنعانی، مولانا شہاب الدین بدایونی، علامہ برہان الدین محمد بن ابو الخیر بلخی، شیخ ابوبکر بن یوسف سنجری، سید صدر الدین محمد بن سندھی، مولانا شمس الدین خوارزمی، اور دوسرے بیسیوں علماء کی دہلی میں موجودگی کے باعث، عوام اور خواص کے علمی شعور میں بہت کچھ ترقی ہو گئی تھی۔

مشائخین، صوفیار اور زہاد ہیں جن کے ہاتھوں ابتدائی دور میں اردو پروان چڑھی، حضرت خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر، شیخ بو علی شرف الدین قلندر، شیخ ابوبکر طوسی، شیخ حسام الدین ملتانی قابل ذکر ہیں۔ حضرت گنج شکر کے خلفار کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ ہندوستانی لوگوں کو اسلامی عقائد کے سمجھانے اور تصوف کے مسائل اور نکات کو سلجھانے میں یہ بزرگ پیش پیش تھے

حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر، ملتان میں پیدا ہوئے تھے اور حضرت بختیار کاکی سے فیض یاب تھے۔ وہ دہلی آنے سے پہلے ملتان میں رشد وہدایت کا مرکز رہ چکے تھے۔ اور ہندوستانی عوام تک اسلامی عقائد اور مسائل پہنچانے کے لئے انہیں کی زبان استعمال کرتے تھے۔ دہلی آنے کے بعد بھی وہ مرکز ہدایت رہے۔ حضرت نظام الدین اولیار آپ ہی کے خلیفہ تھے۔ حضرت شیخ فریدالدین سے کچھ اردو کلام بھی منسوب ہے مثلاً یہ شعر ان سے منسوب ہیں سے

وقت سحر وقت مناجات ہے　　خیز دراں وقت کہ برکات ہے
پند شکر گنج کہ بدل جاں شنو　　ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

ہندوستان کی خوشگوار آب وہوا نے جس طرح اس سے پہلے نو وارد آریوں کو جنگ وجدل چھوڑکر، علم وفضل اور تمدن کو نشو ونما دینے کی طرف مائل کیا تھا۔ اسی طرح ترکوں کے عہد میں بھی ایرانی اور ہندوستانی تمدن کے عناصر کی ترکیب سے تہذیب وشائستگی کا ایک نیا خمیر تیار ہونے لگا تھا۔

ترکوں کے نظم ونسق کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ بادشاہ کا اقتدار کا سرچشمہ تھا. جس کے احکام وزیروں کے واسطے سے جاری ہوتے تھے۔ حکومت کے کئی شعبے تھے۔ اور فوج منظم تھی. عدالت فیصل خصومات اور دادرسی کا اچھا انتظام تھا۔ برید یعنی ڈاک انتظام بھی بطریق احسن کیا گیا تھا۔

دہلی کے سلاطین نے دربار کی شاندار روایات کو نشوونما دیا تھا سلطان کے گرد صد ہا نقیب وچاؤش، عمائد سلطنت اور فوجی افسر جمع رہتے۔ سلاطین کی شان شوکت کے رعب وداب کے بارے میں بعض روایتیں بیان کی گئی ہیں۔ غیر ملکوں کے سفیر، جب دربار میں حاضر ہوتے تو شدت رعب سے بعض وقت لڑکھڑا جاتے اور بے ہوش ہو جاتے تھے۔

سلاطین کے رہن سہن کے طریقوں میں بھی بڑی شان وشوکت ہوتی تھی وہ بڑے کرّوفر کی زندگی بسر کرتے تھے. عوام اور دوسرے ملک کے سفیروں پر رعب داب قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا. ترک. ایران سے نئے نئے لباس اور نئے نئے کھانے اپنے ساتھ لائے تھے۔ مملوک بادشاہوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن کے شاہی دستر خوان دو قسم کے ہوتے تھے. ایک عام جس پر دونوں وقت بیس ہزار اکابر، ملک، خوانین، امراء اور ممتاز عمال کھانا کھایا کرتے تھے. دوسرا خاص شاہی دستر خوان ہوتا تھا۔ جس پر بادشاہ کے ساتھ دو سو علماء شریک طعام رہتے. کھانے کے دوران میں اکثر علمی اور مذہبی امور پر مباحث کئی

ہوا کرتے تھے۔

سلاطین مملوک ہفتہ میں ایک بار شنبہ کو دربار عام منعقد کرتے دربار وسیع ہال میں منعقد ہوتا تھا۔ جو ہر قسم کی آرائش وزیبائش کے سامان سے سجا ہوا ہوتا۔ صدر میں ایک بلند مرصع تخت زرنگار بچھا ہوا تھا جس پر سلطان جلوس کرتا تھا۔ سلطان کے دائیں بائیں ارباب حکومت دست بستہ کھڑے ہوتے۔ دربار میں صرف قاضی القضا اور خواتین کو بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ سلطان کے دربار میں داخل ہونے کے بعد نقیب اہل حاجت اور مظلومین کو اپنی اپنی عرضیاں پیش کرنے کیلئے بلاتا۔ حاجت مند بلا تکلف آگے بڑھتے اور بادشاہ کی عمر و اقبال میں فراوانی کی دعا کرنے کے بعد عرض حال کرتے۔ سلطان اپنے تدبر سے معاملے کو سمجھ کر حسب ضرورت احکام صادر کرتا تھا۔

سلاطین مملوک کے دور میں تمام فرقوں کو اپنے اپنے طریقہ کے مطابق عیدین اور تہوار منانے کی آزادی تھی۔ ایسے موقعوں پر لہو ولعب اور فضول باتوں سے بھی چشم پوشی کرلی جاتی۔ عیدوں کے موقعوں پر خاص دربار منعقد کئے جاتے جن میں امرا اور عمائدین سلطنت نذر پیش کرتے۔ اس کے بعد بادشاہ کی طرف سے سارے عمائدین سلطنت، علما، اور شعرا کی دعوت بڑے تزک واحتشام سے ہوتی۔ کھانے سے فراغت پاتے ہی رقص وسرود کی محفل جمتی جو دیر گئے تک جاری رہتی۔

ترکوں کی حکومت کا جو ڈھانچہ ہند میں تیار ہوا تقاوہ بہت کچھ حالات کا نتیجہ تھا۔ دہلی کے سلاطین کو اکثر اندرونی سازشوں کا ڈر لگا رہتا تھا۔ اور باہر سے مغلوں کے حملے کا خدشہ تھا۔ ایسے ماحول میں سلطان، جو حکومت کا صدر تھا۔ اُسے بہت محتاط رہنا پڑتا۔ اور مرکزیت پیدا کرنے پر وہ مجبور تھا۔ اس کی قوت کا انحصار فوج پر تھا۔ اسی لئے فوجی عہدہ داروں کو مملکت میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ سلطنت میں دوسرا اہم اثر علماء کا تھا۔ وہ دوہرے فرائض انجام دیتے تھے۔ ایک طرف بادشاہوں کو مذہبی اور اخلاقی اور امر ونواہی کی یاد دلاتے رہتے اور انصاف اور اچھے نظم ونسق پر ابھارتے۔ ان کا دوسرا فرض عوام اور خواص کی تعلیم، ہدایت اور تلقین تھا۔ ان فرائض کو اس دور کے علماء نے بڑی خوبی سے پورا کیا۔ بادشاہ کو راہ راست بتانے کی پاداش میں بعض وقت انہیں مصیبتیں اٹھانی پڑیں اس عہد کے علماء گردوپیش کے حالات سے عملاً کس قدر آگاہی رکھتے تھے، اس کا اندازہ ان کی تبلیغی مساعی کے متصوفانہ انداز سے ہو سکتا ہے۔ وہ جانتے تھے، ہندوستان میں انہیں ایک ایسی بڑی قوم کے ساتھ رہنا ہے جس کا اپنا مذہب ہے، فلسفہ ہے، معاشرت کا انداز ہے اور سب سے بڑھ کر ان کا ایک قومی فخر ہے، جس کو تلوار کے وار بھی مجروح نہیں کر سکتے تھے۔

دہلی میں ترکوں کی حکومت کا عہد اس حیثیت سے بھی اہم ہے کہ اکثر مسلمان حکمران اسلام کے پابند ہوتے ہوئے بھی ایسے عقیدہ پرست نہیں تھے کہ دوسرے مذاہب کی حقیقت سے آنکھیں بند کرلیں۔ مسلمانوں کی کم وبیش ایک سو برس تک

حکومت کے عرصہ میں اور کاموں کے علاوہ اردو کی نشو ونما کے نقطہ نظر سے یہ کام سب سے اہم انجام پایا، وہ ابتدائی تصادم کے بعد، ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنا تھا۔ تو مسلمانوں کی تعداد میں روز افزوں اضافے اس کام کو آسان کر دیا تھا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب کی قدر کرنے لگے تھے۔ اور آپس میں تہذیبی لین دین بھی شروع ہو چکا تھا مذہبی حیثیت سے بھی کچھ سمجھوتے فطرتاً ہو گئے تھے۔ چنانچہ مسلمان، ہندو، رشیوں اور مصلحین کی ویسی ہی عزت کرتے تھے۔ جیسی وہ خود اپنے پیر کی کرتے تھے۔ اسی طرح ہندو بھی مسلمان بزرگوں سے عقیدت رکھتے تھے۔ اس زمانے میں "ستیہ پیر" دونوں کے پیر ہوتے تھے۔ ہندوؤں میں بھگتی تحریک جو اس زمانے کے لگ بھگ اٹھی تھی۔ وہ مسلمان صوفیوں نے عوامی زبان ہندی یا ہندوی کا سہارا لیا تھا۔ اس کے علاوہ ہندی کے اثر سے باہر کے علاقوں جیسے بنگال وغیرہ میں بھی انہوں نے یہی کیا۔ اس سے ہندو مصلحین میں بھی سنسکرت کو چھوڑ کر عوام کی بول چال کی زبانوں میں ہندو مذہب اور عقائد کی شرحیں لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ تاکہ وہ بھی عوام تک پہنچ سکیں۔ یہ کوششیں نئی نشو ونما پانے والی زبانوں کے جلد ہی ترقی کرنے کا باعث ثابت ہوئیں۔ اس زمانے میں اکثر فارسی شعراء نے باہر سے آنے والوں کو ہندوی زبان سکھانے کے لئے نئے نئے طریقے اختیار کرنے شروع کئے تھے۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے میں امیر خسرو اور امیر حسن اعلائے

سنجری، جو فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ اردو، ہندی یا ہندوی زبان کا بھی شغف رکھتے تھے۔ اور اس میں شعر بھی کہتے تھے۔ یہ دونوں بزرگ حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفاء تھے۔

یونان کے بارے میں انگریزی میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ مفتوحہ یونان نے فاتح روم کو فتح کر لیا۔ زبان کی حد تک ہندوستان کے بارے میں بھی یہ قول صادق آتا ہے کیونکہ مفتوحہ ہندوستان نے فاتح ترکوں کو فتح کر لیا تھا امیر خسرو، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ تھے۔ وہ ترک تھے۔ لیکن ہندوستان نے اُن کے دل کو مسخر کر لیا تھا۔ ہندوستان سے امیر خسرو کی محبت عشق کے درجے تک پہنچی تھی۔ اسی لئے ہندوی یا ہندی زبان سے وہ محبت کرتے تھے ہندی میں کئی لوریاں، انملیاں، دو سخنے اور پہیلیاں ان کی لکھی ہوئی بتائی جاتی ہیں۔ وہ ریختہ کی شکل میں بھی لکھتے تھے جس میں مصرعے کا ایک ٹکڑا ہندی اور دوسرا فارسی ہوتا تھا۔ جیسے ؎

زحال مسکین مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
چو تاب ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیو کاہے لگائے چھتیاں

امیر خسرو نے ریختہ کا نام موسیقی کی ان نئی دھنوں کے لئے استعمال کیا تھا۔ جنہیں ایرانی اور ہندوستانی سُروں کو ملا کر تیار کیا گیا تھا۔ ان دھنوں پر وہ جو مصرعے اور شعر موزوں کرتے تھے۔ ان میں بھی فارسی اور ہندی ٹکڑوں کو ملا دیتے تھے بعد میں ریختہ کی اصطلاح، زیادہ تر اردو شاعری کے لئے استعمال ہونے لگی۔

امیر خسرو نے ہندوی یا کھڑی بولی کو عوامی زبان کی حیثیت سے برتا تھا۔ ان کا ایک مقصد اس زبان میں لکھنے کا یہ بھی تھا کہ اس کے ذریعے سے فارسی بولنے والوں کو زبان سیکھنے کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے ان کا جو کچھ بھی کلام ہے وہ عوامی دلچسپی رکھتا ہے۔ پہیلیاں، دوسخنے انملیاں، اور پال، سب عوامی دلچسپی کی چیزیں ہیں، اُن کے ذریعے سے بڑے لکھے لوگوں کے ذہنوں کو اکسانے اور زبان کی طرف مائل کرنے کا بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ اُن کی یہ پہیلی منقولی کی پہیلی ہے۔

تر ور سے اک تریا اتری اس نے بہت رجھایا
باپ کا اس کے نام پوچھا آدھا نام بتایا

آدھا نام پتا پر پیارا، بوجھ پہیلی موری
امیر خسرو یوں کہے اپنے نام نبولی

دوسخنے وہ ہوتے ہیں، جن میں دو بیانوں کا جواب ایک ہی ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں۔

جوتا کیوں نہ پہنا	سنبوسہ کیوں نہ کھایا	تلا نہ تھا
انار کیوں نہ چکھا	وزیر کیوں نہ رکھا	دانا نہ تھا

انملی کا ایک نمونہ محمد حسین آزاد نے یہ پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک کنویں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں امیر خسرو کو رستہ چلتے چلتے پیاس لگی کنویں پر جا کر پانی مانگا۔ ان میں سے ایک امیر خسرو کو پہچانتی تھی۔ سب کو بتایا کہ امیر خسرو جس کے گیت، پہیلیاں، مکرنیاں، اور انملیاں ہم سے سنتے ہیں یہی ہے۔

پھر سب نے فرمائش شروع کی۔ ایک نے کہا مجھے کھیر کی بات کہہ دے۔ دوسری بولی مجھے چرخ کی بات چاہیئے۔ تیسری نے ڈھول کا نام لیا اور چوتھی نے کُتّے کا نام۔ اور سب نے فرمائش کی کہ جب تک ہماری بات نہ کہدوگے ہم پانی نہیں پلائیں گے۔ امیر خسرو کو پیاس شدت سے لگ رہی تھی۔ انھوں نے اسی وقت یہ انملی کہی ؎

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا چلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

سب ہنس پڑیں اور پانی پلایا۔

کچھ مکرنیاں یا کہہ مکرنیاں، بھی امیر خسرو کی لکھی ہوئی بتائی جاتی ہیں۔ ذیل کی "دیا" اور "ڈھول" کی مکرنیاں انہیں سے منسوب ہیں۔

سگری رین موہے سنگ جاگا
بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا
اے سکھی ساجن؟ سکھی دیا

وہ آوے تب شادی ہوئے
اس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے واکے بول
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی ڈھول

امیر خسرو کے دوست امیر حسن بھی فارسی کے نغز گو شاعر تھے۔ ان کا کچھ اردو کلام بھی مل جاتا ہے۔ وہ حسن تخلص کرتے تھے۔ ان کے دو شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ پہلا شعر ریختہ کی شکل میں ہے ؎

آں سیم تن گوید مرا در کوئے من آئی چرا
ماہی صفت تڑپھوں پڑا جو ٹک نہ دیکھوں جائے کر

جب نے سفر پی نے کیا تب تے غریب آوارہ ہوں
پی بیگ آنا کریں یا مجکوں لیں بلوائے کر

شمال کی رو دکن کی طرف

جب مملوک سلاطین کی بساطِ حکومت الٹی تو اقتدار خلجیوں کے ہاتھوں میں آیا۔ اور ملک فیروز، جلال الدین خلجی کا لقب اختیار کر کے ۱۲۹۰ء میں تخت پر بیٹھا۔

جلال الدین تجربہ کار سپاہی اور مدبّر تھا، اسے مملوک سلطان معز الدین کیقباد کے زمانے ہی سے عروج حاصل ہونے لگا تھا۔ شمس الدین کیومرث کے زمانے میں سارا اقتدار خلجیوں کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ اور ترکوں کا سردار ملک ایتمر خاں جو معاملات سلطنت میں دخیل تھا مارا گیا۔ اور مملوک خاندان کا بھی صفایا ہو گیا۔

جلال الدین کے عہد میں نظم و نسق اور دوسرے انتظامی امور میں بہت کم تبدیلی ہوئی۔ علمی اور تمدنی ترقی جس کا آغاز مملوک سلاطین کے زمانے میں

ہو چکا تھا، جاری رہی تبلیغی کام بھی ان علمار کی بدولت ترقی کرتا گیا جو اطراف ہند اور خاص طور پر ملتان، لاہور، اور سندھ سے دہلی میں آکر اکٹھے ہو گئے تھے۔ دوسرے اسلامی ملکوں کے علمار اور فضلار کی آمد کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا۔

جلال الدین کے عہد میں ایک اہم واقعہ جو پیش آیا اس کی وجہ سے اردو کے ایک ممیز ادبی اور شعری زبان کی حیثیت سے نشو ونما پانے کا راستہ ہموار ہو گیا۔ جلال الدین کا بھانجا، جو اس کا داماد بھی تھا۔ بڑا حوصلہ مند مگر بے چین طبیعت کا انسان تھا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ ملکہ یعنی جلال الدین کی بیگم اور علاؤ الدین کی ساس، علار الدین سے غالباً اس کی طبعیت کی وجہ سے زیادہ خوش نہیں تھی۔

جلال الدین خلجی نے علار الدین کو الہ آباد کے قریب کڑہ کی چھاونی میں شاہی افواج کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ علارؤ الدین یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے حوصلوں کے مطابق اس کی ترقی کے مواقع نہیں ہیں، سلطان جلال الدین خلجی کے بیٹے موجود تھے، جو اس کے جانشین ہوتے اس لئے علاؤ الدین نے اس کی طبعیت کے مہم پسند نوجوانوں کی طرح اپنے لئے جہاں نو کی تلاش کا بیڑا اٹھایا۔ شمال میں جلال الدین کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی لیکن جنوب میں دکن اور اس سے آگے، ترکوں کے لئے ایک نئی دنیا تھی جس کا پورا سراغ انہیں ابھی نہیں ملا تھا۔ علاؤ الدین دکن ہی میں قسمت آزمائی کی سوچی۔ اس کا سراغرسانی کا نظام خاصہ اچھا تھا۔ علاؤ الدین کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ دکن

اور جنوبی ہند میں کوئی متحدہ قوت نہیں ہے۔ بلکہ یہ وسیع علاقہ تین چار سلطنتوں اور کچھ چھوٹے چھوٹے علاقوں پر بٹا ہوا ہے۔ ان سلطنتوں کے حکمراں اکثر دوسرے سے برسرِ پیکار رہا کرتے تھے۔

دکن اور جنوبی ہند کے چار اہم خطے، دیوگیر، تلنگانہ، کرناٹک اور معبر تھے دیوگیر پر جو بعد میں دولت آباد کے نام سے موسوم ہوا، یادو خاندان کے راجاؤں کی حکومت تھی۔

تلنگانہ یعنی وہ علاقہ جہاں تلنگی زبان بولی جاتی تھی اور جس کی ایک بعد کی راجدھانی گولکنڈہ میں اُردو شاعری اور ادب نے ابتدائی ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اس وقت کاکتیہ خاندان کے زیرِ نگین تھا۔ کرناٹک کے علاقے پر جو اب ریاست میسور میں شامل ہے، ہوئے سل راجاؤں کا راج تھا۔ ملیبار جسے مسلمان مورخین معبر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ موجودہ تامل ناڈ کے علاقے اور ملیالم بولنے والوں کے علاقے، کرالا پر مشتمل اور چولا خاندان کے راجاؤں کی حکومت میں تھا۔ دیوگیر کے علاقے میں ہند آریائی زبان کا ایک روپ، مہاراشٹری یا قدیم مرہٹی رائج تھا۔ تلنگانہ میں تلنگی زبان بولی جاتی تھی، اور معبر یعنی تامل ناڈ میں تامل زبان اور ملیبار میں ملیالم زبانیں بولی جاتی تھیں۔

علاؤالدین نے دیوگیر پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کی۔ لیکن کہتے ہیں اس کے حملوں سے بہت پہلے سے مسلمان صوفی اسلامی عقائد کی تبلیغ کے لئے دکن آنے لگے تھے۔ اُن کا راستہ عموماً مالوہ اور گجرات پر سے ہوتا ہوا

دیوگیر پہنچتا تھا۔ اس زمانے میں جو صوفی دیوگیر آئے تھے، اُن میں حضرت عارف مومن باللہ بتائے جاتے ہیں، جن کا مزار قلعہ دولت آباد کے روبرو کی پہاڑی کے دامن میں واقع کئی صوفی بزرگ ایسے تھے، جو دیوگیر ہوتے ہوئے بیجاپور چلے گئے تھے۔ اُن میں حضرت حاجی رومی، شیخ نصیر الدین نصر اللہ ولی جو حضرت شیخ فرید الدین کے بڑے صاحبزادے تھے۔ پیر میٹھے، پیر جمنا وغیرہ کے حالات ہم کو مل جاتے ہیں۔

علاؤالدین نے سنہ ۱۲۹۴ء میں دیوگیر پر حملہ کیا۔ اس وقت دیوگیر پر راجہ رام دیو یا رام چندر دیو کی حکومت تھی۔ راجہ نے مقابلہ کیا۔ لیکن اسے شکست ہوئی۔ اور علاؤالدین بہت سا زر و جواہر خراج کے طور پر حاصل کر کے دیوگیر سے لوٹا۔ اب علاؤالدین کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی۔ کہ اس کا دہلی پر حکومت کرنے کا پرانا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آیا۔ اس نے اپنے چچا کو قتل کیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔

دارالسلطنت کے انتظامات سے فرصت پانے کے بعد اس نے جنوب میں تلنگانہ پر حملہ کرنے کے لئے فوج بھیجی، تلنگانہ پر رودر ادیو کی حکومت تھی، وہ طاقتور راجا تھا، اس نے دہلی کی فوجوں کو پسپا کر دیا ——
علاؤالدین اس زمانے میں مالوہ اور گجرات کی مہم میں مصروف تھا گجرات پر حملہ کرنے کے لئے اس نے اپنے سپہ سالار الپ خاں کو مقرر کیا۔ اور اسے گجرات کا گورنر بنا کر بھیجا۔

گجرات پر اس وقت راجہ کرن حکومت کر رہا تھا۔ وہ تاب مقاومت

نہ لاکر راجہ حسانی سے فرار ہو گیا۔ راجا کرن کی دو بیٹیاں تھیں اور دونوں حسن میں شہرۂ آفاق تھیں۔ ان میں سے ایک بیٹی دیول دیوی بہت زیادہ حسین تھی۔ راجا کرن اپنی دونوں بیٹیوں کو لے کر دیوگیر بھاگ گیا۔ شنکر دیو دیول دیوی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے راجا اور اس کی دونوں بیٹیوں کو دیوگیر میں پناہ دی۔ لیکن رام دیو کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ اس لئے اس نے دہلی کو اس کی خبر کر دی۔ علاؤالدین نے اپنے معتمد علیہ جنرل ملک کافور کو دیوگیر روانہ کیا۔ الپ خاں نے دیول دیوی کو گرفتار کر کے دہلی بھجوا دیا۔ جہاں وہ علاؤالدین کے بڑے بیٹے خضر خاں سے بیاہی گئی۔ امیر خسرو نے اس واقعہ پر ایک دلچسپ مثنوی "دیول رانی خضر خاں" لکھی ہے۔

ورنگل میں علاؤالدین کی فوجوں کو ناکامی ہوئی تھی۔ اس لئے سنہ ۱۳۱۰ء میں ملک کافور کو ورنگل پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اس دفعہ دہلی کی فوجوں کو کامیابی ہوئی اور راجا نے تاوان جنگ ادا کر کے صلح کر لی۔ اس کے بعد ملک کافور کرناٹک اور معبر پر حملہ کرنے کے لئے بڑھا۔ اس تک دیوگیر کے راجا رام دیو کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور اس کا بیٹا شنکر دیو اس کا جانشین ہوا تھا اس کی وفاداری دہلی سے مشتبہ تھی۔ اس لئے ملک کافور نے دیوگیر پر نظر رکھنے کے لئے ایک بڑی فوجی چھاؤنی جالند کے مقام پر قائم کی۔ یہاں جو فوجیں تھیں وہ شمال سے آئی تھیں اور ان میں اکثر پرانی اردو بولتے تھے جب ملک کافور کرناٹک کی طرف بڑھا تو کرناٹک کے راجا بلالا نے مقابلہ مناسب نہ جانا۔

اور صلح کرلی۔

ادھر سے فراغت پاکر ملک کافور ملا بار کی طرف بڑھا اور انتہائی جنوب میں راميشورم تک پہنچ گیا۔

ان کامیابیوں نے علاؤالدین کی نظر میں ملک کافور کی وقعت بہت بڑھادی اور وہ سلطنت کے امور میں بہت دخیل ہوگیا۔ چنانچہ ۱۳۱۶ء میں جب علاؤالدین کا انتقال ہوگیا۔ تو اس نے علاؤالدین کے بڑے بیٹے خضر خاں کی بجائے۔ اس کے چھوٹے بیٹے شہاب الدین کو تخت پر بیٹھایا اور خود سیاہ وسفید کا مختار ہوگیا اس کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ علاؤالدین کا دوسرا بیٹا مبارک خاں، جسے قید کر دیا گیا تھا قید سے نکل بھاگا اور ملک کافور کو قتل کرکے، خود مبارک شاہ کے لقب سے بادشاہ ہوگیا۔

مبارک نے ابتدا میں بڑی مستعدی دکھائی اور اپنی داد دہش سے لوگوں میں بڑی مقبولیت بھی حاصل کرلی۔ لیکن اس کا ایک مقرب جو گجرات کے پرواری خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اور بادشاہ کے مزاج میں بہت دخیل ہوگیا تھا، اس کی تباہی اور موت کا باعث بنا۔ مبارک کے ظفر خاں ... ناصر الدین خسرو شاہ کا لقب اختیار کرکے بادشاہ بنا، اور چار مہینے بعد غیاث الدین تغلق کے ہاتھوں قتل ہوا۔

علاؤالدین اور ملک کافور کی دکن اور جنوب پر فوج کشی اور فتوحات نے قدیم مرہٹی، تلگو، کنٹری، تامل اور ملیالم بولنے والے لوگوں کی سرزمین میں شمال کی ایک نوخیز زبان کی اشاعت کے لئے راستہ کھول دیا۔ شمال سے

جو فوجیں تازہ دم آتیں، وہ زیادہ تر ہندوستانیوں افغانوں اور ترکوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ یہ لوگ دہلی اور اس کے اطراف میں رہتے ہوئے اس زبان کو اختیار کر چکے تھے جو ان علاقوں میں تشکیل پا رہی تھی۔ اور جب وہ دکن اور جنوبی ہند آئے تو اسی زبان کو اپنے ساتھ لائے۔ پھر ان کے پیچھے، بہت سے تاجر عہدہ دار اور ان کے خاندان آئے۔ اور سب سے اہم وہ صوفی آئے جن کے آنے کا مقصد جنوب میں اشاعت اسلام تھا۔ یہ صوفی زیادہ تر ملتان، لاہور، دہلی وغیرہ سے آئے تھے۔ وہ جنوب کی زبانیں نہیں جانتے تھے اور اپنے علاقے کی زبان ہی کو وہ تبلیغ اور ہدایت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ملک کافور نے، جنوب میں کئی جگہ بڑی بڑی فوجی چھاؤنیاں قائم کر دی تھیں، اور یہ فوجیں بھی اردو کے پرانے روپ کو دکن میں پھیلانے میں بہت معاون ثابت ہوئیں۔ لیکن ان کا اثر تلنگانے کرناٹک اور ملابار تک بہت کم پہنچا۔ وہ رفتہ رفتہ دیوگیر اور خلد آباد، اور اس کے بعد بیجاپور تک پھیل گیا۔ اور یہی مقامات ابتدائی اردو ادب کی نشو و نما اور زبان کی تشکیل کا گہوارہ بنے۔

جلال الدین خلجی جو خلجی خاندان کا بانی تھا، علم و ادب سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ جب اس نے شہر دہلی کی نئی تعمیر کی، تو اس کو علم و ادب میں بھی مرکزیت حاصل ہوگئی۔ اس کے زمانے کے مشہور علماء میں تاج الدین عراقی، خواجہ حسن امیر ارسلان کلامی وغیرہ بہت نمایاں تھے۔ جلال الدین کی ادب نوازی کا یہ حال تھا کہ جلال الدین نائب سمانہ نے اس کی ہجو میں ایک مثنوی "خلجی نامہ"

کے نام سے فارسی میں لکھی تھی۔ اس جرم پر اسے پا بجولاں جلال الدین کے سامنے لایا گیا۔ جلال الدین نے اسے سزا دینے کی بجائے اس کی جاگیر میں ایک گاؤں کا اضافہ کر دیا۔ اور اسے عزت کے ساتھ رہا کر دیا۔

علاؤ الدین کا عہد ادبی اور علمی ترقی کے لحاظ سے، جلال الدین کے دور سے بھی زیادہ درخشاں رہا۔ اس کے عہد میں جتنے سربرآوردہ علما، دہلی میں جمع ہو گئے تھے کسی اور دور میں کم دیکھے گئے۔ صوفیائے کرام میں سب سے پہلے حضرت نظام الدین اولیاء کا نام آتا ہے۔ جن کا فیض ملک کے دور دراز گوشوں تک پہنچا تھا۔ ابتدائی دور کے بعض اردو لکھنے والے، آپ کے مرید اور معتقدین میں شامل تھے۔ شعراء میں صدر الدین علی، فخر الدین، مولانا عارف، شہاب الدین اور حمید الدین نمایاں تھے۔ امیر خسرو کو بھی اسی زمانے سے نمود حاصل ہونے لگی تھی۔

شعراء اور علماء کے علاوہ اور بھی بہت سے علوم وفنون کے ماہر اس وقت دہلی میں موجود تھے۔ جن کا اثر عوام اور ان کی تہذیبی اور ذہنی زندگی پر گہرا پڑ رہا تھا۔

خلجیوں نے دکن کا راستہ شمال کی تہذیب اور زبان کے اثرات کے پھیلنے کے لئے کھول دیا تھا۔ خلجی اچھے سپاہی تھے لیکن وہ اچھے سیاست داں نہیں تھے۔ دکن میں ان کی فوج کشی، زیادہ تر دولت سمیٹنے کی خواہش کا نتیجہ تھی۔ ان کے سپہ سالار جری تھے لیکن ان میں ذہنی ضبط نہیں تھا۔ اسی لئے جسے فوج پر اقتدار حاصل ہو جاتا، وہی حکومت کرنے کے خواب دیکھنے لگتا۔

علاؤ الدین کے بعد سلطنت کی سیاسی فضا بگڑتی گئی۔ حتیٰ کہ اس کے جانشین قطب الدین مبارک کے عہد میں بادشاہ کا رعب داب ختم ہوگیا تھا۔ بالآخر ایک نومسلم خسرو نے جو اس کے مزاج میں دخیل ہوگیا تھا، اسے قتل کردیا اور اس کے خاتمے کے ساتھ خلجی خاندان کی حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ خسرو ناصرالدین خسرو شاہ کا لقب اختیار کرکے تخت پر بیٹھا لیکن وہ بھی جلد ہی قتل کردیا گیا۔ اور غیاث الدین تغلق نے امراء کے کہنے پر ۱۳۲۰ء میں عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

پہلے آثار

سنہ ۱۳۲۱ء میں دہلی کی حکومت میں جو تبدیلی ہوئی، اس کا اثر یوں تو سارے ہندوستان پر پڑا۔ لیکن جہاں تک دکن کی سیاست اور لسانی نشوونما کا تعلق ہے، یہ اثر دوررس نتائج رکھتا ہے۔

غیاث الدین تغلق نے حکومت سنبھالنے کے بعد ان خرابیوں کو دور کیا، جو خلجی دور کی کوتاہیوں کے باعث پیدا ہوگئی تھیں۔ غیاث الدین حقیقی معنی میں ایک ہندوستانی تھا۔ کیونکہ وہ ایک جاٹ ماں کے بطن سے تھا۔ اور اس تعلق سے اس کی مادری زبان ہندوستانی تھی، جو جاٹوں اور ہریانہ کے علاقہ میں بولی جاتی تھی۔

تخت سلطنت پر بیٹھنے کے دوسرے سال، اس نے اپنے بڑے بیٹے فخر الدین محمد جونا خاں کو ورنگل بھیجا۔ ورنگل کے راجا بڑے صاحب اقتدار

تھے۔ لیکن انہیں شکست ہوئی، ان کی ہار، دراصل شمالی تہذیب اور لسانی اثرات کی جیت تھی۔ راجا تو باقی رہے، لیکن ان کا اقتدار گھٹ گیا اور دکن کے ان جنوبی حصوں تک بھی شمال کی تہذیب اور زبان کا اثر پھیلنے لگا۔

غیاث الدین تغلق کا انتقال ۱۳۲۵ء میں ہوا۔ اور اس کا بیٹا جونا خاں محمد بن تغلق کا لقب اختیار کر کے تخت پر بیٹھا۔ وہ بہت ذہین انسان تھا لیکن اس میں خودرائی کی صفت بڑی تھی۔ وہ اچھا عالم بھی تھا لیکن انسانوں کی فطرت کو سمجھنے اور جانچنے والی نظر اسے نہیں ملی تھی۔ اس نے سلطنت میں زراعت اور خوشحالی کو ترقی دینے کے بہت سے کام کیے لیکن پایہ تخت دہلی سے ہٹا کر، دیوگیر میں لے جانے کا فیصلہ اس کا ایک معرکۃ الآرا فیصلہ تھا اہل سیاست اسے دوربینی سمجھیں گے لیکن اس کے زمانے کے لوگ خاص طور پر دہلی والے، اسے دہلی کی تباہی کہتے رہے۔ اور اردو والے اس فیصلہ کو وہبی الہام کہتے ہیں۔

محمد تغلق نے ۱۳۲۷ء میں پایہ تخت کو دہلی سے دیوگیر تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاید اس معاملہ میں اس نے کسی سے مشورہ بھی نہیں کیا۔ حکم دینے کی دیر تھی۔ دیوگیر میں دولت آباد بسنے لگا۔ سلطان دہلی کے علماء، صناعوں، شاعروں اور سارے اہم لوگوں کو معاوضہ دے دے کر دولت آباد روانہ کیا۔

دہلی کے لوگ، دہلی سے جانے کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ انہیں یاد تھا

کی محبت تھی۔ راستے کی صعوبتوں کا ڈر تھا۔ لیکن ان کے لئے گئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اس سلسلے میں بہت سے قصے بھی بیان کئے جاتے ہیں۔

سلطان کی حکم کی بناپر جب دہلی خالی ہوگئی تو کہتے ہیں کہ شہر میں صرف ایک اندھا باقی رہ گیا تھا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ اس کو بھی سلطان کے حکم سے گھسیٹتے ہوئے دولت آباد لے گئے۔ پھر بعض مورخین نے بات کو بڑھا چڑھا کر یہ بھی لکھا ہے کہ دہلی جو رشک جنت تھی ایسی اجڑی کہ وہاں انسان کا نام ونشان نہیں رہا تھا۔ اور ہر طرف بھیڑیوں اور لومڑیوں اور دوسرے وحشی جانوروں کی آواز کے سوا کوئی اور آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔

غرض دہلی والے صعوبتیں اٹھاتے دولت آباد آئے۔ اور اصل میں دولت آباد کی اصلی دولت یہی لوگ تھے۔ یہ آئے تو پرانی اردو بولتے آئے اور یہاں آباد ہوئے۔ تو سارے دکن میں اس زبان کو پھیلایا۔

ان آنے والوں میں بڑے بڑے صوفی تھے۔ ان میں قطب دکن حضرت شاہ برہان الدین غریب تھے، سید یوسف حسینی عرف سید راجا شاہ راجو تھے، جو حضرت گیسو دراز کے والد ہیں۔ ان کی حرم محترم بی بی رانی تھیں۔ مشہور فارسی شاعر اور اردو کے اولین شاعر امیر خسرو کے دوست میر حسن سنجری تھے۔ خواجہ حسین، شیخ زین الدین تھے۔ یہ سب اردو بولنے والے تھے اور انہوں نے اپنے آثار بھی چھوڑے۔

حضرت برہان الدین غریب کے ساتھ اُن کے مریدین اور معتقدین

اور حضرت نظام المشائخ کے بہت سے مریدین کا بڑا مجمع آیا مشہور ہے کہ زہاد کی چودہ سو پالکیاں دولت آباد پہنچی تھیں۔ ان پالکی نشینوں کے ساتھ کتنے اور لوگ آئے ہوں گے۔ اس کا اندازہ بتانا مشکل ہے۔ سلطان محمد بن تغلق کی والدہ مخدومہ جہاں بھی تشریف لائی تھیں۔

دولت آباد میں تھوڑے سے عرصہ کے اندر اندر ایک بڑا بارونق شہر کھڑا ہو گیا۔ جن سیاحوں نے اس وقت کو دیکھا تھا۔ اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ اور جنت ارضی سے تشبیہ دیتے ہیں۔

اس جنت ارضی کا لطف اٹھانے کے لئے محمد بن تغلق زیادہ دن تک زندہ نہ رہ سکا۔ دو برس کے اندر اندر ملتان کشلو خاں کی بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے فرو کرنے کو وہ شمال کی طرف گیا۔ اور پھر اپنے جیتے شہر کو واپس نہ ہو سکا۔ ۱۳۵۱ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

محمد بن تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق بادشاہ ہوا اور محمد تغلق کی حکمت عملی کے نتیجہ کے طور پر جو افراتفری سلطنت میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو دور کرنے کی کوشش کی۔

فیروز رحمدل انسان تھا۔ اس نے رعایا کی بہبودی کے بہت سے کام کئے۔ لیکن وہ طاقتور انسان نہیں تھا۔ اس لئے گجرات، بنگال اور سندھ کے علاوہ دکن کے بہت سے حصے خود مختار ہونے لگے۔ چنانچہ دکن میں بہمنی سلطنت کی داغ بیل پڑی۔ بنگال میں حاجی الیاس نے خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد گجرات میں احمد شاہی حکومت قائم ہو گئی۔

اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک نئی تہذیب اور نئی لسانی روایات نشوونما پانے لگیں۔

محمد بن تغلق کے حکم سے جو بزرگ دولت آباد آئے تھے، ان میں سے اکثر بعد میں خلد آباد چلے گئے تھے۔ جہاں انھوں نے تبلیغ، ارشاد اور ہدایت کا کام جاری رکھا۔ ان میں امیر حسن اعلائے سنجری جیسے فارسی کے سربرآوردہ شاعر بھی تھے۔ جن کا کچھ اردو کلام ریختہ کی صورت میں دستیاب ہوتا ہے۔ حضرت شیخ برہان الدین غریب، اور ان کے ارادت مندوں میں شیخ زین الدین اور ساتھیوں میں حضرت سید یوسف حسینی عرف سید راجا بادشاہ راجو کے کچھ اردو آثار مل جاتے ہیں۔

اس زمانے میں عورتوں کے عقائد کی درستی کا مسئلہ بھی بہت اہم ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہیں کی ہدایت کے لئے حضرت شاہ راجو نے ایک "سہاگن نامہ" اور نثر میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ "سہاگن نامہ" میں وہ بڑے پیار سے عورتوں کے عقائد کی درستی کی کوشش کرتے ہیں۔ عورتوں کو وہ ہر جگہ "سہاگن" جیسے احترام کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ وہ ان پڑھ عورتوں کو سمجھاتے ہیں کہ وہ کون سے عقائد ہیں جن سے ایمان جاتا ہے اور کن کن کاموں کے کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔

اپنے نثری رسالے میں وہ مردوں کے عقائد کی درستی کی کوشش کرتے اور انہیں مذہب اسلام کے عقیدوں سے واقف کراتے ہیں۔

دکن میں پہلے پہل ترکوں کا اقتدار رہا تھا اور ان ترکوں میں سے اکثر

پرانی ارڈو زبان بو لتے اور سمجھتے سکتے۔ اسی وجہ سے دکن کے دراوڑ زبانیں بو لنے والے، ارُدو کو "ترک ماٹ"، یا "ترک مات"، یعنی ترکوں کی بولی سے موسوم کرتے تھے۔ اردو کے لئے یہی نام آج بھی دکن کے دراوڑ علاقوں میں مروج ہے۔

نئی تہذیب اور نئی لسانی روایات

سنہ ۱۳۴۷ء میں علاؤ الدین حسن بہمن شاہ نے دکن میں خود مختار حکومت قائم کرلی۔ پہلے پہل اس کا پایہ تخت دولت آباد تھا۔ لیکن جلد ہی اس نے گلبرگہ کو پایہ تخت بنالیا۔ اور اس کا نام حسن آباد رکھا۔ بہمنی خاندان کے کل اٹھارہ حکمران ہوئے۔ ان میں اکثر بڑے قابل اور علم دوست بادشاہ گذرے ہیں۔ جنہوں نے دکن میں نئی تہذیبی روایات کو ترقی دی اور نئی ادبی اور لسانی روایات کی بنیاد بھی رکھی۔

علاؤ الدین کی حکومت کا بڑا حصہ جنگ وجدل میں گذرا پھر بھی اس نے سلطنت کی ذہنی آرائش کی کوشش کی اور صدر الشریف سمرقندی، رضی الدین جگا جوت، ملا اسحٰق سرہندی، حکیم نصیر الدین شیرازی کو اس نے پایۂ تخت میں بلایا اور ان کی بڑی قدر افزائی کی۔ مولانا عصامی جو اس عہد کے مورخ

تھے، وہ بھی گلبرگہ میں موجود تھے۔ انہوں نے فتوح السلاطین کے نام سے ایک منظوم تاریخ لکھی۔ تعلیم کو بھی اس نے ترقی دی۔ علاؤ الدین کے بعد اس کے بیٹے محمد شاہ اول نے بھی نظم و نسق اور سیاست کی مصروفیتوں کے باوجود تہذیب اور شائستگی اور علم دین کی اشاعت میں بہت حصہ لیا بہمنیوں کے دربار کی شان و شوکت کی روایات اسی بادشاہ سے چلی تھیں۔ اس کا دربار سجاوٹ کے لحاظ سے دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ عمدہ ایرانی قالین کا فرش زربفت کے جگمگاتے ہوئے شامیانے، دیواروں پر ریشم اور زردوزی جھلکتے ہوئے پردے، اسی پر درباریوں کے لباس، حاجبوں اور خدام کی پُر سکوت چوکسی اور ان سب پر طرہ خود بادشاہ جہاں پناہ پر رعب انداز دیکھنے والوں کو دنگ کر دیتا تھا۔ مشہور تخت فیروزہ بھی اسی بادشاہ کے عہد میں آیا تھا جس پر بادشاہ دربار میں بیٹھا کرتا۔ دربار میں امراء کے مقام اور نشست و برخاست کے آداب بھی مقرر تھے۔ اس عہد میں روحانی پیشوا صوفی اور زاہد بھی گلبرگہ میں کافی تعداد میں موجود تھے۔ جو عوام حتیٰ کہ بادشاہوں کے اخلاق و عادات پر بھی نظر رکھتے اور جب ضرورت پڑتی اس کی اصلاح کی کوشش کرتے حضرت زین الدین کے کہنے سے محمد شاہ نے شراب پینا چھوڑ دیا تھا۔ اور حدود سلطنت میں شراب کی دکانیں بند کرا دی تھیں۔ حضرت زین الدین کا کام بھی عوام کو ارشاد و ہدایت کرنا تھا۔ اور وہ دکن کے لوگوں کو پرانی اردو ہی میں احکام دین سمجھاتے تھے۔

حضرت عین الدین گنج العلم جو اپنے زمانے کے بڑے عالم تھے۔ اور

علاؤ الدین حسن کی تخت نشینی کے وقت دولت آباد میں موجود تھے بعد میں بیجاپور چلے گئے تھے۔ جہاں انہوں نے ارشاد و ہدایت کا کام جاری رکھا۔ انہوں نے دکھنی عوام کی اصلاح کے لئے کچھ رسالے پرانی اردو میں لکھے تھے۔ حضرت عین الدین کا انتقال محمد شاہ کے زمانے میں ہوا۔

محمد شاہ کے بعد اس کا بڑا بیٹا مجاہد شاہ اور پھر علاؤ الدین کا دوسرا بیٹا داؤد شاہ تخت نشین ہوئے۔ اُن کے زمانے میں سلطنت میں بعض امراء کی سازشوں کی وجہ سے کچھ بے چینی رہی۔ لیکن محمد شاہ ثانی جب تخت نشین ہوا تو حالات بہت کچھ سنبھلے۔ یہ بادشاہ بھی علم دوست تھا۔ اس کے زمانے میں فضل اللہ انجو اور شیخ سراج جنیدی جیسے علماء گلبرگہ میں موجود تھے علم و ادب سے بھی محمد شاہ کو دلچسپی تھی۔ اس لے بہت سے شعراء اور علماء کو پایۂ تخت میں بلایا تھا۔ خواجہ حافظ کو بھی اس نے گلبرگہ آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن وہ نہ آ سکے۔ محمد شاہ خود بھی شاعر تھا۔ اس کے فارسی کے کچھ اشعار دستیاب ہو جاتے ہیں۔ ۱۳۹۷ء میں محمد شاہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کا مرتے ہی ملک میں پھر شور برپا ہونے لگا۔ اور ایک سال کے اندر اندر دو بادشاہ، غیاث الدین اور شمس الدین تخت پر بٹھائے گئے اور اتارے گئے۔ یہ سب ایک ترک غلام تغلچیں کی شرارت کا نتیجہ تھا۔ جو اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔ لیکن فیروز شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی ساری شورشیں فرو ہو گئیں۔ بہمنی خاندان کے اس آٹھویں حکمراں کے عہد میں بہمنی سلطنت شان و شوکت تہذیب اور علم و فن، ہر لحاظ سے اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی۔ فیروز شاہ مدبر

بادشاہ اور علم و فضل کا دلدادہ بھی تھا۔ زبانوں کے سیکھنے کا اسے بہت شوق تھا۔ اسی شوق کی تکمیل کے لئے اس نے کئی زبانیں بولنے والی عورتوں سے شادی کی تھی۔ اور ان کی زبان کو آلودگی سے بچانے کے لئے ہر ایک کو علیحدہ محل میں رکھا تھا۔ وہ اچھا شاعر بھی تھا۔ اور عروجی اور فیروزی تخلص کرتا تھا۔ اس کے دربار میں علماء اور صوفیاء کا جمگھٹا تھا۔ اور فیروز کے پاکیزہ مذاق نے ملک کی ذہنی آرائش کے بہت سے سامان فراہم کر دیئے تھے۔

فیروز شاہ کے عہد کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے دور حکومت میں حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز گلبرگہ تشریف لائے۔ فیروز شاہ نے آپ کی بڑی عزت کی۔ آپ کی عمر اس وقت اسّی برس کی تھی۔ عرفان اور تصوف میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ گلبرگہ آنے کے بعد آپ ارشاد و ہدایت کا مرکز بن گئے تھے۔ آپ کے درسوں میں سب ہی زبان بولنے والے شریک رہتے تھے۔ لیکن پرانی اردو یا دکھنی بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ آپ فارسی میں اور کبھی کبھی اردو میں بھی ارشاد و ہدایت فرماتے تھے۔ اردو میں آپ کے ارشاد و ہدایت کی باتوں کو معتقدین لکھ لیا کرتے تھے۔ فارسی میں آپ کی کئی تصانیف ہیں۔ اور اردو میں بھی کئی رسالے آپ سے منسوب ہیں۔ معراج العاشقین، شکار نامہ، تمثیل نامہ، خلاصہ توحید، تلاوت الوجود، آپ کے ارشادات پر مشتمل ہیں۔ آپ کبھی کبھی اردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ اپنے والد بزرگوار کی طرح، آپ نے عورتوں کو سہل طریقے پر اسلامی عقائد سکھانے کے لئے ایک چھوٹی سی نظم "چکی نامہ" کے نام سے لکھی تھی۔

حضرت کے بڑے فرزند محمد اکبر حسینی بھی جنہیں آپ "میاں بڑہ" پکلا کرتے تھے۔ بڑے پایہ کے بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کا انتقال والد کی زندگی ہی میں ہو گیا۔ والدہ کی طرح آپ اردو میں شعر کہتے تھے اور آپ کے اشعار بھی ارشاد و ہدایت کی خاطر کہے گئے ہیں۔ اکثر اشعار میں آپ نے پیر کے احکام پر چلنے کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے۔ اکبر حسینی نے اردو میں ایک مختصر سا رسالہ بھی لکھا ہے۔ اس رسالے میں آپ نے زندگی کے زود فنا ہونے کا تذکرہ کیا ہے اور نیک اعمال کی ترغیب دلائی ہے۔ شیخ عین الدین گنج العلم جو اس زمانے کے ایک اور بڑے عالم تھے ان کا انتقال فیروز شاہ کے عہد میں ہوا۔

فیروز شاہ کا انتقال ۱۴۲۱ھ میں ہوا۔ اس کا جانشین احمد شاہ بہمنی بزرگانِ دین کا بڑا معتقد تھا۔ حضرت گیسو دراز سے اسے بے انتہا عقیدت تھی اور حضرت بھی اسے بہت چاہتے تھے جانشینی کے مسئلہ پر فیروز شاہ میں اور حضرت گیسو دراز میں اختلاف ہو گیا تھا۔ فیروز اپنے لڑکے حسن خاں کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا لیکن حضرت گیسو دراز، احمد خاں کی صلاحیتوں کے زیادہ قائل تھے۔ فیروز شاہ نے اپنے بیٹے کے لئے بہت کوشش کی لیکن احمد خاں کو تخت و تاج نصیب ہوا۔

احمد خاں کے زمانے میں بھی علمی ترقیاں برابر جاری رہیں اور تہذیب اور شائستگی کے وہ کام جو محمد شاہ کے زمانے سے شروع ہوئے تھے آگے بڑھتے گئے۔ احمد خاں کے عہد حکومت میں پائے تخت گلبرگہ سے بیدر منتقل کیا گیا۔

نئی بساط جب بچھی تو تہذیب وشائستگی کے نئے نئے زاویے ابھرنے لگے بیدر میں جو شاہی محلات بنوائے گئے تھے وہ شان وشوکت اور فن کے لحاظ سے قابل دید تھے "تخت محل"، جہاں تخت فیروزہ بچھایا جاتا تھا، اپنے زمانے کا اعجوبہ تھا۔ اس زمانے میں ایرانی شاعر، شیخ آذری اسفرائینی بیدر میں تھا۔ اس نے محل کی تعریف میں اشعار لکھے تھے۔ آذری فارسی کا بہت اچھا شاعر تھا۔ اور احمد شاہ نے اسے ملک الشعراء کا اعزاز عطا کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ اردو میں بھی شعر کہتا تھا۔ اور بہمنی سلاطین کی تاریخ "بہمن نامہ" کے نام سے دکھنی میں منظوم کی تھی، جو ہمایوں شاہ کے عہد تک پہنچی تھی اس کی تکمیل ملا محمد تقی نظیری اور ملا سامعی نے کی لیکن یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی

احمد شاہ کے عہد میں بڑے بڑے جید علماء موجود تھے حضرت گیسو دراز کا علمی اور روحانی فیض احمد شاہ کے عہد میں بھی برابر جاری رہا۔ اور آپ کا انتقال احمد شاہ کے عہد میں ہوا۔ احمد شاہ نے شاہ نعمت اللہ کو بھی بیدر آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن آپ تشریف نہ لا سکے۔ بلکہ اپنے پوتے شاہ نور اللہ کو بیدر روانہ فرمایا۔ شاہ نعمت اللہ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند شاہ خلیل اللہ بھی بیدر آگئے تھے۔

احمد شاہ کے جانشین علاؤ الدین ثانی کے عہد میں سلطنت میں کچھ توسیع ہوئی۔ اور علوم وفنوں کی ترقی جاری رہی۔ تاہم اس زمانے سے دکن کے لوگوں اور باہر سے آنے والوں کے درمیان کش مکش شروع ہو گئی۔ یہ کش مکش حقیقت

میں بہمنی سلطنت کے انجام کا آغاز ہوئی۔ جہاں تک علم رفن کی ترقی کا تعلق ہے ۔ یہ زمانہ بھی اچھا ہی رہا۔ ملک کی ذہنی اور اخلاقی حالت کو سدھارنے کے لئے جوئے اور شراب کونوشی کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ لیکن بادشاہ خود شراب پیتا تھا۔ شیخ آذری نے بادشاہ کے لئے ایک نصیحت نامہ لکھا، جس کے اثر سے اس نے شراب چھوڑ دی تھی۔

ہمایوں شاہ جو ظالم کے لقب سے مشہور رہے، جب تخت پر بیٹھا، تو سلطنت کی چولیں ڈھیلی پڑنے لگی تھیں۔ ان علماء کو جو حصول تخت کی کش مکش میں اس کے مخالف تھے۔ اس نے گرفتار کر کے قید کر دیا تھا۔ محمود گاواں اسی زمانے میں تجارت کی غرض سے بیدر آیا تھا۔ اُسے ہمایوں نے سرلشکر مقرر کر دیا۔ شاہ حبیب اللہ، ہمایوں کے عہد میں شہید کئے گئے۔ غرض ہمایوں کا دور اس کے مظالم سے پر ہے۔ جب وہ مرا تو نظیری نے تاریخ کہی تھی۔

ہمایوں شاہ مرد درست عالم
تعالے اللہ زہے مرگ ہمایوں
جہاں پر ذوق شد تاریخ مرگش
شد ہم ذوق جہاں آر بیروں

ہمایوں کا عہد بھی سر برآوردہ علماء اور شعراء سے خالی نہیں تھا۔ شاہ ظاہر اسنز آبادی اور ملا محمد نقی نظیری اس زمانے کے مشہور فارسی شاعر تھے۔ نظیری اردو میں بھی شعر کہتا تھا۔ ہمایوں کے بعد اس کا آٹھ سالہ بیٹا احمد شاہ ثالث نظام شاہ کے لقب سے تخت پر بٹھایا گیا۔ لیکن سلطنت کے کاروبار اس

کی ماں مخدومۂ جہاں نرگس بانو انجام دیتی تھی، جو قابل عورت تھی۔ محمود گاواں
نے سلطنت کی بڑی شائستہ خدمات انجام دیں۔ علماء اور فضلا کا بھی وہ سرپرست
تھا۔ اس نے بیدر میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ اور کتب خانہ بھی قائم کیا تھا۔ محمود شاہ
لشکری کے زمانے میں محمود گاواں نے بہت ترقی کی اور سلطنت میں بہت اقتدار
حاصل کر لیا۔ یوسف عادل خاں جو بعد میں عادل شاہی سلطنت کا بانی ہوا،
محمد شاہ کے عہد کے اہم سپہ سالاروں میں تھا۔ محمد شاہ نے مشرق میں اڑیسہ
وغیرہ کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۱۴۸۱ء میں دکھنیوں اور
آفاقیوں کے جھگڑے میں محمود گاواں قتل کر دیا گیا۔ اس کے دوسرے سال
محمد شاہ کا انتقال ہو گیا۔ محمد شاہ، بہمنی حکمرانوں میں آخری عظیم الشان
بادشاہ تھا۔ اس کے بعد سلطنت پر زوال آنے لگا۔ محمد شاہ کے عہد میں
نظامی شاعر گذرا ہے، جس نے ایک مثنوی "کدم راؤ اور پدم راؤ" لکھی تھی
جو قدیم اردو کی پہلی مربوط اور کسی قدر بسیط مثنوی ہے۔ محمد شاہ کے
بعد اس کے جانشینوں، محمود شاہ، احمد شاہ رابع، علاؤ الدین، ولی اللہ
اور کلیم اللہ کا زمانہ در اصل طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ محمود شاہ نے بھلی بری
طرح کوئی چھبیس برس حکومت کی۔ اس کے زمانے میں سلطنت کے بڑے بڑے
عمائد، دکھنیوں اور آفاقیوں کے جھگڑے میں مارے گئے۔ محمود شاہ کے زمانے
میں قاسم برید، ترکی سردار کو اقتدار حاصل ہونے لگا۔ جس نے بالآخر اس کے
جانشینوں کو بریدی امراء کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا دیا تھا۔
اس زمانے میں ایک روسی سیاح نکتین دکن آیا تھا۔ ان کے بیان سے

سلطنت کی خستہ حالی پر روشنی پڑتی ہے۔ اس خستہ حالی سے فائدہ اٹھاکر بہمنی سلطنت کے گورنروں نے مختلف حصوں میں خود مختار حکومتیں قائم کرلیں۔

جس سال بہمنی حکمران محمد شاہ ثانی کا انتقال ہوا۔ اسی سال گجرات میں بھی ایک علیحدہ خود مختار سلطنت کی بنیاد پڑی۔ گجرات کو سنہ ۱۲۹۷ء میں علاؤالدین خلجی نے فتح کیا تھا۔ اس کے عرصہ بعد تک یہاں دہلی کی طرف سے گورنر مقرر کئے جاتے تھے۔ سنہ ۱۳۹۱ء میں محمد شاہ تغلق نے ایک نومسلم راجپوت کو یہاں کا گورنر بناکر بھیجا تھا۔ دہلی کی سلطنت کی ابتری کے زمانے میں سنہ ۱۴۰۱ء میں اس نے خود مختاری کا اعلان کردیا۔ اسے عجیب طرح کا اتفاق کہنا چاہیئے کہ محمد شاہ نے چار گورنر بنائے۔ ظفر خاں کو گجرات کا، خضر خاں کو ملتان کا، دلاور خاں کو مالوہ کا۔ ملک سرور کو جونپور کا گورنر بنایا۔ ان چاروں نے جلد یا دیر میں خود مختاری کا اعلان کردیا۔

تین سال کے بعد ظفر خاں کے بیٹے تاتار خاں نے باپ کو قید کرکے خود حکومت حاصل کرلی۔ اور ناصرالدین محمد شاہ کا لقب اختیار کرکے بادشاہ بن گیا۔ اس نے دہلی پر بھی حملہ کرنے کی تیاری کی تھی۔ لیکن وہ قتل کردیا گیا۔ اس کے بعد ظفر خاں نے سلطان مظفر شاہ کا لقب اختیار کرکے باضابطہ خود مختار سلطنت قائم کرلی۔ سنہ ۱۴۱۱ء میں اس کا پوتا احمد شاہ بادشاہ ہوا۔ اس نے سلطنت کو منظم کرنے کی کوشش کی اور اسے وسعت بھی دی۔ پایہ تخت کے لئے اس نے اپنے نام پر احمد آباد کا شہر بسایا جو اپنی عمارتوں اور باغات

کی خوبی کی وجہ سے بہت مشہور تھا

احمد شاہ نے علم وفن کی سرپرستی کی اور ملک کے تہذیبی اور علمی معیار کو بڑھانے میں اس کا بڑا ہاتھ رہا۔

اس خاندان کے چودہ بادشاہوں نے کوئی پونے دوسو برس حکومت کی محمود بیگرہ گجرات کے حکمرانوں میں سب سے زیادہ عظیم الشان بادشاہ مانا گیا ہے۔ یہ نظام شاہ بہمنی کا معاصر تھا۔ اور اس نے مالوہ حکمران محمود شاہ خلجی کے خلاف اس کی مدد بھی کی تھی۔ محمود کے جانشینوں میں بہادر شاہ بہت جری حکمران گذرا ہے۔ اس نے مالوہ کی سلطنت کو فتح کرکے گجرات میں شامل کرلیا تھا۔ بہادر شاہ کے بعد سلطنت پر زوال طاری ہونے لگا۔ اور ۱۵۷۲ء میں اکبر نے آسانی سے اس کو فتح کرکے دہلی کی حکومت کا صوبہ بنا لیا۔

گجرات کے حکمرانوں نے احمد آباد اور سلطنت کے دوسرے شہروں کی زینت نفیس عمارتوں اور باغات کی تعمیر سے کی۔ ان باغات میں ایران اور ہندوستان کے مختلف حصوں سے میووں کے درخت منگوا کر لگوائے۔ زراعت کی طرف بھی انہوں نے خاص توجہ کی۔

گجرات میں چاول نہیں پیدا ہوتا تھا۔ شاہانِ گجرات نے عمدہ قسم کے بیج منگوا کر وہاں چاول پیدا کیا۔ صنعت وحرفت کو بھی اس زمانے میں بڑی ترقی ہوئی۔ احمد آباد اور دوسرے شہروں میں کئی کارخانے قائم کئے گئے۔ جن میں بیش قیمت کپڑے جیسے زربفت، کمخواب، مخمل، وغیرہ تیار ہوتے تھے۔ ہاتھی دانت کا کام بھی بہت عمدہ ہوتا تھا۔ گجرات کے صناعوں میں اچھے سنگ تراش، زردوز،

اور تبلیغ کا کام کرنے والے بھی تھے۔

گجرات کے طول وعرض میں صدہا مدارس تھے، جن میں بچوں سے لے کر معمر لوگوں تک کی تعلیم کا عمدہ انتظام تھا۔ بڑے بڑے عالم یہاں جمع ہو گئے تھے۔ جن میں سے شیخ علاؤ الدین علی بن احمد مہائمی، مفتی رکن الدین، مولانا راجح داؤد گجراتی، شیخ وجیہہ الدین علوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ صوفیا میں حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ شیخ حسام الدین عثمان بن داؤد ملتانی، علامہ کمال الدین دہلوی، جو حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے بھانجے اور خلیفہ تھے شیخ یعقوب بن مولانا خواجگی، جو شیخ زین الدین خلد آبادی کے خلیفہ تھے۔ شیخ کبیر الدین ناگوری، قاضی علیم الدین شاطبی جو سید راجو کے خلیفہ تھے۔ شیخ احمد کھٹو جو گجرات میں گنج بخش کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے علاوہ سینکڑوں اہل بصیرت اس طویل مدت میں یہاں تشریف فرما رہے۔ اور کچھ خود اس سرزمین سے ایسے جنہوں نے عوام کی ذہنی اور روحانی ترقی کی کوشش کی۔ ان میں اکثر علماء نے درس وتدریس، اور ارشاد وہدایت کے لئے پرانی اردو سے کام لیا۔ چنانچہ حضرت قطب عالم جو احمد شاہ کے عہد میں احمد آباد آ گئے تھے۔ اور ان کے فرزند شاہ عالم ارشاد وہدایت اردو یا ہندی میں بھی فرماتے تھے۔ ان بزرگوں کے سامنے حقیقت میں سب سے اہم کام، گجرات کے لوگوں تک اسلام کے احکام پہنچانا تھا۔

حضرت سید محمد جونپوری کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ آپ معتقدین کو اکثر ہندی اور گجراتی میں مخاطب فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ شیخ احمد کھٹو

کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا: "رو پیٹنے خدا کون پوچھے" شیخ وجیہ الدین احمد علوی، اپنے وطن محمد آباد (جانپانیر) سے احمد آباد آگئے تھے۔ آپ بھی اپنے زمانے میں ارشاد و ہدایت کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ اور اکثر اردو میں ارشاد فرماتے تھے۔

گجرات کے وہ بزرگ جن کے پرانی اردو میں مکمل کارنامے ملتے ہیں، ان میں شیخ خوب محمد چشتی، شیخ بہاؤ الدین باجن اور سید شاہ علی جیو گام دھنی قابل ذکر ہیں، شیخ خوب محمد نے متصوفانہ مسائل پر ایک مثنوی "خوب ترنگ" مولانا رومی کی مثنوی کے انداز پر لکھی تھی۔ شیخ بہاؤ الدین باجن خاندیس کے رہنے والے تھے۔ باجن تخلص کرتے تھے۔ ان کا بھی متصوفانہ کلام مل جاتا ہے سید شاہ علی جیو گام دھنی سادات رفاعیہ سے تھے اور اپنے زمانے کے زاہدوں اور صوفیوں میں بڑا رتبہ رکھتے تھے۔ آپ کا کلام "جواہر اسرار" کے نام سے مدون ہوا ہے۔

ان بزرگوں کے علاوہ امین نام کے دو شاعر گجرات میں گذرے ہیں جو اردو میں شعر کہتے تھے۔

اردو جیسے جیسے مختلف علاقوں میں پھیلتی گئی، اس مقام کے نام سے وہ موسوم کی جاتی رہی۔ چنانچہ گجرات میں اُسے ہندی اور گوجری کے ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا۔ دکن میں وہ دکھنی سے موسوم کی گئی۔ اس زمانے میں زبان کی حالت بہت سیال تھی۔ رفتہ رفتہ اس زبان میں کچھ مقامی اثرات سے تھوڑی بہت تبدیلیاں بھی ہوگئی تھیں۔

جس زمانے میں بہمنی اور گجرات کی سلطنتوں میں تہذیب اور شائستگی کو ترقی ہو رہی تھی اور علم و ادب کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ شمالی ہند اور خاص طور پر دہلی کی حکومت میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔

تغلق شاہی حکومت کے خاتمے کے بعد دہلی کے امرا نے دولت خاں لودی کو بادشاہ منتخب کیا۔ لیکن مغرب کی طرف سے مغلوں کا جو طوفان اٹھ رہا تھا۔ اس کی صدائے بازگشت دہلی میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ چنانچہ ملتان کا گورنر خضر خاں تیمور کی طرف سے دہلی پر حملہ آور ہوا اور دہلی پر قبضہ کرلیا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو تیمور کا نائب سمجھتا رہا۔ خضر خاں اور اس کے خاندان کی حکومت سیدوں کی حکومت کہلاتی ہے۔

فیروز شاہ کے بیٹے اور جانشین مبارک شاہ کے عہد میں دہلی کی حکومت سکڑ کر شہر اور اطراف کے چند اضلاع تک رہ گئی تھی۔ مبارک کے دو جانشینوں محمد احمد اور علاؤالدین احمد شاہ کے زمانے میں یہی حالت رہی یہ نہایت کمزور حکمراں تھے۔ اس لئے اپنے وزیروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ بالآخر بہلول خاں لودی، جو لاہور، سرہند کا گورنر تھا اتنا مقتدر ہوگیا کہ احمد شاہ نے تخت سلطنت اس کے حوالے کر کے اپنے بدایون کے محل میں گوشہ نشین ہو جانا بہتر جانا۔

اس بدامنی کے زمانے میں بھی دہلی میں علم و فضل اور تہذیبی روایات کو تھوڑی بہت ترقی ہوتی رہی، کچھ علما وہاں اکٹھے ہوگئے تھے۔ جنہوں نے علم و فضل کی خدمت جاری رکھی۔ مبارک شاہ کے زمانے میں یحییٰ بن احمد

سرہندی نے اپنی معرکتہ الآرا، تاریخ مبارک شاہی لکھی تھی، جو اس عہد کی نہایت مستند تاریخ ہے۔

بہلول خاں لودی، دہلی کا پہلا افغان بادشاہ تھا جس نے ۱۴۵۱ء میں عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور بگڑے ہوئے حالات کو درست کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بیٹے سلطان سکندر شاہ کے زمانے میں کچھ مزید ترقی ہوئی سکندر بہترین لودی حکمراں تسلیم کیا جاتا ہے۔ تاہم اس نے بعض امیروں کو ناراض کر دیا تھا۔ اس لئے بہار میں دریا خاں لوہانی نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ بنگال میں حاجی الیاس نے اپنی حکومت علیحدہ کر رکھی تھی۔ اور کشمیر، مالوہ اور جونپور بھی خود مختار تھے۔ ان مقامات میں بھی علمی ترقی کے کام کچھ نہ کچھ ہو رہے تھے۔

اصل میں اس زمانے کے علماء کرام اور صوفیا کو جو مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اسلام کے حقائق ہندوستانی عوام تک پہنچانے کی لگن لگی ہوئی تھی۔ اور جہاں تک ہماری زبانوں کے ابتدائی ادب کا تعلق ہے، مذہب ہی اس کا سب سے بڑا محرک تھا۔ دہلی کے آس پاس کے بزرگوں میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، حضرت محمد غوث گوالیری اور عبدالقدوس گنگوہی کے ملفوظات ملتے ہیں قطبن جو علاؤ الدین حسین شاہ والی بنگال کے عہد میں گذرا ہے ایک مثنوی "مرگا وتی" کا مصنف ہے لیکن ابتدائی دور کے اکثر اردو کارناموں کی طرح یہ مثنوی بھی ہندی زبان پر لکھی گئی ہے۔ کچھ شعر حسب ذیل ہیں جو شاہ حسین کی تعریف میں لکھے گئے ہیں۔

شاہ حسین آہے بڑا راجا　　　چھتر سد لگا سن ان کو ساجا

تحفت

پنڈت اور بودھ دنت سیانا　　　پڑھے پران ارتھو سب بانا

عقلمند　　　پڑھے　　　معنی

دان دے اوگنت نہ آوے　　　بلی او کرن نہ سر پد پاوے

دہ

نشو و نما

بہمنی سلطنت کا خاتمہ سنہ ۱۵۲۶ء میں ہو گیا اور اس سلطنت نے پانچ علاقے مستقل اور خود مختار سلطنتوں کی شکل میں نمودار ہوئے۔ اُن میں سب سے پہلے بیدر کی برید شاہی سلطنت قابلِ ذکر ہے، جو دراصل بہمنی تہذیب اور شائستگی کے علاوہ اُن کے عہد کی ادبی روایات کی بھی وارث تھی۔ بہمنی سلطنت کو اس کے انجام تک پہنچانے میں امیر برید کا بڑا ہاتھ تھا۔ بریدیوں نے بیدر میں تقریباً سو برس تک حکومت کی۔ آخر کار سنہ ۱۶۱۹ء میں بیجاپور کے عادل شاہی خاندان کا بیدر پر قبضہ ہو گیا۔ بیدر میں بہمنی عہد کے علماء اور فضلا جو باقی رہ گئے تھے، انہوں نے وہاں کی ذہنی اور اخلاقی بلندی کی جدوجہد جاری رکھی۔ بیدر میں اردو شاعری کا بھی چرچا رہا۔ چنانچہ فیروز نامی ایک شاعر نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی منقبت میں ایک

مختصر مثنوی لکھی تھی۔ جس کا نام "پرت نامہ محی الدین" ہے۔

برار کی سلطنت کی بنیاد فتح اللہ عماد شاہ نے رکھی تھی۔ اور اس نے سب سے پہلے خود مختاری کا اعلان کیا تھا۔

بہمنی سلطنت کے ملبے سے تیسری سلطنت کی عمارت جو بنی وہ احمدنگر کی نظام شاہی سلطنت تھی، جس کا بانی نظام الملک بحری کا بیٹا ملک احمد تھا۔ یہ خاندان پاتھری کے ایک ہندو مالی عہدہ دار کے سلسلے سے پیدا تھا۔ محمود گاواں کے قتل کی سازش میں نظام الملک بحری کا بھی بڑا ہاتھ رہا۔ ملک احمد نے دولت آباد پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ ملک احمد کے بعد اس کے تین جانشینوں، برہان نظام شاہ، حسین نظام اور مرتضیٰ نظام شاہ نے سلطنت کو وسعت دینے کی کوشش کی۔ حسین نظام شاہ نے دکن کے دوسرے مسلمان حکمرانوں کے ساتھ مل کر، دجیانگر سے مقابلہ بھی کیا تھا۔ اس جنگ میں مسلم حکومتوں کی فتح ہوئی تھی۔ اس جنگ کا حال احمدنگر کے ایک اردو شاعر حسن شوقی نے "جنگ نامہ نظام شاہ" کے نام سے نظم کیا ہے۔ نظام شاہی سلطنت کے آخری ایام میں اندرونی سازشوں اور مغلیہ فوج کے حملوں کی وجہ سے بڑی ابتری پیدا ہو گئی تھی۔ مغلوں کے مقابلے میں چاند بی بی کے کارنامے بہت نمایاں رہے۔ اس نے دہلی کے شہزادہ مراد کی مغل فوجوں سے مقابلہ کر کے ان کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ ملک عنبر سلطنت احمدنگر کا بڑا نمایاں شخص گذرا ہے، جس نے ملک کے نظم و نسق کو سدھارنے میں سعی بلیغ کی تھی۔ اس سلطنت کا خاتمہ

سنہ ۱۶۰۰ء میں ہو گیا۔

چوتھی سلطنت بیجاپور کی تھی۔ جس کا بانی یوسف عادل خاں ترک تھا۔ اس نے یوسف عادل شاہ کا لقب اختیار کر کے بیجاپور میں خود مختار حکومت کی بنا ڈالی تھی۔ یوسف کے خاندان کے بارے میں کئی روایتیں مشہور ہیں بیدر آنے کے بعد وہ سلطان محمد کے "چیلوں" میں شامل کر دیا گیا تھا۔ بہمنی بادشاہوں کی خدمت کے لئے جو قابل نوجوان منتخب کئے جاتے تھے۔ انہیں "چیلے" کہتے تھے۔ یوسف اپنی قابلیت اور ذہانت سے ترقی کرتا کرتا بہمنی سلطنت کے آخری دور میں بہت اہم سپہ سالار بن گیا تھا۔ وہ جتنا اچھا سپاہی تھا، اتنا ہی اچھا مدبر اور ماہر نظم و نسق بھی ثابت ہوا۔ اس نے رعایا کی خوش حالی کے بہت سے کام کئے۔ یوسف عادل کے خاندان نے بیجاپور پر تقریباً دو سو برس حکومت کی۔ اس خاندان کے نو بادشاہ ہوئے یوسف کو علم و فضل سے بھی اچھا لگاؤ تھا۔ وہ فارسی میں شعر بھی کہتا تھا۔ اور اس نے علماء کی سرپرستی بھی کی۔ عادل شاہی سلطنت کے قوم سے پہلے ہی عرب، عراق، اور ایران کے بہادر اکناف سندھ سے بھی بہت سے عالم، فاضل اور صوفی، بیجاپور آ گئے تھے۔ ان میں سے حضرت حاجی رومی، شیخ نصیر الدین نصر اللہ دلی، پیر جمنا، حضرت پیر مقصود وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یوسف عادل شاہ نے اپنی راجدھانی میں اینٹ اور چونے کی کئی عمدہ عمارتیں بنا کر اس کی زینت بڑھائی لیکن اس نے ملک کی ذہنی اور اخلاقی حالت

کی تعمیر کا اہتمام اس سے بھی بڑھ کیا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی عمارتوں میں کئی قلعوں کے علاوہ فرخ محل اور آنند محل قابل ذکر ہیں۔ بیجاپور کی راجدھانی کی بنیاد رکھنے والے زیادہ ترک تھے۔ لیکن ہندوستان کی روایات نے انھیں کس حد تک جذب کر لیا تھا، اس کا اندازہ ان کے اطراف واکناف کی ہندوستانیت سے ہوتا ہے۔ یوسف کو ہندوستان آئے بہت زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، لیکن اس کی زندگی میں ہندوستانیت ایسی سرایت کر گئی تھی کہ اس کے محلوں کے نام ہندوستانی ہوتے تھے۔ جیسے اس زمانے کے مورخ ناوزہ دکھنی یعنی دکھنی زبان سے موسوم کرتے ہیں۔ یوسف نے اپنے ایک محل کا نام آنند محل رکھا تھا۔ اس کی بیٹی کا نام بی بی ستی تھا۔ جو احمد شاہ بن سلطان محمود کو بیاہی گئی تھی۔ اس کے زمانے میں قابل نوجوانوں کو ملک کی خدمت کے لئے تیار کرنے کی غرض سے پہلے بادشاہ کے خدمت گاروں میں شامل کر دیا جاتا تھا، جو شاہی چیلے کہلاتے تھے۔

ہندوستانیت بلکہ اُردو کی تہذیبی روایات، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہمنوں کے دور ہی میں شروع ہو چکی تھیں، لیکن عادل شاہی عہد نے نہ صرف انہیں جاری رکھا، بلکہ اُن کو بہت کچھ فروغ دیا۔

یوسف کے بعد جب اسمٰعیل تخت پر بیٹھا تو اس زمانے کی رسم کے مطابق بیدر، احمد نگر، برار اور گولکنڈہ کے حکمرانوں نے اس کو مبارک باد کے پیامات بھیجے، یہ بھی ایک عمدہ تہذیبی رسم تھی۔ جس کی بنیاد اس زمانے کی دکھنی سلطنتوں میں پڑی تھی، لیکن بعد کی نا اتفاقیوں نے صلح و آشتی کے ان

مراسم کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔

اسمٰعیل کے زمانے کا اہم واقعہ صفدر خان کی باغیانہ مساعی تھیں اس نے محل میں عورتوں کے ساتھ اسمٰعیل کو نظربند کر دیا تھا۔ محلات کی وہ تنظیم اس زمانے میں آغاز ہو چکی تھی، جس کا منتہا بعد میں مغلوں اور دوسرے حکمرانوں کی خانگی زندگی میں نظر آتا ہے۔ پردہ کا بھی ان میں رواج تھا جو غدر کی مصیبت اسمٰعیل کی والدہ پونجی خاتون اور اس کی خالہ دلشاد آغا اور اس کے کوکا یا کاکا اسمٰعیل کی تدبیر سے سر سے ٹلی۔ اس زمانے میں پان اور "بیڑہ پان" کا بھی رواج تھا اور بڑے آدمیوں اور بادشاہوں کے ہاتھ سے جیسے "بیرہ پان" عطا ہونا، اس کا بڑا امرتبہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ ایک طرح کا شگون نیک اور اشریا دبھی تھا۔ جنگ کے فوجی طریقوں کے علاوہ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ بادشاہ یا ان کے سربرآوردہ اعیان کی دو بدو لڑائی کے نتیجے سے بھی کبھی کبھی جنگ کا فیصلہ ہو جاتا تھا۔ اسمٰعیل کے خلاف عماد شاہیوں کی ایک جنگ میں عماد شاہ کے برادر نسبتی نے اسمٰعیل کو دعوت مبازرت دی اور اسمٰعیل نے میدان میں نکل کر اس سے جنگ کی اور فتح پائی تھی۔

سواریوں میں گھوڑے کے علاوہ پالکی کا بھی رواج تھا۔ درخواتین عموماً برقعہ دار پالکی میں سوار ہوتی تھیں۔ اسمٰعیل نے کئی شہر آباد کئے تھے جن کے ناموں سے بھی اردو تہذیب کی شروعات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک شہر اس نے چنداپور کے نام سے آباد کیا تھا اور اپنے عالی شان محل کو اس نے چمپا محل سے موسوم کیا تھا۔

اسمٰعیل کا جانشین ابراہیم اول ہوا۔ یہ بڑا جری اور عالی حوصلہ حکمران تھا۔ آخری زمانے میں اس کی طبیعت میں بڑی شقاوت آگئی تھی تاہم علماء و فضلاء کی قدردانی اس نے بہت کی۔ اور رعایا اور فوج کے ساتھ اس کا حسن سلوک بھی مشہور رہے۔ اس کے عہد میں بیجاپور کچھ نئی عمارتوں سے آراستہ ہوا۔ جن میں سے ایک قصر شاندار دہ ستون کے علاوہ جامع مسجد قابل ذکر ہے۔ ابراہیم صناعوں اور تاجروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک روا رکھتا تھا۔ جس کے باعث اس کے زمانے میں بیجاپور میں اچھے اچھے صناع آگئے تھے اور تاجر ملک ملک کی جنس لے کر آتے جو بیجاپور کے بازاروں میں فروخت ہوتی تھی۔

اس کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ابراہیم نے دفتروں کو فارسی کی بجائے اردو میں منتقل کر دیا۔ حضرت شاہ میراجی شمس العشاق جو اپنے زمانے کے سربرآوردہ بزرگ اور صوفی تھے۔ اس زمانے میں عوام کے ارشاد و ہدایت کے لئے اردو سے بڑا کام لیتے رہے۔ عوام کو دین اور دنیا کے مسائل سمجھانے کے لئے آپ نے کئی رسالے نثر میں اور چھوٹی چھوٹی نظمیں بھی لکھی تھیں، جن میں "خوش نامہ" اور "خوش نغز" مشہور ہیں۔

ابراہیم کا انتقال ۹۶۵ھ میں ہوا۔ اور اس کے بعد اس کا بیٹا علی عادل شاہ اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ ابراہیم خود اپنے دوسرے بیٹے طہماسپ کو اپنے بعد بادشاہ مقرر کرنا چاہتا تھا۔ علی نے اپنی طبیعت کی تیزی سے اسے ناراض کر دیا تھا۔ ابراہیم اس کا خاتمہ ہی کر دینا چاہتا تھا، لیکن بعض بارسوخ

امراء کے بیچ بچاؤ کرنے سے اس نے علی کو نظر بند کر رکھا تھا لیکن امراء میں بہت سے ایسے تھے جو علی کو پسند کرتے تھے۔ اس لئے ابراہیم کے انتقال کے بعد اس کے منشاء کے خلاف علی کو تخت پر بٹھایا گیا۔ احمد نگر کی مشہور شہزادی چاند بی بی کی شادی علی سے ہوئی تھی۔

علی اچھا سپاہی تھا۔ نظم و نسق میں وہ ہوشیار تھا۔ لیکن اس کی سیرت کا سب سے عجیب پہلو یہ ہے کہ وہ بڑا مستغنی مزاج اور درویش یا قلندر صفت انسان تھا۔ اپنے آپ کو وہ علی شیر کہا کرتا تھا۔ اس کی طبیعت عام بادشاہوں ایک عام آدمیوں سے الگ تھی۔ خانگی زندگی میں وہ بہت ہی سادہ سیدھا انسان تھا۔ اور کبھی کبھی اپنے ملازمین کے ساتھ بیٹھ کر انہیں کھانا کھلانے سے بھی اسے عار نہیں ہوتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ رزاق حقیقی جو چیز کھانے کو عطا کرے اسے شکر کے ساتھ کھانا چاہیئے ورنہ کفران نعمت ہوتا ہے۔ رفیع الدین شیرازی نے اس کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو اچھی طرح نمایاں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک دفعہ کچھ ککڑیاں آئیں۔ رفیع الدین نے ان کو صاف کر کے ہر ایک کے چار ٹکڑے کئے۔ اور بادشاہ کے سامنے رکھا۔ بادشاہ نے انہیں بڑی رغبت سے کھایا۔ آخر میں ایک ٹکڑا شیرازی کو بھی کھانے کے لئے دیا۔ وہ کہتا ہے کہ جوں ہی میں نے اسے منہ میں رکھا، اس کے کڑوے پن کی وجہ سے میرے دماغ سے لے کر جگر تک کڑوا ہو گیا۔ لیکن بادشاہ نے نہ تیور سے اور نہ زبان سے کسی طرح کی بدمزگی کا اظہار کیا۔ علی کی سیرت کا ایک اور پہلو بھی بروئے کار آتا ہے۔ وہ اپنے پڑوسی ہندو ساجا وجیا نگر سے

دوستی اور محبت کے تعلقات قائم رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے رام راج سے منہ بولے رشتے جوڑ لئے تھے اور اس کی رانی کو وہ ماں پکارتا تھا۔ رام راج کے بیچے کے انتقال پر وہ وجیا نگر گیا تھا جہاں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی تھی۔

علی، علماء اور فضلا کی امداد میں بہت فراخ دل تھا۔ اس کے دور حکومت میں فارس، عراق، عرب، آذر بائیجان اور کئی ملکوں سے علما اور فضلا آکر بیجاپور میں رہ گئے تھے۔ پایۂ تخت میں ان کی موجودگی کی وجہ سے عوام اور خواص کی ذہنی سطح بلند ہوگئی تھی۔ ان علماء میں سے اکثر درس و تدریس میں مصروف رہا کرتے تھے، تبلیغ اور ارشاد و ہدایت کے کام بھی برابر جاری تھے۔ علی کے زمانے کے سب سے سربرآوردہ بزرگ، شاہ برہان الدین جانم تھے جو زبانی ارشاد و ہدایت پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے والد حضرت شاہ میراجی شمس العشاق کی طرح اردو میں انہوں نے بھی چند رسالے نظم و نثر لکھے۔ ان کی ایک نظم "ارشاد نامہ" کافی طویل ہے۔ جس میں مریدوں اور معتقدین کی رہبری صراط مستقیم کی طرف کی گئی ہے ایک اور متصوفانہ نظم "سکھ سہیلا" بھی انہوں نے لکھی تھی۔ ان کے نثری رسالوں میں "وصیت الہادی" اہم ہے۔

ابھی تک اردو کے لکھنے والوں کا مقصد افادی تھا۔ اور وہ ضرورت جس کے لئے انہوں نے اردو سے کام لینا شروع کیا تھا۔ ابھی باقی تھی۔ اسی لئے اس وقت تک بھی اردو تصنیف و تالیف کا بڑا محرک مذہب تھا۔

علی عادل شاہ کو ذاتی طور پر بھی علم وفن سے دل چسپی تھی۔ اس کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ اور اس نے بڑا کتب خانہ جمع کیا تھا۔ جب وہ سفر کو جاتا تو کتابوں سے بھرا ہوا صندوق بھی اس کے ہمراہ ہوتا تھا۔

علی نے کئی باغ بنوائے تھے جن میں سے ایک خاص باغ پر کوٹھے بیا دو دو نہروں کے درمیان بنایا گیا تھا۔ اس باغ میں ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی تھی جس کا نام اس نے علی ابن اسد اللہ الغالب کے نام پر مسجد غالب رکھا تھا۔ اس مسجد کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ایک ہزار تینتیس چراغ دان تھے، اور یہ تعداد "غالب" کے اعداد سے مطابقت کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ اس نے کئی قلعے بھی بنوائے تھے۔ اور محلات میں دو نئے محلوں کا اضافہ کیا تھا جن میں سے ایک گگن محل تھا اور دوسرا ہریا محل۔ بیجاپور کے شہر کے اطراف فصیل بھی اس نے تعمیر کرائی تھی۔

بیجاپور کی ترقی کا سنگ بنیاد حقیقت میں علی نے رکھا تھا، لیکن اس کی ترقی اس کے جانشین ابراہیم کے عہد میں نمایاں ہوئی۔ علی کے زمانے تک ملک کی ذہنی اور علمی ترقیاں جو کچھ ہوئی تھیں انہیں سے ابراہیم کے عہد میں نشو و نما کا پس منظر پیدا ہوا۔ اس پس منظر میں ابراہیم نے اپنے آپ کو اور اپنے نظم و نسق کو ہندیانے کی جو سعی بلیغ کی اس کی وجہ سے بیجاپور کا نام علمی دنیا میں اور اردو کی ادبی دنیا میں زندہ جاوید ہو گیا ہے۔ ابراہیم کا انجام جیسا شاندار ہوا، ویسا اس کا آغاز نہیں تھا۔ ابتدا میں ابراہیم کو اپنے اعیانِ سلطنت کی سازشوں کا شکار ہونا پڑا۔ اور ایک آدھ موقع پر تو ایسا شبہ

ہو رہا تھا کہ آیا وہ تخت سلطنت پر قائم بھی رہ سکے گا یا نہیں لیکن اس کی قسمت اچھی تھی، بالآخر وہ سازشوں سے بچ کر نکلا اور سلطنت کے کاروبار خود اس نے سنبھال لئے۔ اور اس زمانے کے معیاروں کے لحاظ سے ایک کامیاب بادشاہ بھی ثابت ہوا۔

ابراہیم کی دو دلچسپیاں تھیں، ایک موسیقی، اور دوسری شاعری۔ موسیقی میں وہ اپنے عہد کا سربلند ماہر مانا جاتا تھا، جس کی وجہ سے وہ "جگت گرو" کے لقب سے ملقب ہوا۔ ابراہیم کی چار بیویاں تھیں۔ جن میں سے ایک بیوی سندر محل بھی تھی۔ ابراہیم کی موسیقی اور ہندوستانیت سے دلچسپی میں اس کے اثر کو بھی یقیناً دخل تھا۔ اردو شاعری میں ابراہیم نے "نورس" جیسا شائستہ کارنامہ چھوڑا، لیکن اس کے شاعرانہ ذہن کی تخلیق ایک "نورس" ہی نہیں ہے بلکہ وہ عالی شان اور خوبصورت عمارتیں بھی ہیں، جو اس نے بنوائی تھیں۔ یہ عمارتیں بھی حسین نظموں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اس کے تعمیر کردہ محلات میں ہفت کہن۔ دلکشا محل، انند محل، محل نورس اور دوسری عمارتوں میں برج حیدری جو عوام میں اوپر برج کے نام سے مشہور رہے، اور مسجد ملکہ جہاں تعمیر کاری کے عمدہ نمونے ہیں۔

ابراہیم نے ایک شہر بیجاپور سے ایک فرسخ کے فاصلے پر آباد کیا تھا جس کا نام اس نے "نورس پور" رکھا تھا۔ کہتے ہیں اس مقام پر جہاں شہر کی بنیاد رکھی گئی، ایک دفعہ ایک اہل قریہ نے اسے شراب کی ایک بوتل دی تھی جس میں غیر معمولی کیف تھا۔ ابراہیم کی حسن پسند طبیعت کو مقام بے ادا پسند آ گئی۔

ابراہیم نے عیدِ نورس بھی اختراع کی تھی۔ جو ایک قومی تہوار کے طور پر منائی جاتی تھی۔ نورس محل میں ملک بھر کے سنگیت داں اکٹھے ہوتے تھے۔ اور داد سرود موسیقی دیتے۔ اس موقع پر بڑی شان کی ضیافت ترتیب دی جاتی اور متوسلین کو انعام اور خلعتیں عطا کی جاتی تھیں۔

ابراہیم کے زمانے میں علم وفن کی ترقی اور عوام کی ذہنی رفعت کے جو سامان مہیا ہو گئے تھے۔ اس کا اندازہ علمار کی اس کثیر تعداد سے ہو سکتا ہے، جو اس زمانے میں بیجاپور میں جمع ہو گئے تھے۔ مشہور مورخ ابوالقاسم فرشتہ، اور فارسی شاعر اور صاحب طرز انشار پرداز، ملا ظہوری کے علاوہ حکیم آتشی، ملک قمی، عبدالرشید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے عہد کے اردو شاعروں میں عبدل اور مقیمی مشہور ہیں۔ عبدل نے ایک طویل مثنوی "ابراہیم نامہ"، لکھی تھی جس میں اس نے بادشاہ کی مصروفیتوں اور شہر بیجاپور اور اس کی شان وشوکت کا حال نظم کیا ہے۔

بیجاپور میں اردو کی ترقی اس وقت تک مذہب کے زیرسایہ ہوتی رہی تھی چنانچہ اس سے پہلے کے سارے کارنامے مذہبی نوعیت رکھتے ہیں۔ اس کا سبب صوفیائے کرام کی وہ کثیر تعداد ہے، جو بیجاپور میں مقیم تھی۔ ان میں سے اکثروں نے ارشاد وہدایت کے لئے اردو کو ذریعہ بنایا تھا۔ اس لحاظ سے "نورس"، اور "ابراہیم نامہ"، اردو کے وہ مستقل اولین کارنامے ہیں، جو ادبی اہمیت رکھتے ہیں۔ عبدل کا "ابراہیم نامہ"، بہت دلچسپ ہے اس نے ابراہیم کے بنائے ہوئے "نورس محل"، کی تعریف بھی لکھی تھی جس کے

چند شعر حسب ذیل ہیں۔

سنو اب صفت شاہ محل اپنی سٹھا دن
دھریا ناؤں نورس محل تس جو ناؤں
دسے محل نورس دھریا ناؤں یوں
پھر یار نگ نورس نت انفرو پ جیوں
گگن سات سے ڈیتی ہو رمل جوڑ کر
فلک محل نورس کی ایک کمن اوپر

اسی زمانے کا ایک اور شاعر مقیمی بھی تھا جس نے ایک طویل مثنوی "چندر بدن ومہیار" لکھی تھی۔ یہ نیم مذہبی نیم افسانوی کارنامہ دراصل ایک طرف تو بیجاپور کے ماضی کی روایات سے اتصال رکھتا ہے تو دوسری طرف نئے ادبی رجحانات کے آغاز کا بھی اس سے پتہ چلتا ہے۔

ابراہیم کی ایک بہن خدیجہ سلطان تھی۔ جو بڑی علم دوست خاتون تھی۔ اور اپنے زمانے کے اکثر علماء اور شعراء کی سرپرستی کرتی تھی۔ اس کی وجہ سے بھی بیجاپور میں علم و ادب کی ترقی کو ایک زبردست محرک نسبب ہو گیا تھا۔

ابراہیم کا انتقال ۱۰۳۷ھ میں ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد عادل شاہ تخت پر بیٹھا۔ محمد شاہ کی حکومت کے زمانے میں اس میں شک نہیں کہ ملک کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ اور اسے کچھ فتوحات بھی حاصل ہوئیں۔ اس کے علاوہ علم و فن اور تہذیب و شائستگی کے کاموں میں بھی نمایاں ترقی ہوئی۔ خاص طور پر اردو ادب اور شاعری کا

جہاں تک تعلق ہے، محمد کے عہد میں زبان اور ادب میں ہر لحاظ سے اگلے دور کے مقابلے میں زیادہ نکھار پیدا ہوا۔ تاہم دہلی کی حکومت کا دباؤ بیجاپور پر محمد کے زمانے میں بڑھ گیا تھا۔ بیجاپور کی جانب سے سلاطین دہلی کی خدمت میں پیش کش کے نام سے سالانہ بھاری رقم بھیجی تھی۔ آخر شاہجہاں کے زمانے میں محمد نے پیش کش بند کردی تھی۔ اس پر شاہجہاں نے بڑا تہدید آمیز خط لکھا۔ بالآخر محمد نے پیش کش روانہ کرنے پر آمادگی ظاہر کی، اور معاملہ خیر خوبی سے ختم ہوگیا۔ محمد دکن کے حکمرانوں میں تنہا حکمران تھا۔ جسے شاہجہان کے دربار سے شاہی کا خطاب عطا ہوا تھا۔ محمد نے عرب اور عجم کے حکمرانوں سے اچھے سفارتی تعلقات بھی قائم کئے تھے۔

محمد کے زمانے میں دہلی سے ایک قاصد فرمان عتاب لے کر آیا تھا۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ محمد سے پہلے کے سلاطین نے عدالت گاہ قلعہ ارک کے اندر رکھی تھی۔ محمد نے داد محل کے نام سے ایک محل قلعہ کے باہر بنوا کر، عدالت گاہ اس میں منتقل کر دی تھی۔ اس عتاب نامہ کا جواب محمد نے ترکی بہ ترکی دے کر قاصد کو روانہ کر دیا تھا۔ رات کو بادشاہ عدالت محل کی کھلی چاندنی پر بیٹھا ہوا تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور چاندنی رات کی مناسبت سے فرش سفید بچھایا گیا تھا۔ خود بادشاہ اور مقربین سب کے سب سفید لباس ملبوس تھے۔ منظر بڑا پرلطف تھا۔ چاندنی راتوں میں محمد عموماً ایسے جلسے کیا کرتا تھا۔ عدالت محل کے سقف سے اس نے شہر بیجاپور کی عمارتوں پر نظر دوڑائی۔ اور اُن سے بلند ہونے والی رقص و سرود کی

آوازیں سنی۔ اس منظر سے اس پر ایک وجد کا عالم طاری ہوگیا۔ اس نے اپنے مقرب خاص افضل خاں سے پوچھا۔

"افضل خاں جی! شہر کیا کہہ رہا ہے؟"

افضل خاں نے آداب بجا لاکر عرض کیا۔

"شہر بادشاہ کی عمر و اقبال کو دعا دے رہا ہے۔ اور حضور کی شفقت اور رعایا پروری کی ثنا کر رہا ہے۔"

بادشاہ نے پھر فرمایا۔

"اگر بادشاہ ہند سے ہماری لڑائی ٹھن جائے تو؟"

"تو ---" افضل خاں نے جواب دیا" یہ رقص و سرور کی صدائیں نالۂ فریاد میں تبدیل ہو جائیں گی۔ اور اُن کی جگہ چوڑیوں کے ٹوٹنے کے نغمے اور نوحہ و ماتم کی صدائیں بلند ہونے لگیں گی۔"

یہ جواب سُن کر بادشاہ کے دل پر بہت اثر ہوا اور اس نے قاصد کو جو تین منزل مسافت طے کر چکا تھا، واپس بلوایا اور اگلے خط کو واپس لے کر ایک دوستانہ رقعہ لکھوایا اور دہلی روانہ کیا۔

ایک اور موقع پر جب محمد عادل شاہ محل کے اوپر کی چاندنی سے شہر کی عالی شان عمارتوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اُسے سارے شہر کے مکانات سے باورچی خانوں کا دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔ مگر شہر کے ایک حصے میں اُسے دھواں اُٹھتا نظر نہیں آیا۔ علی نے مقربین سے اس کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہاں برہمن بستے ہیں۔ اور وہ صرف ایک وقت کا کھانا کھاتے ہیں۔

بادشاہ کو بڑا ترس آیا اور حکومت کی جانب سے ان کے لئے دو وقت کے کھانے کا انتظام کر دیا۔ حالانکہ ان برہمنوں کی عادت ہی ایک وقت کھانے کی تھی۔

محمد کے زمانے اردو شعرا میں کمال خاں رستمی اور صنعتی قابل ذکر ہیں۔ رستمی ایک طویل رزمیہ نظم "خاورنامہ" کا مصنف ہے، یہ ابن ہشام کے فارسی "خاورنامہ" کا ترجمہ ہے۔ محمد کے زمانے میں جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے بیجاپور پر کئی طرف سے دباؤ پڑ رہا تھا۔ جن میں سب سے زیادہ، دہلی کی حکومت کی مداخلت کا اندیشہ تھا۔ اس کے پڑوس میں بھی نت نئے جھگڑے برپا ہو رہے تھے۔ ایسے زمانے میں پادشاہ اور اہل حکومت کو چوکس رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور مہم پسندی کے خیالات اور جنگ و جدل کے رجحانات کو متحرک رکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے محمد کے عہد میں اور اس کے بعد اس کے جانشین علی ثانی کے عہد میں ایسی رزمیہ نظمیں لکھی گئیں۔ صنعتی کی مثنوی "قصہ بے نظیر" یا "قصہ تمیم انصاری" کی مہماتی داستان بھی جنگ و جدل کے مرقعوں سے بالکلیہ خالی نہیں ہے۔ اس میں حضرت تمیم انصاری کی بارہ مہمات نظم کی گئی ہیں۔

ملک خوشنود گولکنڈہ کا ایک غلام تھا۔ شہزادی خدیجہ سلطان کی شادی جب محمد سے ہوئی، اُسے شہزادی کے ساتھ بیجاپور روانہ کیا گیا تھا ملک خوشنود کو علم و ادب سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس لئے اس نے نمایاں ترقی کی اور بیجاپور کے ذی اثر لوگوں میں اس کا شمار ہونے لگا تھا۔ شعر و شاعری

سے دلچسپی کی بنا پر اس نے امیر خسرو کی مثنوی "ہشت بہشت" کا اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کی ایک اور مثنوی "یوسف زلیخا" ہے۔

عادل شاہی خاندان کا آٹھواں حکمران علی عادل شاہ ثانی ۱۰۶۷ھ میں اپنے آبائی تخت پر بیٹھا۔ وہ گولکنڈہ کی شہزادی، خدیجہ سلطان کے بطن سے تھا۔ خدیجہ سلطان کو علم و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس علم دوست خاتون کی تربیت میں علی کو بچپن ہی سے شعر و سخن سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا تخت پہ بیٹھنے کے بعد اسے آرام اور چین کا زمانہ زیادہ نصیب نہ ہو سکا کیونکہ دہلی کی مغلیہ حکومت کا دباؤ اس کے زمانے میں اور بھی بڑھ گیا۔ چنانچہ اس کی تخت نشینی کے سال ہی مغلوں نے بیدر اور کلیان کو بیجاپور سے چھین لیا۔ دوسری طرف مرہٹہ طاقت سیواجی کی قیادت میں ابھر رہی تھی سیواجی سے بھی اس کے مقابلے رہے جن کی تفصیلات اس کے دربار کے ملک الشعراء نصرتی نے اپنی بے مثل رزمیہ مثنوی "علی نامہ" میں قلمبند کر دیئے ہیں۔ خود اس کے اعیان دولت، جیسے صلابت خاں، سیدی یاقوت وغیرہ نے علم بغاوت بلند کیا۔ راجہ جے سنگھ سے بھی اس کے معرکے رہے۔ ان رزمیہ معرکوں و فتنوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی علی نے تعمیری کاموں کو ترقی دینے اور علم و ادب اور شعر و سخن کی خدمت کے لئے بھی موقعے نکال لئے تھے۔ اس نے اپنی بادشاہی کے زمانے میں کئی مسجدیں بنوائیں قلعے تعمیر کرائے علی نے کئی محل تعمیر کرائے تھے۔ ان محلوں میں سے ایک حسینی محل بہت مشہور ہے۔ دوسرا نرش محل تیسرا بادشاہ محل اور چوتھا علی داد محل تھا۔ اسے بڑا انس تھا

چنانچہ خود اس نے اس محل کی اس کے حوض اور فوارے کی تعریف میں
ایک نفیس قصیدہ اردو میں لکھا ہے۔ جس کے کچھ شعر یہ ہیں۔

دیسے جگ نین میں اس حوض یہ چند نا یو نچھل
تجھ
دھر یا ہے چاند چاند نین جیون تیکہ اپس مکھ کے اگل
نے اپنے آگے

صفائی دیکھ کہ اس حوض کی چندر دائم
چلے آکاش پہ ات شوق سوں امرت نے اوبل
بے حد سے

پریاں اپرج ہو کہیاں دیکھ کہ اس حوض کے تیئں
کہا
اچھے امرت بھر یا ہے حوض یو سمدر لے ڈگل
ہے یہ سمندر

فوارے کل سوں اچھل بوند سہانے ہیں جتنے
دسے ساریاں کی نظر میں ڈھلے موتی تے نچھلی
نظر آئیں صاف

اس فوارے کا نظارہ علی کو بہت بھاتا تھا۔ ایک روز جب وہ اس
نظارہ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے اڑتا ہوا فوارہ موتی کا ایک درخت سا
نظر آیا۔ جس سے گرتے ہوئے قطرے نثار ہوتے ہوئے موتی کی

طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر علی کی زبان پر بے ساختہ یہ مصرعہ آیا۔

" اڑتا سو یو فوارہ پانی یہ کیا نچھل ہے "

سب اعیان دولت حاضر تھے اور دربار کا ملک الشعراء نصرتی بھی حاضر تھا۔ اور اس منظر سے وہ بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پادشاہ کی زبان سے زبان سے جوں ہی یہ مصرعہ نکلا اس نے دوسرا مصرعہ کہہ کر بیت مکمل کر دی نصرتی کا مصرعہ یہ تھا ؎

نجھ شاہ پہ اڑانے کا یو مور چھل ہے

بادشاہ اور حاضرین دربار اس برجستہ مصرعہ پر پھڑک اٹھے اور نصرتی کو خوب داد ملی۔

علی اردو کا اچھا شاعر تھا۔ اور شاہی تخلص کرتا تھا۔ اس نے ایک مختصر سا کلیات چھوڑا ہے۔ جس میں قصیدے، مثنوی، قطعے، جھولنے اور دوہرے شامل ہیں۔ فارسی کے مقابلے میں علی کو اردو یا دکھنی سے زیادہ رغبت تھی اس لئے اس کے دربار میں اکثر اردو گو شعراء کو نمایاں مقام حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ نصرتی کو اس کے دربار میں ملک الشعراء کا رتبہ عطا ہوا تھا۔ نصرتی بڑا قادر الکلام شاعر تھا۔ اور قصیدہ، مثنوی، غزل ہر صنف پر اس کو استادانہ تصرف حاصل تھا۔ اس نے ایک عشقیہ مثنوی "گلشنِ عشق" کے نام سے لکھی تھی جس میں کنور منوہر اور مدمالتی کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔ اس کا دوسرا کارنامہ "علی نامہ" ہے جس میں اس نے علی اور سیواجی کے جنگوں کے حالات

حالات لکھے ہیں۔ اردو میں یہ سب سے بلند پایہ زرمیہ نظم ہے۔

حضرت شاہ میرانجی کے پوتے، شاہ امین الدین اعلیٰ کے علی کے زمانے کے سر برآوردہ روحانی پیشوا تھے، جنہوں نے اپنے دادا اور شاہ برہان الدین کے طریقہ ارشاد وہدایت کو جاری رکھا۔ اور اس مقصد کے لئے اردو ہی سے کام لیا چنانچہ آپ نے نظم اور نثر دونوں میں کئی رسالے چھوڑے ہیں آپ کی نظمیں "رموز السالکین"، "محبت نامہ" اور "نظم وجود" سلوک اور تصوف کے نکات پر مشتمل ہیں۔ آپ نے کچھ قصیدے بھی لکھے تھے جو اپنے والد شاہ برہان الدین کی مدح میں ہیں۔ نثر میں "گنج مخفی" اور "گفتار شاہ امین" آپ کے ملفوظات پر مشتمل ہیں۔ جن کا مقصد عوام کو ہدایت کرنا اور ان کو روحانی اور اخلاقی معانی کا راستہ دکھاتا ہے۔

علی کے زمانے کے ایک اور بزرگ شاہ ملک تھے۔ شاہ ملک نے بھی "شریعت نامہ" اور "احکام الصلوٰۃ" لکھ کر، مذہب اسلام کے شرعی احکام عبادت، اور ان کے مسفرات کو سمجھانے کی کوشش کی۔

علی کے زمانہ میں اُردو مرثیہ کو بھی بڑی ترقی ہوئی۔ خود علی نے کئی عمدہ مرثیے لکھے تھے۔ مرثیہ نگاری میں علی کے زمانے کے شعراء مرزا بڑے استاد مانے جاتے تھے۔ مرزا کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے اپنی زبان اور قلم کو حمد، نعت، منقبت اور امام حسین کے مراثی کے لئے وقف کردیا تھا کہتے ہیں کہ علی عادل شاہ نے ایک دفعہ مرزا سے اپنی مدح میں کچھ لکھنے کی فرمائش کی اس پر مرزا نے معذرت چاہی اور کہا کہ میری زبان جو حمد، نعت اور منقبت کے لئے

وقف ہو چکی ہے اب میرا یہ حکم مبہا نہیں رہی۔ پادشاہ نے جب مکرر اصرار کیا تو ایک دو مرثیے سلطان کے لئے کہے اور اس کا تخلص داخل کرکے گذران دیا۔ لوگ مرزا کا بڑا احترام کرتے تھے۔ وہ ایام ماتم ہی اسی وقت مرثیہ کہتا۔ اور طرح اور لحن کے ساتھ ساتھ مقرر کرکے پڑھتا تھا۔ اس کی ایک مجلس کے بارے میں لکھا ہے کہ خاص وعام کا بڑا ہجوم تھا۔ اور مرثیہ کے اثر سے غم والم کا دریا امڈ رہا تھا۔ جب وہ اس مصرعے پر پہنچا۔

دلاں سہاکاں اناراں کر رکھو سینہ طبق میانے

تو یکایک اس کی طبیعت بند ہوگئی۔ دوسرا مصرعہ سجھائی نہیں دیتا تھا جس سے مرزا کو بڑی کوفت اور ندامت ہو رہی تھی کہ معاً حضرت رسالت مآب تشریف لائے اور فرمایا کہہ دے۔

"نبی آویں گے محشر کو یہ تحفہ کر لیجانا ہے"

اب مرزا کی طبیعت کو افاقہ ہوا اور اس نے مصرعہ پڑھا اور مرثیہ کو تکمیل تک پہنچایا۔ مرزا کو شب عاشورہ میں اس کے کسی دشمن نے قتل کر دیا۔ اس زمانے میں ایام عزا۔ دستور تھا کہ جو علم استاد کئے جاتے تھے انہیں دسویں محرم کو پانی کے چشمے کے کنارے لے جاتے تھے۔ مرزا کے انتقال کے روز علی نے حکم دیا تھا کہ شہر کے سارے علم اور تعزیئے، ابراہیم پور کے اس دروازے کے پاس لے جائیں جو فتح دروازہ کے نام سے موسوم تھا۔ اس حکم کی متابعت میں سارے شہر کے علم اور تعزیئے، فتح دروازے سے گذرے۔ جن کے پیچھے مرزا کا جنازہ تھا۔ جنازہ کے ساتھ اس کے شاگرد مرثیہ پڑھتے جا رہے تھے۔

علی کا انتقال فالج سے ۱۰۸۳ھ میں ہو گیا۔ اور اس کا بیٹا سکندر تخت پر بیٹھا۔ یہ کم عمر تھا۔ اس لئے امراء اور اعیان دولت کی اطاعت پر قابو نہ رکھ سکا سکندر کے زمانے میں سیواجی کے حملے بھی اضلاع پر جاری رہے۔ دہلی کی طرف سے بھی عالمگیر بادشاہ کا دباؤ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس بیرونی خطرے کے باوجود اعیان سلطنت آپس میں عناد اور جھگڑوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ عالمگیر نے ۱۰۹۷ھ میں جب بیجاپور پر حملہ کیا، تو مقاومت کی طاقت کسی میں نہیں تھی۔ بیجاپور پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ سکندر نے قلعہ بیجاپور سے نکل کر قلعہ عالمگیر کے حوالے کر دیا۔ عالمگیر نے اس کے گزارے کے لئے ایک لاکھ روپے مقرر کر دیا

سکندر جب تک بادشاہ رہا شاہ شطرنج بنا رہا۔ اُسے کسی بات میں بھی کھل کر حصہ لینے کا موقع نہیں ملا۔ تاہم ابراہیم اور علی ثانی کے زمانے میں علم و فن تہذیب و شائستگی اور شعر و سخن کی ترقی کا جو ڈھرا پڑ چکا تھا۔ وہ قائم رہا۔ اس کے زمانے میں فارسی اور اردو کے کئی ایسے شاعر موجود تھے، جن کے فکر و فن کو علی کے زمانے میں نشو و نما حاصل ہوئی تھی۔ اردو کے شعراء میں شاہ ابوالمعانی ملا عبدالرزاق؟ رفعت، عبدالقادر، عبداللطیف اور المغنی اس زمانے میں موجود تھے۔ لیکن اُس زمانے کا سب سے بڑا شاعر ہاشمی تھا۔ ہاشمی مادر زاد اندھا تھا۔ اس نے ایک مثنوی یوسف زلیخا کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے کچھ مرثیے بھی لکھے تھے اور غزلیں عورتوں کی شان میں لکھی تھیں

اس لئے ہاشمی کو ریختی، یعنی عورتوں کی زبان میں غزل لکھنے کے طریقے کا موجد سمجھا جاتا ہے ۔اس کی ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں ؎

سچ ماں اے سنگاتی تجھ سے بچھڑ رہی ہوں
ساتھی سے
ان پان سب تیہی ہوں سونا حرام بولو
مجھ تن نگر کوں قالبنی برھے نے آکیا ہے
پھرتی ہوں جوں مسافریں مجھ مقام بولو

گولکنڈہ

بہمنی سلطنت کا وہ حصّہ ہے جو تلنگانے یعنے تلگو بولنے والے علاقوں پر مشتمل تھا ۔گولکنڈہ کہلاتا ہے ۔اس کی راجدھانی گولکنڈہ تھا ۔گولکنڈہ کی ریاست بیجا پور کی معاصر تھی ۔ اور ان دونوں سلطنتوں میں لاگ اور لگاؤ دونوں طرح کے تعلقات رہے ۔کبھی گولکنڈہ کے حکمران ، عادل شاہیوں کے مقابلے میں صف آرار ہے ۔اور کبھی ان میں صلح و آشتی کے تعلقات قائم ہوئے اور شادی بیاہ کے ذریعے سے ان میں یگانگت پیدا ہوئی ۔ ان دونوں طرح کے تعلقات نے گولکنڈہ اور بیجاپور کی تہذیبی اور ادبی روایات کو اَدل بدل ہونے میں معاونت کی ۔

گولکنڈہ کی سلطنت کا بانی سلطان قلی تھا سلطان قلی ہمدان کے حاکم، اویس قلی کا بیٹا تھا ۔وہ محمود شاہ بہمنی کے عہد میں بیدر آیا ۔محمود نے پہلے پہل اُسے اپنے شاہی چیلوں میں شامل کرلیا ۔سلطان قلی پڑھا لکھا اور ہوشیار نوجوان تھا رفتہ

رفتہ اپنی سمجھ بوجھ اور فراست سے اس نے محمود کے دل پر ایسا اثر پیدا کر لیا کہ محمود نے اسے قطب الملک کا خطاب دے کر تلنگانے کے علاقے کا حاکم مقرر کیا۔ ۱۵۱۸ء میں جب محمود شاہ کا انتقال ہو گیا۔ اور لامرکزیت سے فائدہ اٹھا کر الگ الگ صوبے خود مختار ہونے لگے تو سلطان قلی نے بھی سنہ ۱۵۲۰ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنی سلطنت کا صدر مقام گولکنڈہ قرار دیا تھا۔ اس لئے اس سلطنت کا نام ہی گولکنڈہ پڑ گیا۔ گولکنڈہ پر قطب شاہی خاندان کے سات اور اگر جمشید کے لڑکے سبحان قلی کو بھی شامل کر لیا جائے تو آٹھ بادشاہوں نے ایک سو چوراسی برس حکومت کی۔

سلطان قلی نے جس زمانے میں خود مختاری کا اعلان کیا، اطراف میں انتشار تھا۔ تاہم اس نے اپنی عقل و تدبر سے حالات کو قابو میں کیا اور باغیوں کی سرکوبی کی۔ اور جب اس دنیا سے گیا تو بظاہر اپنی اولاد کے لئے ایک وسیع سلطنت چھوڑ کر گیا۔

سلطان قلی کو ذاتی طور پر اپنی سلطنت میں تہذیبی روایات قائم کرنے اور انہیں نشو و نما دینے کا موقع نہیں ملا۔ تاہم بہمنی تہذیب اور شائستگی علم و فن اور شعر و ادب کی جو روایات، گولکنڈہ کے حصے میں آئی تھیں وہ آغاز کے لئے کچھ کم نہیں تھیں۔ چنانچہ اسی سلسلے سے بیجاپور کی طرح گولکنڈہ کی تہذیبی اور ادبی روایات کی بھی تعمیر ہوئی۔ انہیں میں اردو شعر و سخن اور ادب کا ذوق بھی تھا۔

جس علاقے میں سلطان قلی نے اپنی حکومت قائم کی تھی۔ اس سے وہ بادشاہ

ہونے سے چوبیس برس پہلے سے واقف رہا تھا۔ اور بادشاہ ہونے کے بعد بھی اُسے تلنگانہ کے لوگوں میں بڑی ہر دلعزیزی حاصل رہی وہ "بڑے ملک" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اور رعایا اس کے اچھے سلوک کی وجہ سے اس سے محبت کرتی تھی۔

سلطان قلی کو نئی سلطنت کے استحکام میں بہت زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی۔ علاوہ وہ اس حصہ ملک کا حکمراں رہا تھا۔ اس کی خود مختاری کا اعلان گویا اس کی حکمرانی کا تسلسل تھا۔ پھر بھی ابتدائی زمانے میں اپنی حدود کو سلطنت کے متعین کرنے کے لئے اُسے پڑوسی علاقوں کے حکمرانوں اور زمینداروں سے تھوڑی بہت کشمکش کرنی پڑی۔ اس دوران میں بھی، اس نے اپنے علاقے کی ذہنی ا۔ ی ترقی کے وسائل کو ترقی دینے میں غفلت نہیں برتی۔ چنانچہ اس نے آتش خانہ کے نام سے ایک محل بنوایا تھا جہاں ادبی مذاکرات ہوتے تھے۔ اور شعر و سخن کی دلچسپیاں بھی جاری تھیں سلطان قلی خود بھی ان محفلوں میں شرکت کرتا اور ان سے مستفید ہوتا تھا۔ محمود شاہ بہمنی کے دربار میں اُس کی ترقی کا سبب حقیقت میں اس کا علمی اور ادبی ذوق اور فوجی مہارت تھی۔

سلطان قلی اپنے بیٹے جمشید قلی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ سلطان کے چھ بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا حیدر قلی، جسے وہ اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی ہی میں اس جہاں سے رخصت ہوگیا تھا۔ دوسرا بیٹا قطب الدین کاہل اور جہانبانی کے لئے موزوں نہیں تھا۔ سب سے چھوٹا بیٹا ابراہیم بڑا قابل تھا۔ لیکن جمشید کے

تخت پر قبضہ کر لینے کے بعد وہ اپنے مفوضہ علاقے دیورکنڈہ سے ہو آگ کر ملک برید کے پاس پہنچا۔ اور اس کی مدد سے گولکنڈہ پر حملہ آور ہوا لیکن احمدنگر کے حکمراں برہان نظام شاہ کی مداخلت کی وجہ سے ابراہیم کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جمشید نے سات سال بھلی بری طرح حکومت کی اور جتنی جنگیں اس نے لڑیں اُن میں سے نادائن کھیڑ کی لڑائی کے سوا سب میں فتحمند رہا۔ اس میں کئی کمزوریاں تھیں۔ تاہم اس کا کردار بعض انسانی خوبیوں سے سراسر معرا نہیں تھا۔ اسے ادب اور شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ اور شعر بھی کہتا تھا۔ اس نے علما اور شعرا کی سرپرستی بھی کی۔ اس کے دربار کا ملک الشعراء محمد شریف وقوعی تھا۔ جمشید کے مرنے کے بعد، جمشید کی ملکہ بلقیس زماں نے اپنے بیٹے سبحان قلی کو سلطنت کے بیرونی عمائد کی مدد سے تخت پر بٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی یہ کامیابی چند مہینوں سے زیادہ عرصہ نہ رہ سکی۔ گولکنڈہ کے بہت سے ذی اثر اراکین سلطنت نے ابراہیم کو گولکنڈہ آنے کی دعوت دی اور اپنی مدد کا یقین دلایا۔ ابراہیم عوام اور خواص میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ اُس کی مہم پسند طبیعت نے بالآخر خطرہ مول لینا ہی مناسب سمجھا لیکن جب وہ گولکنڈہ کے قریب پہنچا تو اس کا شاہانہ استقبال کیا گیا اور وہ ابوالمظفر ابراہیم شاہ کے لقب سے تخت سلطنت پر بیٹھا۔

ابراہیم کی تخت نشینی کے بعد سے گولکنڈہ کی ذہنی اور ادبی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ جمشید کے زمانے میں اور اس کے بعد سلطنت میں جو افراتفری مچ گئی تھی۔ اُس کو ابراہیم نے اپنی قابلیت سے دور کیا۔ اپنی جلاوطنی کے زمانے میں

وہ وجیانگر بھی گیا تھا۔ اور وہاں کے راجہ سے تعلقات قائم کرلئے تھے وجیانگر مستحکم سلطنت تھی۔ ابراہیم کا وہاں قیام آئین جہانبانی میں اس کی عمدہ تربیت کا بھی باعث ہوا۔ اس کے علاوہ اُسے اس کا بھی اندازہ ہوا کہ انہی دوسری پڑوس سلطنتوں کے مقابلے میں وجیانگر کے نظم ونسق میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ جو لائق تقلید ہیں۔ اس لئے جب اس نے گولکنڈہ کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ تو رعایا کے ساتھ اپنے حسن سلوک اور بہتر انتظام کی وجہ سے وہ سب میں بہت مقبول ہو گیا۔

ابراہیم کے زمانے میں سلطنت میں ایسا امن وامان رہا کہ کہتے ہیں کہ ایک بڑھیا بھی ساری ریاست میں بغیر تعرض کے سونا اچھالتی جا سکتی تھی۔ ابراہیم کے تعمیری کاموں میں کئی بیگ محل، باغات اور تالاب قابل ذکر ہیں۔ اس نے قلعہ گولکنڈہ کو بھی از سر نو مستحکم کیا تھا۔ چنانچہ پرانا قلعہ اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ قلعہ گولکنڈہ کا بالا حصار جہاں سے اطراف کا سارا پُر فضا منظر دکھائی دیتا ہے۔ اُسی کا تعمیر کردہ ہے۔ قلعہ کے اندر اور باہر اس نے کئی مسجدیں بنوائیں اور ایک حمام تعمیر کروا گلشن باغ اور ابراہیم باغ بھی اُسی کے بنوائے ہوئے ہیں۔ قلعہ سے باہر کٹورہ حوض، ابراہیم پٹنی کا تالاب اور حسین ساگر بھی اس نے بنوائے تھے سلطنت کے امن وامان نے شعر وسخن اور فنون لطیفہ کی دلچسپیوں کو بھی ترقی دی۔ اُس کے زمانے میں گولکنڈہ میں اردو کے کئی اچھے اچھے شاعر جمع ہو گئے۔ لیکن ان میں سے صرف فیروز، سید محمود اور سید احمد کے نام ملتے ہیں۔ فیروز بیدر کا رہنے والا تھا۔ اُس نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی منقبت

میں ایک نظم "پرت نامہ محی الدین" کے نام سے لکھی تھی۔ احمد نے مثنوی لیلیٰ مجنوں لکھی ملّا خیالی اُس زمانے کا بڑا عالم اور شاعر تھا۔

تلگو ادیبوں اور شاعروں کی بھی وہ سرپرستی کیا کرتا تھا اپنی مقبولیت کے سبب سے وہ تلگو بولنے والے عوام میں "ملک بھرام" مشہور تھا۔

تالی کوٹ کی جنگ، ابراہیم کے عہد کا بڑا اہم واقعہ ہے۔ اس جنگ میں احمد نگر، بیدر، بیجاپور اور گولکنڈہ کے حکمرانوں نے متحدہ قوت کے ساتھ وجیانگر کا مقابلہ کیا۔ اور فتح پائی۔ اس جنگ کے بعد دکنی سلطنتوں کو بہت کچھ سیاسی استحکام نصیب ہوا۔ اور وہ تہذیبی مشاغل کو ترقی دینے کی طرف متوجہ ہو سکیں۔

ابراہیم کا انتقال ۱۵۸۰ء میں ہوا۔ اور اس کا بیٹا محمد قلی قطب شاہ تخت پر بیٹھا۔ ابراہیم کے چھ بیٹے عبدالقادر عرف شاہ صاحب اور حسین قلی محمد قلی، ابوالشیخ خدابندہ اور محمد امین تھے۔ محمد قلی تیسرا بیٹا تھا۔ غالباً یہ درباری سازشوں میں سے ایک سازش تھی کہ بڑے لڑکوں کے مقابلے میں محمد قلی کو تخت پر بٹھایا گیا۔ محمد قلی کو ایک مستحکم مملکت جہاں بانی کے لئے مل گئی تھی۔ اس کے علاوہ باپ کے زمانہ میں تہذیبی، علمی اور ادبی امور کی جو شروعات ہوئی تھیں وہ اسے ورثے میں ملی تھیں۔ محمد قلی کے عہد میں کچھ جنگیں بھی ہوئیں۔ لیکن انہیں وہ آسانی سے نپٹا سکا۔ اس طرح اس کے عہد میں امن وامان کا دور دورہ رہا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اس کو تہذیبی امور اور فنون لطیفہ اور ادب وشعر کی دلچسپیوں میں منہمک ہونے کے مواقع میسر

آ سکے ۔

محمد قلی کا کارنامہ سلطنت کے استحکام سے زیادہ اس کی مادی اور ذہنی تعمیر ہے شہر حیدرآباد کا وہ بانی تھا۔ اور شہر کی اس نے سلیقے سے تعمیر کی تھی۔ اس زمانے کے لحاظ سے بڑی بڑی شاہراہیں، ایک خاص منصوبے کے تحت بنائی گئیں۔ اور شہر کو نفیس اور حسین عمارتوں سے سجایا گیا۔ ان عمارتوں میں شاہی عمارتیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ چارمینار، جو حیدرآباد کا امتیازی نشان بن گیا ہے۔ محمد قلی کا تعمیر کرایا ہوا ہے۔ جامع مسجد بھی اس کے عہد کی تعمیر ہے اس کے پہلو میں ایک ترکی حمام بھی تھا۔ جو اب سڑک کے وسیع ہو جانے کی وجہ سے منہدم کر دیا گیا ہے۔ مریضوں کے لئے ایک دارالشفار کی تعمیر عمل میں آئی تھی۔ شہر کے وسط میں چارسو کے حوض اور چارکمان سے بھی شہر کی زینت بڑھ گئی۔ جلوخانہ اور چایدار خانہ کی عمارتوں کے علاوہ دولت خانہ شاہی اور اسی سے متصل شاہی عاشور خانہ بنوایا گیا۔ محلات میں ندی محل اور خداداد محل تعمیر کئے گئے۔ خداداد محل کے سات درجے تھے۔ اور ہر درجہ الگ الگ ناموں سے موسوم تھا۔ پہلا درجہ موسوی محل دوسرا جعفری محل تیسرا حسین محل چوتھا حسن محل اور اوپر کے حیدر محل۔ محمدی محل اور سب سے اوپر کا درجہ الٰہی محل کے نام سے موسوم تھا۔ اس میں ظاہر ہے کہ محمد قلی کے عقیدہ کی پرچھائیں نظر آتی ہیں۔ ایک خاص محل بھی اس مقام پر تھا جہاں اب زچگی خانہ کی عمارت واقع ہے۔ موسیٰ ندی کے کنارے چار محل بنوایا گیا تھا۔ ساری تعمیریں دراصل اس عہد کے ذوق حسن کاری کی مکمل مظہر نہیں۔ بلکہ اس دور کی ادبی اور

علمی چہل پہل اور خاص طور پر اردو شاعری اور ادب کی ترقی سب ملکر ایک
مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ محمد قلی کے عہد میں فارسی کے اچھے اچھے شاعر دار السلطنت
میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ جن میں میر محمد مومن کو وزارت عظمیٰ پر سرفراز کیا گیا تھا۔ اسکے
علاوہ اردو کے کئی نغز گو شاعر بھی اس زمانے میں ابھرے، محمد قلی قطب شاہ
خود بھی اچھا شاعر تھا۔ شاعری اس کے لئے اس کی زندگی سے ہٹی ہوئی
کوئی چیز نہیں تھی۔ بلکہ اپنی شاعری کے زمانہ میں اس نے اپنے آپ کو اپنے
خیالات اور تصورات کو اور اپنی دلچسپیوں کو دیکھنا چاہا ہے۔ اردو غزل
محمد قلی کے یہاں سب سے پہلے اپنے خدوخال کے ساتھ ابھری۔ وہ نظمیں بھی
لکھتا تھا لیکن اس کی نظم اور اس کی غزل میں خط فاصل کھینچنا مشکل ہے
یہ صحیح ہے کہ اس کی زبان قدیم ہے، لیکن جو لوگ زبان کی دقتوں کو عبور کر کے
اس کے کلام کے مفہوم تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ اپنے اطراف رنگا رنگیوں کا
ایک دلکش شہر پاتے ہیں۔ جس میں اس زمانے کی سماجی اور ادبی زندگی کی
نبض حیات متحرک دکھائی دیتی ہے۔ ایک نظم "شب برات" میں وہ لکھتا ہے

سلکھن رات شب برات آبراتیاں لیائی ساریاں کی
لکھیا خوش آنند عشرت سو روزے کھالاں باریاں کی

ہاتھی کی تعریف میں کہتا ہے سہ

آنکس اس سیس پر قدرت نوا چند
کہ سندر پھلنے میں نخمن نت سنبھلتا

نزے چلے کوں ڈونگر تاب کیوں نیا سے
کہ اس گرجن تھے بادل گرج دھرتا

برسات کی تعریف میں یہ چند شعر ہیں۔

عطار باز بن میں پھولاں کے کھول طبلے
مہکار اُچایا ہے پھر من میں دھاؤ سکیاں
جو لال پھول ڈالیاں پر بتوں ڈنڈاں پہ اپنے
بازو بنداں کے سر تھے پھندنے ہلاؤ سکھیاں
آسماں ہور زمین سب یک رنگ ہو رہا تا
ہے آج عیش کا دن ملہار گا و سکھیاں

محمد قلی جتنا بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کے دربار کے متوسل شعراء کو بھی اس پایہ تک اُٹھنا لازمی تھا۔ چنانچہ محمد قلی کے دربار کے شعرا میں وجہی بہت نمایاں ہے۔ وجہی نے ایک مثنوی "قطب مشتری" لکھی تھی۔ محمد قلی بہت عاشق مزاج تھا۔ وجہی نے محمد قلی کی رومانی زندگی کا ایک مرقع اس مثنوی میں کنایہ کے پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ قطب اس داستان کا ہیرو ہے۔ اور بنگالے کی ایک شہزادی مشتری اس کی ہیروئن۔ داستان مہماتی ہے لیکن اس میں اس عہد کی حقیقی زندگی کے عکس نہیں ملتے۔ بیچ میں کہیں کہیں وجہی کی غزلیں آجاتی ہیں جو در اصل رسیلے گیتوں کا لطف رکھتی ہیں۔

وجہی بہت اچھا صاحب طرز انشا پرداز بھی۔ اس کا نثری کارنامہ "سب رس" باوجود زبان کی قدامت کے اپنے تمثیلیہ قصے اور حسن بیان کی

بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ قصہ حسن ودل کی لامتناہی کش مکش کا مثالیہ قصہ کے انداز میں بیان ہے لیکن اس کی بنیاد شاعر نے اسُ ازلی اور ابدی تلاش پر رکھی ہے۔ جس کے لئے دنیا اور اس کے سارے عقلمند سرگرداں ہیں۔ یہ حیات جاوید ہے۔ جس کا ذریعہ آبِ حیات سمجھا گیا ہے اور اس آبِ حیات کو انسان کہاں پا سکتا ہے؟ ۔ وجہی اُسے بلیغ انداز میں کبھی عاشقوں کے آنسو میں تلاش کرتا ہے اور اس تلاش کو منزل بہ منزل آگے بڑھاتا اور بالآخر گلزار رخسار کے چشمۂ دہن میں اس کی نشان دہی کرتا ہے۔ جو دراصل حیات ابدی تلاش کرنے والوں کے لئے وجہی کا نسخہ ہے۔ چشمۂ دہن سے یہ بات یعنی سخن کے امرت گھونٹ نکلتے ہیں۔ اور سخن یعنی کلام اور تصنیف کے ذریعے ہی انسان زندہ جاوید ہو سکتا ہے۔

وجہی نے انسانی کے وجود میں عشق کے بیان کی لگہداشت میں سارے کردار اور واقعات اس کے مناسب جمع کر دیئے ہیں۔

وجہی نے طویل عمر پائی، اور اس نے محمد قلی کے دو جانشینوں، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔ محمد قطب شاہ، محمد قلی کے انتقال کے بعد ۱۰۲۰ھ سنہ ۱۶۱۲ء میں گولکنڈہ کے تخت پر بیٹھا۔ محمد قلی کی کوئی اولاد نہیں تھی، اس لیئے محمد کو جو اس کے بھائی محمد امین کا بیٹا تھا وہ آغوش میں لینا چاہتا تھا۔ اس نے بھائی سے اس کی خواہش بھی کی تھی لیکن محمد امین اس کو ٹال گیا۔ محمد امین کے انتقال کے بعد یہ حیثیت بزرگ خاندان کے محمد کی ولایت فطرتاً محمد قلی کو حاصل ہوئی۔ اس نے محمد کو بڑے چاؤ سے پالا

اور اسے شہزادوں کے شایانِ شان تعلیم دی۔ جب وہ پندرہ برس کا ہوا تو اپنی بھتیجی بیٹی حیات بخشی بیگم سے اس کا بیاہ کیا۔ یہ شادی بڑی اہمیت رکھتی تھی کیونکہ اس سے لاولد محمد قلی کی جانشینی کے بارے میں اشارہ ملتا تھا اسی لئے نہ صرف گولکنڈہ بلکہ شہر حیدرآباد میں بھی شادی کی بڑی دھوم ہوئی کئی دن تک دونوں شہر چراغاں سے بقعۂ نور بنے رہے۔ اور ضیافتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ملازمانِ حضور کو قیمتی لباس سرفراز ہوئے۔ جو بیش قیمت جوڑے متوسلین دربار میں تقسیم کئے گئے۔ اُن کی تعداد تیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ اگر ایک ایک جوڑے کی قیمت اس زمانے کے لحاظ سے پچاس ساٹھ روپیہ بھی مانی جائے تو شادی میں تقسیم کئے ہوئے جوڑوں پر جو روپیہ صرف ہوا وہ پندرہ بیس لاکھ سے کم نہیں ہوسکتا۔ اس ایک مد کے خرچ سے شادی کی دھوم دھام اور اس کے انتظامات کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

حیات بخشی بیگم بہت عقلمند خاتون تھی۔ اس نے ملک کے نظم و نسق میں سلطان محمد کی بڑی مدد کی اور سلطان محمد کے انتقال کے بعد بھی عبداللہ کے عہد حکومت میں کوئی چالیس برس تک امورِ مملکت کو چلانے والا ہاتھ دراصل اسی کا تھا۔ محمد کا عہد اس کی عقلمند رفیقہ حیات کی بدولت بہت پرسکون گذرا۔ محمد نے دہلی کے شہنشاہ، شاہجہاں سے بھی اچھے تعلقات قائم کر لئے تھے۔ جب جہانگیر کے خلاف شاہجہاں نے بغاوت کی تھی اور دکن کے حکمرانوں سے مدد طلب کی تھی۔ محمد شاہ نے بڑے خرم واحتیاط کا ثبوت دیا۔ اس پرسکون فضا میں ملک کی ذہنی تعمیر کے جن کی نیو ابراہیم کے زمانے میں پڑ چکی تھی۔ اس کی ترقی کا

سلسلہ محمد قلی اور پھر اس کے بعد محمد قطب شاہ کے عہد میں برابر جاری رہا۔ شہر کو اچھی اچھی عمارتوں سے مزین کرنے میں محمد قطب شاہ بھی اپنے پیش رو سے کسی طرح پیچھے نہیں تھا۔ چنانچہ شہر کی سب سے بڑی مسجد، مکہ مسجد اسی کے عہد میں تعمیر ہوئی۔ اس مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں سلطان محمد کے زہد و اتقا کا ایک واقعہ سامنے آتا ہے۔ مسجد کے تقدس اور احترام کے مدنظر اس کی بنیاد رکھنے کے لئے ایک ایسے شخص کی تلاش ہوئی، جس کی کوئی نماز تہجد بھی قضا نہ ہوئی ہو۔ مسجد کا سنگ بنیاد رکھتے وقت جو علماء اور فضلاء اور مذہبی پیشوا جمع ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی ایک نماز تہجد بھی قضا نہیں ہوئی۔ بالآخر خود سلطان محمد کو اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھنا پڑا۔ کیونکہ ان مقدس ہستیوں کے کثیر مجمع میں وہی ایک شخص تھا۔ جس کی کوئی نماز تہجد قضا نہیں ہوئی تھی۔

محمد نے حیدر آباد کے مشرق میں چار میل کے فاصلے پر ایک نئے شہر سلطان نگر کی بنا ڈالی تھی۔ لیکن یہ نیا شہر صرف حیدر آباد کی سدا بہار رونق بڑھانے کے کام آیا۔ سلطان نگر کو محمد نے حیدر آباد کے نمونے پر بنانا چاہا تھا۔ اور اس کے وسط میں بھی چار مینار جیسی عمارت بنوانے کی تجویز کی تھی۔ پرانی عید گاہ بھی اسی کی تعمیر کرائی ہوئی ہے۔ اس نے ایک منتہیٰ محل کے نام سے بھی بنوایا تھا۔ جسے وہ غالباً فصل خصومت کے مقصد سے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس محل کے اطراف ایک وسیع باغ بھی لگایا گیا تھا جس میں طرح طرح کے میوہ دار درخت کثرت سے تھے۔ محمد نے ایک محل، الٰہی محل کے نام سے بھی بنوایا تھا

اس کے لگائے ہوئے باغوں میں ایک اور "باغ محمد شاہی" تھا۔ جسے بڑے اہتمام سے بنوایا گیا تھا اس کی تکمیل پر سلطان محمد نے بڑی پر تکلف ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ اپنے بنا کردہ شہر، سلطان نگر یا سلطان پور میں بھی اس نے ایک پر فضا باغ بنوایا تھا۔ اور اس میں ایک نفیس دو منزلہ محل، عراقی طرز تعمیر پر بنوایا گیا تھا۔

ہماری پرانی داستانوں میں بادشاہوں کی زندگی، اُن کی شان و شوکت۔ اور ان کے ادہامات کے جو نقشے نظر آتے ہیں، اُن کا شائبہ، محمد قلی سے لے کر محمد اور اس کے جانشین، عبداللہ کی زندگی میں ملتا ہے۔ ایک ٹھیٹ داستانی طرز کا واقعہ محمد کی زندگی سے متعلق یہ ہے کہ اس کے گھر جب عبداللہ تولد ہوا، تو نجومیوں نے مثنوی "سحر البیان" کے ہیرو، بے نظیر کی ولادت کے وقت جو کچھ کہا تھا، عبداللہ کی ولادت کے وقت بھی کہا گیا۔ میر حسن کے الفاظ میں نجومیوں نے کہا ؎

ولیکن مقدر ہے کچھ اور بھی
کہ ہیں اس کے طالع میں برے طور بھی
یہ لڑکا تو ہوگا دلے کیا کہیں
خطر ہے اس بارھویں برس میں
نہ نکلے یہ بارہ برس رشک مہ
رہے برج میں یہ مہ چاردہ

عبداللہ کے بارے میں بھی نجومیوں نے یہ کہا تھا کہ بارہ برس کے اندر

بادشاہ کا لڑکے کو دیکھنا منحوس ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد نے عبد اللہ کی پرورش محل سے دور کسی گھر میں کی۔

محمد خود بھی اردو میں شعر کہتا تھا۔ اور علماء اور شعراء کی سرپرستی میں اپنے پیش رو بادشاہوں سے کسی طرح پیچھے نہیں تھا۔ سلطان محمد کے وزیر اعظم میر محمد مومن اور ان کے فرزند میر مجد الدین، فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کے علاوہ مورخ نظام الدین احمد فارسی کے اچھے انشاء پرداز اور شاعر تھے۔ اردو کے شعراء میں وجہی زندہ تھا۔ گو وہ بہت پیش پیش نہیں تھا۔ غواصی ابھر رہا تھا۔ وہ غزل گو تھا اور مثنوی میں قابل قدر کارنامے چھوڑ گیا۔ اس کی مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" غالباً محمد کے آخری عہد میں شروع ہوئی اور اس کے انتقال کے دو سال بعد یعنی ۱۰۳۵ھ میں تکمیل کو پہنچی۔ احمد نگر کا مشہور شاعر حسن شوقی بھی تھا۔ احمد نگر سے بیجاپور ہوتا ہوا۔ اس زمانے میں گولکنڈہ آنے کے بعد اس کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔

سلطان محمد کا انتقال ۱۶۲۶ء میں ہوا۔ اسی زمانے میں دکن کے دو طاقتور حکمراں ابراہیم عادل شاہ ثانی اور احمد نگر کے ملک عنبر کا بھی انتقال ہوگیا۔ مغلیہ حکومت کے دباؤ میں جو دکن کی سلطنتوں پر روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ ان حکمرانوں کے ایک ساتھ اٹھ جانے سے اور اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ احمد نگر کی سلطنت جو پہلے سے کمزور ہو رہی تھی، مغلوں کے حملے کی تاب نہ لا سکی۔ اور جلد دہلی کی حکومت کا جز بن گئی۔ اس کے بعد بیجاپور اور گولکنڈہ کی طرف مغل فوجوں کے راستہ کھل گیا۔

عبداللہ جب تخت پر بیٹھا، وہ صرف بارہ برس کی عمر تھا۔ اُس کی تخت نشینی پر، دربار سے منوسل شعراء میں مولانا رونق اور فقیر سراج وغیرہ نے بڑے طمطراق کے تاریخی قطعے کہے۔ اس موقع پر گولکنڈہ کے رواج کے مطابق متوسلین سلطنت میں سے چھوٹے بڑے سب کو بیش قیمت جوڑے عطا ہوئے۔ غریبوں اور ناداروں کو انعام واکرام سے مالامال کیا گیا۔ عالموں اور مذہبی پیشواؤں کو بھی ان کے مراتب کے لحاظ سے تحفے تحائف دیئے گئے۔ عوام میں گاڑیاں بھر بھر کر مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ تاج پوشی کی رسم محمدی محل میں انجام پائی اور حکومت کے کاروبار چلانے کے لئے ایک مجلس مقرر ہوئی، جو سابق ملکہ .... حیات بخشی بیگم کی ہدایتوں کے تحت عمل کرتی تھی۔ مرحوم سلطان محمد کی ماں، خانم آغا بھی زندہ تھی اور اُس کو بھی امورِ سلطنت میں کافی دخل تھا۔

لیکن اس سارے ظاہری کروفر کے باوجود، گولکنڈہ کے عروج کے دن جا چکے تھے۔ عہدہ دار نااہل اور اکثر کسی اثر کے تحت مقرر کئے جاتے تھے۔ خود عبداللہ آرام طلبی کا خوگر تھا۔ اُسے جہاں بانی کی جھنجھٹوں سے ہٹ کر سیر سپاٹوں اور باغوں میں عیش منانے کا زیادہ شوق تھا۔ کبھی وہ نبات گھاٹ (موجودہ نوبت پہاڑ) کے باغوں اور محلات میں دادِ عیش وعشرت دے رہا ہوتا تو کبھی کوہ طور کے محلات اور باغات میں، کامرانیوں کے جلوے دیکھتا۔

اس کی سالگرہ اور داڑھی مونڈھنے کی تقریب کے موقعے پر درباری

شعرا نے فارسی اور دکھنی قصیدے اس کی خدمت میں پیش کئے۔ اور انعام واکرام سے سرفراز ہوئے۔ محمد قلی کے زمانے سے محرم کی جو روایات قائم ہوگئی تھیں، ان میں محمد کے زمانہ میں اضافہ ہوا۔ محرم کا چاند دیکھنے کے بعد سے شہر میں گوشت کی دکانیں بند کردی جاتیں۔ شراب اور سیندھی فروخت کرنے کی بھی ممانعت تھی۔ تنبولی، پان فروخت نہیں کر سکتے تھے۔ اور نائیوں کو بال کاٹنے اور سر مونڈھنے کی اجازت نہیں تھی۔ شاہی چادر خانہ سے سیاہ، نیلے اور سبز رنگ کے کپڑے مقربان بارگاہ کو مفت دیئے جاتے تھے۔ دولت خانہ شاہی اور بازار میں دو عالی شان عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ جن کو پر تکلف فرش سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ ان عمارتوں میں دس محراب تھے، جن میں ہزار ہزار چراغوں کے لئے دس قطاریں طاقچوں کی بنی ہوئی تھیں۔ بادشاہ جہاں پناہ محرم کی پہلی شب کو اپنے دست خاص سے ایک قطار کے ہزار چراغ روشن کرتے، دوسری شب کو پہلی اور دوسری قطار کے دو ہزار چراغ اسی طرح ہر شب ایک ایک صف کے چراغوں کا اضافہ کیا جاتا۔ یہاں تک کہ دسویں محرم کو دسوں صفوں کے دس ہزار چراغ روشن ہو جاتے۔ اور ساری عمارت بقعہ نور نظر آنے لگتی، چراغ روشن کرنے کے بعد بادشاہ مرثیے سنتے اور اس کے بعد محل کو واپسی عمل میں آتی۔

عبداللہ کے زمانہ میں مغلوں کا دکن پر حملہ ہوا تھا۔ جس کے نتیجے کے طور پر بیجاپور اور گولکنڈہ دونوں حکومتوں کو مغل فوجوں سے دب کر

صلح کرلینی پڑی۔ اور پیش کش مقرر ہوا۔ دہلی کے شہنشاہ کی طرف سے ایک حاجب دونوں سلطنتوں میں مقرر کر دیا گیا تھا۔ جو بعض وقت نظم ونسق کے معاملات میں مداخلت کرتا تھا۔ لیکن حکمرانوں کو دم مارنے کی مجال نہیں رہی تھی۔

جہاں تک اردو کی ادبی تاریخ کا تعلق ہے۔ عبداللہ کے عہد میں نظم اور نثر دونوں کو بہت ترقی ہوئی۔ عبداللہ خود بھی اچھا شاعر تھا اور اردو شعرار کی سرپرستی کرتا تھا۔ عبداللہ نے ایک مختصر سا دیوان چھوڑا۔ ہے جہاندیدہ شاعر وجہی ابھی تک بقید حیات تھا اور اس نے عبداللہ کے حکم سے اسی زمانے میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب "سب رس" لکھی تھی۔ جو قدیم اردو نثر کا شہ کار مانا جاتا ہے۔ وجہی کے علاوہ غواصی بھی اب منظر عام پر آچکا تھا۔ اور اسے شاہی تقرب حاصل ہو چکا تھا۔ غواصی نے غزل، قصیدہ اور مثنوی ہر صنف شاعری کے پایہ کو بلند کیا۔ اس کی دوسری مثنوی "طوطی نامہ" عبداللہ کے عہد میں لکھی گئی۔ اس نے غزلوں کا بھی ایک دیوان چھوڑا۔

عبداللہ کے عہد میں ایک اور اردو شاعر ابن نشاطی نے شہرت حاصل کی۔ وہ اچھا انشا پرداز بھی تھا۔ اس کی مثنوی "پھولبن" اب اردو کے کلاسکی ادب میں شمار ہوتی ہے۔ اس نے "طوطی نامہ" کے قصوں کو نثر میں لکھا تھا۔ اور اس کا نام "طوطی نامہ" ہی رکھا تھا۔ یہ مثنوی قصہ در قصہ کا اچھا نمونہ ہے۔ اس میں اصل قصہ کنچن پٹن کے بادشاہ کا ہے

جسے ایک عابد عقل و فہم کی داستانیں سناتا ہے۔

غواصی جب ابھرنے لگا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وجہی کی شہرت ماند پڑنے لگی تھی۔ تاہم عبداللہ نے اس کی قدردانی کی۔ اور اسے اپنے دربار کے شعراء میں جگہ دی۔ غواصی میں اور وجہی میں کبھی کبھی ادبی اور شعری مسابقتیں بھی رہتی تھیں۔ چنانچہ ۱۰۴۱ھ میں جب سلطان عبداللہ کے ہاں لڑکا تولد ہوا تو دربار کے کئی شعراء نے تاریخی مادے نکالے۔ غواصی نے "محفوظ یاد" سے تاریخ نکالی تھی۔ یہ مختصر اور موجز تاریخ حقیقت میں غواصی کے اپنے مقام اور اس کے استقلال اور شان کی مظہر ہے۔ اب وجہی کے لئے اپنی استادی دکھانے کا موقع تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے دل و دماغ کی ساری توانائیوں کو اس تاریخ کے لئے بازی پر لگا دیا۔ جب کہیں جا کر ایسی نفیس اور استادانہ تاریخ کہی گئی۔

"آفتاب از آفتاب آمد پدید"

عبداللہ کے دربار کے مورخ مرزا نظام الدین احمد نے بھی ایک تاریخ گذارنی تھی جس کا مادہ تھا۔ "گہر تاج پادشاہ زماں"

اِن شاعرانِ بزرگ کے علاوہ عبداللہ کے عہد میں طبعی اور امین بھی گذرے ہیں۔ طبعی حضرت شاہ راجو ثانی کا معتقد تھا۔ گولکنڈہ کا آخری تاجدار سلطان ابوالحسن قطب شاہ بھی شاہ راجو کے مریدوں میں سے تھا۔ طبعی نے حضرت شاہ راجو کی مدح میں ایک عقیدت مندانہ قصیدہ بھی لکھا تھا۔ طبعی کی مثنوی "بہرام و گل اندام" ایک رومانی داستان ہے۔

عبداللہ کے زمانے کے علماء میں، جنہوں نے اردو میں تصنیف چھوڑی حضرت میراں یعقوب ہیں۔ انھوں نے تصوف کے مسائل پر ایک ضخیم کتاب اردو نثر میں لکھی تھی۔ جس کا نام "شمائل الاتقیا" ہے۔

عبداللہ کا انتقال ۱۶۷۲ء میں ہوگیا۔ اس کی جگہ عبداللہ کا داماد — ابوالحسن تخت پر بیٹھا۔ عبداللہ کے وقت ہی سلطنت کے حالات خراب ہو چکے تھے۔ دہلی کی مداخلت کے علاوہ اس زمانے میں انگریزوں، فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کی آمد سے حالات اور بھی خراب تر ہو چکے تھے۔ مرہٹوں کی جو طاقت سیواجی کی قیادت میں اُبھر رہی تھی، اس کی بدولت حالات کو قابو میں رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔ ابوالحسن غیر متوقع طور پر بادشاہی کے لئے منتخب ہوگیا، صوفی منش انسان تھا۔ اس لئے اس کی تخت نشینی سے حالات کچھ بہتر نہ ہو سکے۔ شاہجہاں نے دکن کی سلطنتوں پر نگرانی رکھنے کے لئے اپنے بیٹے اورنگ زیب کو دکن میں اپنا نائب مقرر کر رکھا تھا۔ ابوالحسن کے خاندان کے بارے میں کچھ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ بعض لوگ اسے سیف خاں عین الملک کا پوتا بتاتے ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ اگر اسے قطب شاہی خاندان کے ساتھ رشتہ ہوگا تو بہت دور ہوگا۔ اس کی تربیت معمولی آدمی کی طرح ہوئی تھی۔ عبداللہ کی بیٹی بادشاہ بی بی، جو بعض سیاسی اور دوسری مجبوریوں کے تحت ابوالحسن کو بیاہی گئی۔ اصل میں ایک حجازی امیرزادہ سید سلطان سے منسوب تھی۔ سید سلطان عبداللہ کے بڑے داماد سید احمد کا دوست تھا۔ اور دونوں ہم وطن تھے۔ شادی کی تیاریاں دھوم دھام سے

ہو رہی تھیں۔ اور سارے دارالسلطنت میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی کہ یکایک کسی بات پر سید احمد اور سید سلطان دونوں میں اَن بن ہو گئی۔ سید احمد اور اس کی بیوی، دونوں رشتہ توڑنے کے درپے ہو گئے۔ ورنہ سید احمد نے مغلوں سے جا ملنے کی بھی دھمکی دی۔ اس سے خائف ہوکر بادشاہ بعض مقربین سلطنت نے سیّد سلطان کا رشتہ توڑ دینے کی فہمائش کی اور ابوالحسن کا نام شہزادی کے بر کی حیثیت سے پیش کیا۔ بادشاہ بے بس تھا۔ ابوالحسن کو اس کے گھر سے بلاکر شہزادی کا عقد کر دیا گیا۔

ابوالحسن کی تخت نشینی بھی ایک غیر متوقع واقعہ تھا۔ عبداللہ کی بڑی لڑکی سلطنت دہلی اور گولکنڈہ کے راضی نامہ کے تحت عالمگیر کے بیٹے محمد سلطان کو بیاہی گئی تھی۔ اس راضی نامہ کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ عبداللہ کا جانشین محمد سلطان ہوگا لیکن محمد سلطان سے عالمگیر کی ناراضی کے باعث وہ نظر بند کر دیا گیا تھا۔ محمد سلطان کے بعد عبداللہ کے دوسرے داماد، سید احمد کا حق، ابوالحسن کے مقابلے میں مرجح ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن عبداللہ نے اپنی زندگی میں اپنی جانشینی کا کوئی تصفیہ نہیں کیا تھا۔ سید احمد اور اس کی بیوی، یعنی عبداللہ کی بڑی لڑکی کا جو بڑی صاحبی یا ماں صاحب کے نام سے عام طور پر مشہور تھی، اثر اور نفوذ امور سلطنت میں بھی بہت تھا۔ غالباً عبداللہ سید احمد کی بعض حرکات کی وجہ سے اس سے بہت زیادہ خوش نہیں تھا۔ تاہم وہ اس کا اظہار

بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب سلطان عبداللہ قطب شاہ بستر مرگ پر تھا، اس کی جانشینی کے مسئلے میں اراکین سلطنت دو جماعتوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک جماعت، جو زیادہ تر بیرونی عہدہ داروں پر مشتمل تھی۔ سید احمد کی طرف دار تھی۔ لیکن سید مظفر، موسیٰ خاں اور خاص طور پر مادنا اور اکنا ابوالحسن کے طرف داروں میں تھے۔ سید احمد کی بیوی محل پر حکمران تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ راتوں کو اپنی مسلح ترک اور حبشی لونڈیوں کے ساتھ ننگی تلوار لئے محل میں گشت کرتی پھرتی تھی۔ ایک رات کو ابوالحسن جب محل میں داخل ہونا چاہتا تھا، سید احمد کے طرفداروں نے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ بچ کر سید مظفر کے پاس بھاگا۔ لیکن سید مظفر، تجربہ کار آدمی تھا۔ اس نے ابوالحسن کو دلاسا دیا اور اپنے کار آمدہ لوگوں کے ساتھ محل پر حملہ کر کے اس پر قابض ہو گیا۔ اور ابوالحسن کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد سید احمد اور اس کی بیوی دونوں کو قید کر دیا گیا۔ جہاں ان کا سال بھر کے اندر انتقال ہو گیا۔

ابوالحسن نے جب عنان حکومت سنبھالی، مرہٹوں کے حملوں کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔ اس کے ساتھ مغلوں کی تلوار بھی سر پر لٹک رہی تھی۔ ایسی فضا میں ابوالحسن نظم ونسق کی کل سدھارنے بیٹھا اس نے رعایا کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور جن لوگوں نے اس کی طرفداری کی تھی، انہیں اعلیٰ عہدے دیئے۔ سید مظفر کو اس نے

میر جملہ کا رتبہ عطا کیا۔ لیکن جلد ہی سید مظفر سے بدعنوانیاں سرزد ہونے لگیں جب ابوالحسن نے اس کو معزول کر دیا اور مادنا کو اس کی جگہ مقرر کیا تو اس کا سر بھی پھر گیا۔ تاہم ابوالحسن نے اس پر اعتماد جاری رکھا۔ سید مظفر نے بھاگ کر مغلیہ دربار میں پناہ لی۔ یہ گولکنڈہ کے لئے برا ثابت ہوا۔

اس عرصہ میں مغلیہ حکومت کا حملہ بیجاپور پر ہو گیا۔ گولکنڈہ کی فوج بھی مادنا کی کمان میں بیجاپور بھیجی گئی۔ لیکن مغلیہ ریشہ دوانیوں کے باعث مادنا نے تساہل سے کام لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیجاپور پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد گولکنڈہ کی باری تھی۔ گولکنڈہ کی موجودہ حالت ایسی نہیں تھی کہ شہنشاہی فوجوں کا مقابلہ کر سکتا۔ اس کے علاوہ عبداللہ خان اور کچھ دوسرے غدار عہدہ داروں نے بھی مغلوں کی مدد کی لیکن کچھ وفادار ایسے بھی تھے جنہوں نے آخر وقت تک مدافعت کی۔ ان میں عبدالرزاق لاری بھی تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک میری جان میں جان ہے میں اپنے آقا ابوالحسن کی خدمت کرونگا لیکن سمندر کا چڑھا ہوا پہاڑ کو نہیں توڑ سکتا۔ زخموں سے چور چور وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا اور تین شبانہ روز اسی حالت میں پڑا رہا۔ آخر اس کے کچھ جاننے والوں نے اسے پہچانا۔ اور اٹھا کر اس کے گھر لے گئے جہاں اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی۔

جب قلعہ پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا تو ابو الحسن نے کسی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ محل میں گیا اور خواتین کو دلاسا دیا۔ اور جب روح اللہ خاں ابو الحسن کو گرفتار کرنے کے لئے گیا، تو وہ متانت سے تخت پر بیٹھا ہوا تھا اس نے روح اللہ خاں اور اس کے ساتھی مختار خاں کو گرمجوشی سے سلام علیک کہا۔ اور انھیں بلاکر اپنے پاس بٹھایا اور علمی گفتگو شروع کی۔ اس کے بشرے سے ذرا بھی نہیں ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی اہم واقعہ پیش آرہا ہے۔ جب کھانے کا وقت آیا تو اور خادموں نے ناشتہ تیار ہونے کی اطلاع دی۔ وہ اٹھا اور مغل سرداروں کو ساتھ لے کر کھانے پر بیٹھا کھانے کے دوران میں وہ ان سے خندہ پیشانی کے ساتھ گفتگو کرتا رہا۔ یہ دیکھ کر روح اللہ خاں اور اس کے ساتھی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی روح اللہ خاں نے جرات کر کے پوچھا کہ "کیا یہ ناشتہ کا وقت ہے؟" روح اللہ نے پھر پوچھا "یہ صحیح ہے کہ آپ کے ناشتے کا وقت یہی ہے۔ لیکن اس دارو گیر کی فضا میں کہا آپ کا جی کھانے کو چاہتا ہے؟" اس پر ابو الحسن نے جواب دیا "میں بالکل مطمئن ہوں۔ ہر چیز خدا کی مشیت سے ہوتی ہے۔"

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ سوار ہو کر عالمگیر کے پاس گیا۔

مغلوں کا قبضہ سنہ ۱۰۹۶ھ میں گولکنڈہ پر بھی ہو گیا۔ اور ابو الحسن کو دولت آباد بھیج دیا گیا۔

اس سیاسی بدحالی کے زمانہ میں بھی گولکنڈہ، فارسی، اردو، اور

تلنگی شاعروں اور ادیبوں سے خالی نہیں رہا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے کارنامے اس پایہ کے نہیں ہیں، جس پایہ کے وجہی "قصہ رضوان شاہ و روح افزا" لکھی۔ یہ مثنوی سقوط گولکنڈہ سے چار برس پہلے یعنی ۱۰۹۴ھ میں لکھی گئی ہے۔ اور شاعر لطیف بھی اسی زمانے میں گذرا ہے جس نے محمد ابن حنفیہ کی جنگوں کے حالات "ظفر نامہ" کے نام سے نظم کئے ہیں۔ لطیف نے سلطان ابوالحسن کی مدح میں بھی کچھ شعر مثنوی کی شکل میں کہے تھے مثلاً کہتا ہے ؎

تھا جب دور سلطان شہ بوالحسن
شہر حیدر آباد اُن کا وطن
کیا تب ظفر نامہ کی میں بنا
مرتب کئے لگ سونا چپ رہنا

ایک اور شاعر افضل نامی بھی تھا جس نے مثنوی "محی الدین نامہ" لکھی تھی، گولکنڈہ کے سقوط کے بعد بھی وہ حیدرآباد میں تھا۔ نوری، فارسی اور اُردو کا اچھا عالم اور شاعر تھا۔ وہ سید مظفر کے بچوں کا اتالیق بھی رہا۔ خود سید مظفر بھی اردو کا شاعر تھا۔ غلام علی مثنوی "پدماوت" کا مصنف بھی اُسی زمانے میں گذرا ہے۔

گولکنڈہ میں کئی مرثیہ نگار بھی پیدا ہوئے۔ یہ محرم اور ایام عزا میں مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ لیکن اب اُن میں سے بہت کم شعراء کا کلام اور حالات دستیاب ہوتے ہیں۔

بیجا پور اور گولکنڈہ میں جن تہذیبی روایات کو نشو و نما ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کا ایک حسن کارانہ پہلو بھی تھا۔ اس حسن کارانہ پہلو کا ایک اہم جز ان کی تعمیر کاری اور شعر و سخن کا ذوق بھی۔ صوفیوں اور سنتوں نے مذہبی پرچار اور خیالات کے میل جول کے لئے کسی ایک مقام کی بولی کو استعمال کرنے کی بجائے جس زبان کو اختیار کیا تھا وہ مختلف بولیوں کے علاقوں میں سمجھی جا سکتی تھی۔ اس زبان کو شمال سے دکن آنے والے صوفیوں نے ارشاد و ہدایت کی غرض سے اس تسلسل اور تواتر کے ساتھ استعمال کیا کہ اس کا ایک مقام پیدا ہو گیا۔ اور وہ رفتہ رفتہ ادب اور شاعری کے لئے بھی استعمال ہونے لگی۔ اس میں صوفیوں کے اس اثر کو بھی بڑا دخل تھا، جو ان کا عوام کے ذہنوں پر تھا۔ جب بزرگوں اور صوفیوں نے اس زبان میں لکھنا شروع کیا تو خواص اور عوام کے ذہنوں میں ان بزرگوں کا تقدس زبان کے ساتھ وابستہ ہوتا گیا۔ اور لوگ اس میں لکھنے لگے اس میں ہندوستانی بولنے کے علاوہ ترکی زبان بولنے والے بھی تھے۔ ایرانی اور عرب بھی۔ چنانچہ عرب اور ایران کے کئی صوفی بزرگ اور شاعر ایسے تھے کہ جب وہ دکن آئے تو یہاں کے عام رجحان کے اثر سے اردو میں لکھنے پر مجبور ہو گئے۔

بیجا پور اور گولکنڈہ کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے بہمنی عہد کی روایات کو آگے بڑھا کر اردو زبان کو ادبی درجہ تک پہنچا دیا۔ انہوں نے زبان جس طرح کی سیال حالت میں ملی تھی، اس کو استحکام

انہوں نے نکھارا، سنوارا اور اصناف شعر وادب کی بنیاد رکھی۔ دکن کی سلطنتوں میں فارسی ادیبوں اور شاعروں کی کمی نہیں تھی، تاہم فارسی کا مذاق اتنا عام نہیں تھا اور یہ اثر تنہی درآمد کی وجہ سے ایسا چھایا ہوا بھی نہیں تھا کہ اردو ادب اور شاعری بالکل اس کی سایہ میں جا تی۔ دکن کے شعراء اور ادیبوں نے زبان اپنی برقرار رکھی۔ لیکن ادبی موضوعات اور اصناف اور بحروں کے انتخاب میں انہوں نے فارسی سے استفادہ کیا۔ ہندوستان اور اس کے موضوعات اور اصناف بھی جو اُن کے اردگرد تھے اُن کیلئے کشش کا باعث بنے اور بعض وقت بحروں کے انتخاب میں بھی انہوں نے ہندی سے استفادہ کیا۔ ان کی لفظیات پر عربی اور فارسی کا بھی اثر تھا، لیکن موضوع کے لحاظ سے اس میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ جہاں موضوع اپنے تھے، ان کی لفظیات پر عربی اور فارسی اثر بہت کم دکھائی دیتا ہے۔

شمال اور جنوب کا سنگم

اِس دوسو برس کے عرصہ میں جنوبی ادبی اور تہذیبی روایات دکن کی سرزمین میں پرورش پا رہی تھیں۔ شمال کے حکومتی اور تہذیبی مرکز دلی میں فارسی ادب اور شاعری کا ذوق ترقی کر رہا تھا۔ دکن اور جنوب کا علاقہ جو محمد تغلق کے عہد میں دہلی سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا تھا، اپنی ایک نمایاں تہذیب اور شائستگی اور اس کے ساتھ ادبی روایات کو ترقی دینے لگا تھا۔ گجرات جہاں کے احمد شاہی حکمرانوں نے دکن کے تقریباً ساتھ ساتھ دہلی کی سیادت کا جوا اتار پھینکا تھا۔ جہاں تک ادبی روایات کا تعلق ہے، دکن سے بہت دور نہیں تھا۔ وہاں بھی کچھ شاعر اس دوران میں گزرے، لیکن ان کی زبان پر فطرتاً مقامی زبان کا اثر بھی رہا۔ کشمیر، جونپور اور اودھ کے علاقے، جو کچھ عرصے کے لئے دہلی سے

روبزوال ہو گئے تھے۔ وہ پھر بھی دہلی کے اثر کے تحت رہے۔ بنگال میں وہاں کے خود مختار حکمرانوں نے بنگالی کی سرپرستی کی، اور اس زبان کو ترقی دی، کیونکہ اردو کی زد سے یہ علاقہ دور تھا۔ اس کے علاوہ وہاں صرف ایک ہی زبان ہونے کی وجہ سے دہلی اور اطراف سے گئے ہوئے حکمرانوں کو کسی اور زبان کی ضرورت نہیں ہوئی۔ وہ بنگالی سے کام چلا سکتے تھے۔

مغلوں کی آمد

لودی حکمران جس زمانے میں دہلی میں برسر اقتدار تھے، مغلوں کا بڑھتا ہوا سیلاب بالآخر دہلی تک پہنچ گیا۔ چنانچہ بابر نے ۱۵۲۶ء میں دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اور نئے مغل یا ترک حکومت کی بنیاد پڑی۔ نئی حکومت کے استحکام اور توسیع کے تین مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ ۱۵۲۶ء سے ۱۵۳۰ء تک، جس میں افغانوں اور راجپوتوں کی قوت کو توڑ دیا گیا۔ یہ کام بابر نے انجام دیا۔ بابر کے بعد ہمایوں کے زمانے میں مالوہ، گجرات اور بنگالہ کی تسخیر کی ناکام کوششیں کی گئیں۔ آخر دبی ہوئی افغان قوتیں بیدار ہوئیں۔ اور اسے کچھ عرصے کے لئے ہندوستان سے نکل جانا پڑا۔ شیر شاہ نووارد مغلوں کے مقابلے میں ہندوستان سے زیادہ واقف تھا، اور اس کے سارے مفادات ہندوستان سے وابستہ ہو گئے تھے اس لئے اس کی حکومت کے دوران میں نظم ونسق بہت بہتر ہو گیا۔ ہمایوں کے پھر دہلی لوٹنے کے بعد سے اکبر کے عہد تک دراصل سلطنت

کے اس کام کا اصلی دور ہے۔

بابر کو دہلی کی افغان قوتوں کو پوری طرح محکوم کرنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا کہ اسے راجپوتوں کے مقابلے کے لئے جانا پڑا۔ جب رانا سانگا پر فتح حاصل کر کے وہ لوٹا، تو اس کے سامنے سلطنت کے نظم و نسق کو دھڑے پر ڈالنے کا بڑا کام تھا۔ بابر بڑا بہادر تھا، اس کی طبیعت میں مہم پسندی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نفیس اور عمدہ جذبات سے بھی عاری نہیں تھا۔ اس کو موسیقی اور فنون لطیفہ سے بھی دلچسپی تھی۔ اس کو ملک کی ذہنی تعمیر کے موقع کم ملے، تاہم اس کے زمانے میں بھی دہلی میں فارسی اور عربی کے کئی جید عالم موجود تھے۔ وہ فارسی میں شعر بھی کہتا تھا اور ترکی کا اچھا انشاء پرداز تھا۔ جیسا کہ "تزک بابری" سے ظاہر ہوتا ہے مفتوحہ ہندوستان سے وہ کتنا جلد واقف ہو گیا تھا۔ اس کا پتہ "تزک" کے ایک آدھ اردو، ترکی، ریختہ قسم کے شعر سے چلتا ہے۔

جب ہمایوں تخت پر بیٹھا تو دبی ہوئی افغان قوتوں کو سر اٹھانے کا موقع مل گیا۔ اس کے بھائیوں میں بھی تخت کے لئے مسابقت شروع ہو گئی۔ اور تینوں بھائیوں، کامران، ہندال اور عسکری میں سے ہر ایک تلوار کے بل بوتے پہ سلطنت حاصل کرنے کی ٹھانی۔ تاہم ہمایوں نے ہر ایک کو ایک علاقہ دے کر، اس بلا کو سر سے ٹالا لیکن شیر شاہ [illegible] سے لڑائی میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اور اس سے ہار کر ہندوستان

سے نکل جانا پڑا۔

پھر جب شیر شاہ کے انتقال سے قوت کا خلا پیدا ہو گیا تو وہ واپس آیا۔ اور دہلی پر دوبارہ قابض ہو گیا۔ تاہم اسے کچھ تو اپنے بھائیوں کی وجہ سے اور کچھ بچی کچی افغان قوتوں کی وجہ سے سارا وقت لڑائی بھڑائی میں گذارنا پڑا۔ ہمایوں کے زمانے میں دہلی میں علماء اور فضلا بڑی تعداد میں جمع تھے۔ فارسی کے کچھ شعراء بھی تھے۔ النفی یزدی جب ہمایوں ایران سے ہندوستان لوٹا تو اس کے ساتھ آیا تھا۔ وہ اکبر کے زمانے میں بھی موجود تھا۔ لیکن علی قلی خاں کے دربار میں چلا گیا تھا۔

۱۵۵۶ء میں ہمایوں کی بے وقت موت نے اس کے کم عمر بیٹے اکبر کو مخدوش موقف میں چھوڑ دیا۔

اکبر کے دلی، بیرم خاں نے رفاقت اور رہنمائی کی اور اس کی شاہی کا اعلان کر دیا۔ لیکن ہندوستان پر مغلوں کا قبضہ ابھی ایک مسلمہ واقعہ نہیں بننے پایا تھا۔ افغان حکومت کے باقیات میں سے، سپہ سالار ہیمو نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اور اکبر سے اس کا مقابلہ پانی پت کے تاریخی میدان میں ہوا۔ نتیجہ اکبر کے موافق برآمد ہوا۔ اور آئندہ کے لئے افغان اور مغل کش مکش کا تصفیہ ہو گیا۔

اکبر نے کچھ تو اپنی قوت بازو سے لیکن زیادہ تر اپنی قوت عقل و تدبر سے مرکز گریز عناصر کو یکجا کیا۔ اور اسی طرح نئی ہندوستانی شائستگی اور تہذیب کے نشو و نما کے لئے زمین ہموار کر دی۔ اس کا منشا

اور اس کا تحت الشعور ایرانی شائستگی سے وابستہ تھا لیکن اس نے اپنے حال کو اور اپنے شعور کو ہندوستان کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا وہ راجپوت لڑکیوں کے ساتھ اپنا اور اپنے بیٹے کا شادی بیاہ اور ہندی کے شعراء کی سرپرستی، دراصل اس کے شعوری زندگی کے بیجوڑ بہاؤ کو ظاہر کرتے ہیں۔ فارسی اس کی زبان ثانوی تھی۔ اور وہ اپنے گھر میں یقیناً فارسی سے زیادہ ہندوستانی بولتا ہوگا لیکن اس زمانے تک اس بے مقام غیر معیاری زبان کو ادب میں استعمال کرنے کیلئے کوئی گنجائش نہیں تھی، مغلیہ دربار کے متوسلین اور علمی مرکز دلی میں جہاں تک مرکز کا اثر و نفوذ تھا۔ لوگ فارسی کو ادبی زبان کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ان میں عرب بھی تھے، ایرانی بھی تھے، ہندوستانی افغان اور مغل بھی۔ اس سے ہٹ کر مقامی بولیاں اور زبانیں تھیں۔ ان میں دہلی سے قریب تر علاقے کی زبان برج بھاشا ترقی یافتہ زبان تھی۔ اور اپنے پیچھے شاعری اور ادب کی روایات رکھتی تھی۔ اسی لئے اکبر کے دربار کے امراء میں خانخاناں نے جب ہندوستان کی زبانوں میں لکھنا چاہا تو اسے برج بھاشا ہی ملی۔ اس طرح اردو یا پرانی اردو اکبر اور اس کے بعد جہانگیر اور شاہ جہاں حتیٰ کہ اورنگ زیب کی سرپرستی سے بھی محروم رہی۔ اسی لئے اس غیر مسلمہ بولی میں لکھ کر اپنی لیاقت ضائع کرنے کا خیال کسی کے دل میں نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔

اکبر کئی حیثیتوں سے ایک غیر معمولی انسان تھا۔ اس کی طبیعت

میں ایک حد تک نفاست اور مذاق میں شائستگی تھی لیکن اس میں نشیب و فراز بھی تھے۔ وہ موسیقی اور شاعری کا بھی دلدادہ تھا، اور اس نے فارسی کے ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایرانی شعراء کی آمد کا سلسلہ اکبر کے عہد سے شروع ہوا۔ اسی کے باعث شمال میں اردو کو ادبی اغراض کے لئے استعمال کرنے کے مواقع پس پشت پڑ گئے۔ اکبر کے عہد میں ملک کی ثقافتی اور ذہنی سطح کو آگے بڑھانے میں ان فارسی شعراء اور ادیبوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ جو اس زمانے میں یا اس سے پہلے ایران سے آئے تھے، ان میں قصیدہ اور غزل کے اساتذہ جیسے عرفی، نظیری، رنوعی وغیرہ شامل تھے۔ ابوالفضل اور بداونی اس کے عہد کے بلند پایہ انشاء پرداز تھے فیضی شاعر بھی تھا۔ اور فلسفی بھی۔ کشمیر کے ایک شاعر فطرتی کو اکبر نے دربیت کے عوض بارہ ہزار روپیہ انعام دیئے تھے جس سے اکبر کی قدردانی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اکبر کا بڑا کام تمدن کے مختلف عناصر میں میل ملاپ پیدا کرنا تھا۔ اس نے سماجی زندگی، ذہنی زندگی اور سیاسی زندگی۔ حتیٰ کہ مذہبی زندگی میں بھی مختلف اجزاء کو سمو کر ایک مرکب تیار کرنے کی کوشش کی۔ اس رجحان کا ایک بالواسطہ نتیجہ بھگتی تحریکیں بھی تھیں، صوفیوں اور بھگتی والوں نے غیر شعوری طور پر مذہبی خیالات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش شروع کی اور یہ تحریک ہندوستان گیر بن گئی۔ اس لئے صوفی اور بھگتی

شاعر کسی مقامی بولی کے مقابلے میں ایک مخلوط قسم کی زبان استعمال کرنے پر مجبور تھے جو مختلف بولیوں کے علاقوں میں سمجھی جا سکے۔ چنانچہ کبیر نے اپنی تحریک کو اسی ذریعے سے آگے بڑھایا۔

سلطنت کی مادی اور ذہنی تعمیر کا وہ کام جو اکبر کے عہد میں شروع ہو چکا تھا۔ جہانگیر کے عہد میں برابر جاری رہا۔ جہانگیر نے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے کئی کام کیے۔ اس نے جو نئے قوانین نافذ کیے اُن میں رعایا کے عام جذبات اور احساسات کا بہت لحاظ رکھا گیا تھا۔ جہانگیر کو انصاف رسانی کی جیسی کچھ فکر تھی اس کا اندازہ اس افسانہ نما واقعہ سے ہوتا ہے کہ اس نے فریادیوں کے لئے ایک زنجیر آگرہ کے قلعہ میں لٹکا رکھی تھی، اور فریادی کو اجازت تھی کہ وہ جس وقت ضرورت ہو اس زنجیر کو ہلائے۔ اپنی انصاف رسانی کی خواہش کو جہانگیر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جس تندہی سے تیار تھا۔ اس کا اندازہ اس کی چہیتی ملکہ نورجہاں کے ایک واقعے سے ہوتا ہے۔ ایک شامت کا مارا رہ گیر قصر شاہی سے گذرا جہاں ملکہ بیٹھی ہوئی تھی۔ نورجہاں کو اس پر غصہ آیا اور اُس نے طبنچہ مارا اور وہ نوجوان ہلاک ہو گیا۔ جہانگیر کو جب اس کی خبر ہوئی، تو وہ بڑے دگدھا میں پڑ گیا۔ ایک طرف ملکہ کی محبت تھی دوسری طرف فرض کا احساس۔ آخر اس کا فرض کا احساس غالب آیا اور اس نے قصاص کا حکم دے دیا۔ اس واقعہ کو شبلی نے ایک نظم کا موضوع بنایا ہے

جس کے کچھ شعر حسب ذیل ہیں:۔

ساتھ ہی شاہ جہانگیر کو پہنچی جو خبر
غیض میں آگئی آبروئے عدالت پہ شکن
مفتیٔ دیں نے یہ بے خوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن
لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن
ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جاکر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن

جہانگیر کا رومان نور جہاں کے ساتھ خود ایک شاعری ہے اور شعر کا موضوع بنا رہا ہے۔ نور جہاں سے جہانگیر کی محبت اس کی طبیعت کی افراط و تفریط کا پرستار تھا۔ اور پھولوں کے رنگ و بو میں اسے ماورا کے نقوش دکھائی دیتے تھے اس کی "تزک جہانگیری" سے اس کی ادبی قابلیت اور شاعرانہ طبیعت کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ ادب اور فن کا بھی سرپرست تھا، اور اس کا جمالیاتی مذاق بہت بلند تھا۔ جہاں تک ادبی روایات کا تعلق ہے، اس کے عہد کو اکبر کے عہد کا سلسلہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کے زمانے میں اکبر کے عہد کے کچھ شاعر اور ادیب باقی رہ گئے تھے۔ جہانگیر کے زمانے کے شعراء میں طالب آملی ملک الشعراء تھا جو بڑا بلند پایہ شاعر تھا۔ ابو طالب کلیم ہمدانی بھی اسی کے

عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ نظیری، جو اکبر کے زمانے کا نغز گو فارسی شاعر ہے، وہ بھی جہانگیر کے زمانے میں موجود رہا۔ شعراء کی قدردانی کے سلسلے میں کئی واقعات ایسے ملتے جن سے پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر بھی سخن فہمی میں اپنے زمانے کے کسی اور حکمران سے کم نہیں تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے حیاتی کاشی کو ایک موقع پر زر میں تلوایا تھا اور اس کے وزن بھر اشرفیاں اسے عطا کی تھیں۔

شاہ جہاں کے عہد کو ہندوستان کے قرون وسطیٰ کے فن کارانہ رجحانات کا منتہا سمجھنا چاہیئے۔ شاہ جہاں نے تعمیر کاری کے جو نفیس نمونے چھوڑے ہیں وہ مغلیہ دور کی فنی رجحانات کا معراج کمال ہیں۔ اس کے دربار میں فارسی کے نغز گو شاعر بھی تھے، بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ اُسے خود بھی شعر و ادب سے مس تھا۔ لیکن اینٹ، چونے اور پتھر کے واسطے سے اعلیٰ پایہ فن کاری کے جو نمونے اس نے چھوڑے ہیں، ان میں سے ہر ایک ایک بہترین شعر بلکہ ایک مکمل نظم سے زیادہ نفیس اور سامان جنت نظر ہے۔ اگر وہ صرف تاج کو بنا کر مر جاتا۔ تب بھی دنیا کے عظیم الشان حسن کاروں اور فن کے سرپرستوں اور محرکوں کی فہرست میں اس کا نام باقی رہ جاتا، لیکن اس نے کوئی بیت اُدھوری نہیں چھوڑی۔ بلکہ موتی مسجد، دیوان عام، دیوان خاص، جامع مسجد جیسی کئی حسین حسین عمارتیں بنوا کر اپنی حسین فکر کے نقوش مکمل کر دیئے۔

شاہ جہاں کے عہد میں حسن کارانہ اظہارات کی اگر کچھ کمی رہ گئی تھی تو اس کے زمانے اور دربار کے فارسی شعراء نے وہ کمی پوری کردی صائب۔ میر رضی مشہدی، سعید اگیلانی، قدسی، فروغی، ناصر علی سرہندی سرخوش وغیرہ اس عہد کے باکمال شاعر تھے۔ محمد افضل سرخوش کا ایک ہندی شعر بھی آزاد بلگرامی نے خزانہ عامرہ میں نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے ؎

جا کو نو سر دیپا ہی جا کت ابرم پار
جیسی کو نہ ہو تو د کی نا دتی ناد بچپار

عالمگیر کے عنفوان کا ایک واقعہ یہ ہے کہ شاہ جہاں ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھ رہا تھا، شہزادہ اورنگ زیب بھی ساتھ تھا ایک ہاتھی شہزادہ کے گھوڑے پر حملہ آور ہوا اور گھوڑے کو زمین پر گرا دیا۔ اورنگ زیب تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں شاہ جہاں کے حکم سے گرز بردار اور بہت سے لوگ آگے بڑھے اور ہاتھی بھاگ گیا۔ شاہ جہاں نے شہزادہ محی الدین اورنگ زیب کو گلے لگایا۔ اور مراتب میں اضافہ کیا۔ اس کے تین دن بعد شہزادہ کی سالگرہ تھی۔ اس موقع پر اُسے سونے میں تولا گیا۔ اور شعراء نے فارسی اور ہندوستانی نظمیں گذرانی۔ شعر و ادب اور علم و فن کی وہ فضا، جو ہندوستان میں ان شعراء کی موجودگی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ اردو کی ادبی تاریخ سے ان

معنوں میں گہرا تعلق رکھتی ہے کہ اسی فضا سے اور فارسی شاعروں کی ہموار کی ہوئی زمین پر بعد میں اُردو شاعری اور ادب کی نشو ونما ہوئی یوں تو اکبر کے زمانے سے، دکن کی سلطنتوں کی طرف مغلوں کی توجہ منعطف ہوگئی تھی، لیکن اکبر کو راجپوتوں سے اور بنگال، مالوہ اور گجرات سے نپٹنے میں اتنا وقت نہیں ملا کہ وہ دکن کی سلطنتوں سے کسی طرح کا سیاسی فوجی اور تہذیبی ربط قائم کرسکتا۔ لیکن شاہ جہاں کو اس کے موقعے ملے۔ سفیروں اور حاجیوں کی زبانی اُسے احمد نگر اور خاص طور پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی شان وشوکت اور وہاں کی تہذیب اور شائستگی کی تفصیلات سننے کا موقع ملا تھا۔ ان تحفوں اور تحائف کی بدولت اور ان بیش قیمت جواہرات کو دیکھ کر جو نذرانہ اور پیش کش کی صورت میں بیجاپور اور گولکنڈہ سے دہلی بھیجے جاتے تھے۔ اُسے یہاں کی تہذیب کے اونچے معیار کا بھی اندازہ ہوا تھا۔ گولکنڈہ کی ہیرے کی کانیں مشہور زمانہ تھیں۔ ان کانوں سے اتنے ہیرے نکلتے تھے کہ بازار میں ہیروں کی ارزانی ہوگئی تھی۔ ایک دفعہ شاہجہاں کو خبر ملی کہ عبداللہ قطب شاہ کے یہاں ایک بڑا ہیرا ہے جس کا وزن ایک سو اسی (۱۸۰) رتی ہے۔ اس نے عبداللہ کو لکھ کر وہ ہیرا منگوا لیا۔ اور اس کی قیمت پیش کش میں محسوب کروا دی۔ شاہ جہاں شائستگی اور حسین چیزوں کا قدردان تھا۔ اس نے دکن کے حکمرانوں کی اطاعت اور ان کی پیش کش پر اکتفا کر لیا۔ اور انہیں اپنی ادبی اور فنی

زرداریات کو ترقی دینے کے لئے چھوڑ دیا۔

اورنگ زیب جب تخت نشین ہوا تو مغلیہ حکومت میں اندرونی کش مکش کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ مغرب میں سکھوں اور جنوب میں مرہٹوں کی وجہ سے بغاوت کی قوتیں پرورش پا رہی تھیں۔ اور ایک گوشہ سے جاٹ اور بندیلے بھی سر اٹھا رہے تھے۔ ست نامی فرقے سے شہنشاہ کی بد گمانی اور ان کے صفایا کی وجہ سے کچھ اور مخالفتیں بھی سر اٹھا رہی تھیں۔ راجپوت قوت پھر سے مجتمع ہونے لگی تھی شہنشاہ ان سب کے خلاف نبرد آزما تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے دکن کی دو باقی ماندہ سلطنتوں، بیجاپور اور گولکنڈہ کو بھی ختم کرنے کی ٹھان لی۔ اور بڑی جد و جہد کے بعد ان کو ختم کر دیا۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کی حکومتوں کے ختم ہونے کے بعد بھی اور شعر و سخن کا ذوق مٹ نہیں گیا۔ بلکہ اگر یہ ذوق پہلے چھوٹے تالابوں میں بند تھا، تو اس دھکے سے جس طرح پانی اچھل کر اطراف میں پھیل جاتا ہے، اردو شعر و شاعری کا ذوق بھی گولکنڈہ اور بیجاپور کے حادثوں کے بعد اطراف و اکناف میں پھیل گیا۔ کچھ شاعر جنوب کی طرف سدھوٹ کرناٹک، کرنول وغیرہ چلے گئے اور وہاں شعر و سخن کی نئی بساط بچھی لیکن شمال اور جنوب کے درمیان سیاست کی جو حدیں قائم تھیں ان کے ڈھہ جانے کے بعد، دکن اور شمال میں تہذیبی اور ادبی روایات کا تبادلہ ہونے لگا۔ عالمگیر دکن میں کافی عرصہ گذار چکے

پہنچے، اورنگ آباد تو انھوں نے اپنا مرکز بنایا تھا۔ دکن کی سلطنتوں کے سقوط کے بعد وہ وہیں رہے۔ اورنگ زیب کا بیجونا فاتح ہونے ان کے ساتھ بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی دکن آئے تھے جنہیں فارسی ادب اور شعر سے زیادہ لگاؤ تھا۔ اورنگ زیب کے قافلے میں ایک شخص جعفر علی تھا۔ جو زٹلی کے عرف یا تخلص سے زیادہ مشہور ہے۔ اسے دکن کے قیام میں اردو شاعری سے مس پیدا ہوا۔ لیکن اس کی طبیعت مزاح پسند تھی، اور اردو شاعری کو اس نے سنجیدگی سے اختیار بھی نہیں کیا تھا۔ اس لئے کچھ اردو نظمیں مزاحیہ انداز میں لکھ کر چھوڑ گیا۔

اورنگ آباد میں شہنشاہ کے قیام کے بعد سے، جہاں یہ شہر حکومت کا مرکز بنا، ادبی اور شعری ذوق کی وہ چنگاریاں جو خاک دکن میں چھپی ہوئی تھیں، ان میں سے کچھ تو شعلہ بننے کی ہوا میں اورنگ آباد پہنچ گئیں اور کچھ ادھر ادھر بکھری رہیں۔ لیکن اس زمانے کے کارناموں کے بارے میں ایک خاص بات قابل ذکر یہ ہے کہ یا تو متصوفانہ ہیں یا نیم مذہبی قصے متصوفانہ کارناموں میں قاضی محمود بحری کی "من لگن" اور ولی ویلوری کی "پنچھی باچھا" قابل ذکر ہیں۔ "پنچھی باچھا" شیخ فرید الدین عطار کی فارسی مثنوی "منطق الطیر" کا ترجمہ ہے۔ قاضی محمود بحری غزل بھی کہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایک دیوان بھی چھوڑا ہے۔ نیم مذہبی قصوں میں محمد علی عاجز کا "قصہ ملکۂ مصر" قابل ذکر ہے

یہ مختصر منظوم کہانی بہت زیادہ ادبی اہمیت نہیں رکھتی۔ تاہم بیجاپور اور گولکنڈہ کے سقوط کے بعد، اردو شاعروں کی ذہنی خستگی اور بے بسی کے احساس کا ان کارناموں سے پتہ چلتا ہے۔ پرانے زمانے میں عوام کی وفاداریاں شخصی یا خاندانی ہوتی تھیں۔ اصول کے ساتھ لگاؤ کی بہت کم مثالیں مل سکیں گی۔ اپنے حکمرانوں کے ختم ہو جانے کے بعد عوام کے ذہنوں پر جو پژمردگی چھا گئی تھی، اس کے نمائندہ دراصل یہ شاعر ہیں۔ تصوف، ناکام تمناؤں کے لئے ایک سہارا ہوسکتا ہے اور مذہبی موضوع شاعر کے لئے روحانی تسلی کا باعث ہوسکتے ہیں۔ اس زمانے میں کچھ مرثیہ نگار بھی تھے۔ جو شہدائے کربلا کے مصائب پر آنسو بہا کر دراصل اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔

اورنگ زیب اور اس کے مقربین اور امرا، اردو کے ادبی روپ سے مانوس نہیں تھے۔ اور شاید دکن کی زبان کو وہ شبہ کی نظر سے بھی دیکھتے ہوں گے۔ کیونکہ جو زبان ڈھائی تین سو برس پہلے شمال سے دکن آئی تھی۔ اُس کا ارتقا اسی سرمایہ کے ساتھ ہوا۔ حالانکہ دہلی اور اس کے اطراف و اکناف میں اپنی ہم خاندان بولیوں سے استفادہ کرنے کا اُسے موقع تھا، اس سے اُردو کے پرانے روپ میں بہت کچھ تبدیلی ہو گئی تھی۔ اورنگ زیب کی تربیت علیحدہ ادبی روایات پر ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بیجاپور کے ایک شاعر ہاشمی کی تھوڑی بہت قدردانی کی۔ لیکن یہ اس وجہ

نہیں کہ وہ شاعر تھا بلکہ اس وجہ سے کہ وہ حضرت شاہ ہاشم کا مرید تھا جن سے اورنگ زیب کو بھی عقیدت تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نصرتی اس زمانے میں زندہ تھا، اور اس نے عالمگیر کی مدح میں ایک اردو قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا۔

عالمگیر اورنگ زیب آباد میں کوئی بیس برس مقیم رہے۔ ان کے ساتھ فارسی کے کئی اچھے اچھے شاعر اور ادیب دہلی سے دکن آئے تھے ان میں نعمت خاں عالی، درگاہ قلی خاں، محمد افضل سرخوش وغیرہ قابل ذکر ہیں خود اورنگ زیب بھی اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ اور کئی ادیب اور شاعر ان سے متوسل رہے تھے۔ دکن کی ادبی فضا میں ارتعاش بلکہ دھما کے اور انتشار کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اردو کے شاعر صرف جنوب کے مختلف حصوں جیسے سدھوٹ، آرکاٹ، ویلور وغیرہ تک ہی نہیں پھیلے بلکہ اردو شاعری کا ذوق رکھنے والوں میں سے کچھ شمال بھی گئے۔ جعفر زٹلی جو شمال سے دکن آئے تھے۔ یہاں سے جاتے ہوئے اردو شاعری کا ذوق اپنے ساتھ لے لئے۔ شعراء کے علاوہ عام دلچسپی رکھنے والوں آنے جانے والوں کے ساتھ بھی اردو شاعری کی روایات دہلی پہنچیں۔ اب شمال اور جنوب کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں رہی تھی۔ آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہوا اس لئے بھی شعر و سخن کے مذاق کو پنپنے میں مدد ملی۔

اورنگ زیب کا انتقال ۱۱۱۸ھ میں ہوا۔ اور خلد آباد میں وہ

دفن ہوئے۔ اُن کے انتقال کے بعد اورنگ آباد وہ سیاسی مرکزیت باقی نہیں رہی تھی جو اُن کے زمانے میں تھی۔ پھر بھی دکن کا وہ سب سے بڑا اور سب سے اہم شہر تھا۔ صوبہ دار دکن کا وہ صدر مقام تھا۔ اس لئے اس کی سیاسی اور ادبی اہمیت اب بھی باقی تھی۔

اس عہد کا سب سے بڑا اور ہر عہد کا بڑا شاعر ولی تھا۔ اُس نے اُردو شاعری اور نتیجتہً اردو زبان کو بھی ایک معیار بخشا اور ادب اور شاعری کو ایک حقیقت بنا دیا، جو اس کی سی بلند پایہ شخصیت کے اس عبوری دور میں پیدا نہ ہونے کی صورت میں شاید پس پشت پڑ جاتی۔ وہ شہاب ثاقب تھا۔ جو اُردو ادب کے افق پر طلوع ہوا، اور اس کی روشنی جنوب سے شمال تک پہنچی۔ اُس نے اُردو غزل کا مرتبہ اتنا بلند کر دیا تھا۔ کہ فارسی لکھنے والوں کی للچائی ہوئی نظریں اس پر پڑنے لگیں شمال میں مغلیہ حکومت کے تار و پود کے بکھرنے کے باعث ایرانی شعراء کی آمد کا سلسلہ بند ہونے لگا تھا۔ اور فارسی ادب اور شاعری کا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا۔ ہندوستان کے ادیبوں کے ذہنوں میں جو خلا پیدا ہو رہا تھا۔ اس کی جگہ اردو شاعری اور خاص طور پر غزل نے لے لی۔ یہی دراصل شمال میں اُردو شاعری کی اٹھان کی بنیاد بھی ہے۔ وہ دکن میں فارسی شاعری کے مقابل کھڑی ہونا چاہتی تھی۔ لیکن دہلی میں وہ فارسی کی جانشین بنی۔ چنانچہ ابتدا میں دہلی کے فارسی گو شعراء نے ہی اس کی پرورش کی۔

دلی کی شاعری میں فکر اور فن ہر لحاظ سے ایک کشش اب بھی باقی ہے، اور ہر وقت باقی رہے گی۔ دلی کی غزل اس کی فنی تکنیک کے قطع نظر جو زیادہ تر فارسی سے مستعار لی گئی تھی۔ اپنے انداز اور اپنی نہج میں پرانی ہندی شاعری کی جانشین معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ایک غزل کے کچھ شعر یہاں دیئے جاتے ہیں ؂

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یوں آگ بجھاتی جا

اس رات اندھیری میں مت بھول پڑوں تجھ سوں
ٹک پاؤں کے جھانجھن کی جھنکار سنانی جا

مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اسکوں چھڑاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم
مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

اورنگ آباد عالمگیر کے انتقال (۱۱۱۸ھ) سے لے کر ۱۱۳۶ھ تک دکن دہلی کا ایک صوبہ بنا رہا۔ اس دوران میں کئی فارسی شاعر جو شمال سے آئے تھے، دہلی اور دوسرے مقامات کو چلے گئے۔ کچھ باقی بھی رہ گئے تھے۔ لیکن ایک اہم بات اس دوران میں یہ پیش آئی کہ دہلی میں اردو شاعری کی تحریک زور شور سے اٹھی۔ دارالسلطنت میں پچھلے چار سو برس میں فارسی نے شعر و سخن کے ذوق کو ابھارا تھا، اور اس کی تربیت کی تھی وہ

سب اُردو شاعری کی اٹھان کے کام آگیا۔ ۱۱۳۶ھ میں جب نظام الملک
نے دکن میں ایک سلطنت کا ڈول ڈالا تو دکن کی مرکزیت پھر عود کر آئی
اور اورنگ آباد پھر علم و ادب کا مرکز بن گیا۔

نظام الملک کا سارا ادبی مذاق دہلی کی فضا کا پیدا کردہ تھا،
اس میں فارسی ادب اور شاعری کے ذوق کو بڑا دخل تھا۔ وہ خود فارسی
کے اچھے شاعر تھے۔ اور دو دیوان اپنی یادگار چھوڑ گئے بعض بیانات
سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہہ لیا کرتے تھے نظام الملک
کے ساتھ آنے والے امرار اور ذی اثر لوگ بھی فارسی کا ذوق رکھتے تھے
فارسی کے ذوق کے ساتھ یہ نئی رَو جو دہلی اور شمال سے آئی اور دکن
کو اپنا وطن سمجھنے لگی تھی۔ اس کے جلو میں دار السلطنت کی تہذیب اور
شائستگی کی نئی اور عمدہ روایتیں آئیں اور نشو ونما پائی ہوئی اور زبان بھی
آئی۔ اور بہت عرصہ نہیں گذرا تھا کہ دہلی کے علاوہ دوسرے مقامات
سے اردو شاعر بھی اورنگ آباد آنے لگے۔ ان میں مولانا میر غلام آزاد
بلگرامی، عبدالجلیل واسطی بلگرامی کے علاوہ عبدالوہاب افتخار
قزلباش خاں اُمید، میر میراں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ میر عبدالولی
عزلت شمال سے آئے تھے۔ اور سورت، حیدرآباد اور دہلی میں عرصہ
تک مقیم رہے۔ میر نے "نکات الشعراء" کے لئے دکن کے شعراء کا بیشتر
مواد عزلت ہی سے اخذ کیا تھا۔ غلام قادر سامی جو استاد مانے
جاتے تھے۔ برار سے اورنگ آباد آئے تھے۔ محمد فقیہ دردمند جو اس زمانے

کے ایک اور سربرآوردہ شاعر ہیں۔ گلبرگہ کے ایک تعلقہ اودگیر میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن دہلی گئے اور مرزا مظہر جان جاناں سے تلمذ حاصل کیا۔ عارف الدین خاں عاجز کا خاندان بھی دہلی سے تعلق رکھتا تھا۔ ان شعراء کے علاوہ اور بھی بہت سے سخن سنج دہلی یا شمال سے اورنگ آباد آگئے تھے، لیکن ان کا ذہنی ربط دہلی سے برقرار تھا۔ ان کے اورنگ آباد آنے کی وجہ سے ادبی روایات میں لین دین شروع ہوا۔ دکن کے لکھنے والوں سے اردو کے کچھ شعری معیار شمال کے اہل قلم نے لئے اور اس کے بدلے میں اپنی نشو ونما پائی ہوئی زبان ان کو دی۔ اردو کی ادبی تاریخ کا یہ واقعہ نہایت اہم ہے کہ عالمگیر کے زمانے سے اور اس کے بعد بھی زبان کا مرکز بدل گیا۔ شمال والے حکمران کی حیثیت سے آئے تھے اس لئے دکن کے اردو شعراء کے لئے ان کا محاورہ اب معیار بننے لگا تھا۔ اور دکن کے لکھنے والے نئے محاورے اور اسلوب کے لئے شمال کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

اس کا اثر اس زمانے میں اورنگ آباد کے سربرآوردہ شعراء جیسے شاہ سراج غلام قادر ساجی، اور لالہ لچھمی نارائن شفیق سب پر نمایاں نظر آتا ہے۔ شفیق کو دکن آئے صرف ایک نسل گذری تھی، ان کے والد لالہ منسارام جو نظام الملک کے معتمد علیہ اور پیشکار اور فارسی کے اچھے انشاء پرداز تھے۔ نظام الملک کے ساتھ اورنگ آباد آئے تھے اس کے علاوہ شفیق مولانا میر غلام علی آزاد کے شاگرد اور معتقد تھے۔

اس طرح انہیں شمال اور اس کی تہذیبی اور ادبی روایات سے گہری وابستگی تھی۔ وہ شمال کے شعراء کے مقابلہ میں اورنگ آباد کے شعرا کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اور خود اپنے بارے میں وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ دہلی کا محاورہ استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُن کی اور عاجز کی زبان، اُن کے اورنگ آباد کے دوسرے معاصر شعراء جیسے سراج، سامی، مہربان وغیرہ سے مختلف نہیں ہے۔ اور ان سب کی زبان اُن کے دہلی کے معاصرین سے بھی بہت زیادہ مختلف نہیں ہے تاہم یہ درست ہے کہ یہ سب شاعر خواہ شمال سے آئے ہوئے ہوں یا دکن سے اٹھے ہوں ان کے محاورے میں دکن کی قدیم زبان کی ایک زیرین تہ SUBSTRATUM کا اثر کہیں کہیں نمایاں ہو جاتا ہے، جو ایک فطری بات ہے۔

سراج اس عہد میں دکن کے سب سے بڑے اُستاد تھے۔ وہ ولی کے جانشین سمجھے جاتے تھے اور غزل میں ان کا پایہ اردو کے چوٹی کے شاعروں کا ہے۔ انھوں نے ایک طویل مثنوی "بوستانِ خیال" بھی لکھی تھی۔ جو اپنے انوکھے موضوع اور اسلوب کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے ان کی چند مختصر مثنویاں بھی ہیں۔ جو متصوفانہ انداز رکھتی ہیں۔ سراج کی مثنوی "بوستانِ خیال" دکن کی قدیم مثنویوں اور شمال کی طویل اور مکمل مثنویوں کے درمیان کا ایک عبوری کارنامہ ہے۔ سراج کی غزل میں ایک رس ہے اور ان کا ایک شخصی نغمہ ہے۔ وہ عشق مجازی اور

عشق حقیقی دونوں کی لذتوں سے بہریاب تھے۔ اس لئے اُن کی غزل ن کے قلبی واردات کے نفیس نقشے پیش کرتی ہے۔ ذیل میں ان کی دو غزلوں کے منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں ؎

گر آرزو ہے تجھکو تالاب کا تماشا
کشتی میں چشم کی آ دیکھ آب کا تماشا
ہر قطرہ اشک میں ہے ظاہر جمال مہرو
پانی میں جیوں عیاں ہے مہتاب کا تماشا
تجھ ہجر کی اگن میں ہے اب سراج بے کل
آتش میں دیکھ آکے سیماب کا تماشا

کیا سبب وہ یوسف گل پیرہن آیا نہیں
مصر میں یعقوب کا نور نظر آیا نہیں
ہجر کی آتش میں جلتا ہوں ولیکن جاں بوجھ
کیوں بجھانے کوں میرے دل کی لگن آیا نہیں

غلام قادر ساؔئی اور عبدالقادر مہرباںؔ بھی اساتذہ کا رتبہ رکھتے تھے ساؔئی غزل؛ چھی کہتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک مثنوی "قمر سرو شمشاد" بھی لکھی تھی۔ وہ برہان پور سے اورنگ آباد آئے تھے۔ مہربانؔ فارسی اور اردو دونوں میں لکھتے تھے۔ انہیں ہندی کبت سے زیادہ دلچسپی تھی، چنانچہ کبیشوروں کا ایک تذکرہ بھی انہوں نے لکھا تھا۔

لالہ لچھمی نارائن شفیق غزل اور مثنوی دونوں کے اُستاد تھے ان کی مثنوی "تصویر جاناں" اپنے موضوع کی ندرت کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے۔ یہ مثنوی سراپا کی خاطر لکھی گئی تھی۔ جس میں ایک خیالی محبوب کی قلمی تصویر قصے کے پیرایہ میں پیش کی گئی ہے۔ شفیق فارسی میں کئی تاریخوں اور تذکروں کے مصنف ہیں۔ ان میں سے ایک تذکرہ "چمنستان شعراء" اردو شاعروں کے حالات پر لکھا گیا ہے

زوال آمادہ اجزار

بظاہر یہ ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ سیاسی اور سماجی ماحول جس نے دہلی میں اردو شاعری کو نشو ونما دیا، جب زوال پذیر ہونے لگا تو اردو شاعری فروغ پانے لگی۔ لیکن اس میں کوئی تضاد کی بات نہیں۔ جب مغلیہ حکومت اور سیاست کے تار و پود بکھرنے لگے، تو فارسی شاعری کا ذوق جو در اصل ابتدائی دور کے مغلوں اور ترکوں کے معاشرہ کی شائستگی اور تہذیب کا ایک اہم جز تھا ماند پڑنے لگا۔ اس کے مقابلے میں وہ عناصر جنہوں نے اردو کو نشو ونما دیا تھا، قوت پکڑنے لگے۔ وہ مسلمان اور وہ عرب، ایرانی، افغان اور ترک یا مغل جو اپنی "کشتیاں جلاکر" ہند میں آچکے تھے اور یہیں کے ہو رہے تھے اور ہند کے لاکھوں عوام جو شہر دل

سے وابستہ تھے یا اس زمانے کے ترقی پسند عناصر کے ساتھ میل جول رکھتے تھے، اس زبان کو اپنا بیش بہا اثاثہ سمجھنے لگے تھے، اور اس کے ساتھ انہوں نے اپنی قسمتوں کو وابستہ کر دیا تھا۔ انہوں نے اگلے ادوار میں فارسی کا دامن تھامنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ ایرانی بن کر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے کہ معمولی پڑھا لکھا ایرانی بھی ان کی زبان پر چوٹ کر سکتا تھا۔ ایرانیوں کے لئے یہ ایک مفید حاصل بن گیا تھا، چنانچہ زبان کے بل بوتے پر مغلیہ عہد کے سماج میں ایک امارتی طبقہ قائم ہو گیا تھا۔ فارسی کے شاعروں کی آؤ بھگت ہوتی اور ان میں سے کسی کا منہ اشرفیوں سے بھرا جاتا تو کسی کو زر میں تولا جاتا۔

اس پس منظر میں ہندوستانیوں کا جذبۂ خود داری اور حمیت ابھرا۔ انہوں نے اردو کا دامن تھاما اور اس کے سہارے ابھرنے اور اسے ابھارنے کی کوشش شروع کی۔ تا آنکہ وہ ہندی، ہندوی ریختہ سے اوپر اٹھائی گئی اور مغل حکمراں بھی عوامی رجحان کے دباؤ سے بچ نہ سکے۔ وہ بھی اس زبان کو پڑھنے اور اس میں لکھنے لگے۔ اور اس نے زبان اردوئے معلیٰ اور شاہوں کی زبان کا رتبہ حاصل کر لیا۔

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد، اس کے تینوں لڑکوں معظم، اعظم، اور کام بخش میں تخت کے لئے کشمکش شروع ہوئی، اورنگ زیب کی

وصیت یہ تھی کہ تینوں بیٹے سلطنت کو آپس میں تقسیم کر لیں۔ لیکن ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ ساری مملکت اسی کے زیر نگین رہے۔ جنگ نے معظم کے حق میں فیصلہ کیا۔ اور وہ ۱۷۰۷ء میں شاہ عالم اول کے لقب سے دہلی کے تخت پر متمکن ہوا۔ شاہ عالم پڑھا لکھا بادشاہ تھا، اور علماء کی قدر بھی کرتا تھا۔ وہ حافظ قرآن تھا، اور شاعری سے بھی اُسے مس تھا۔ اُس سے کچھ فارسی کلام بھی منسوب ہے۔ اورنگ زیب کے عہد کے علماء اور شعراء میں نعمت خاں عالی کے علاوہ مرزا مبارک اللہ خاں واضح، مرزا سید حسین خالص، قزلباش خاں اسد جو فارسی کے علاوہ اُردو میں بھی کہتے تھے اُس زمانے میں موجود تھے۔ بندرابن داس شاہ عالم کے دربار کا مورخ تھا جس نے "لب التواریخ" لکھی جگ جیون داس وقائع نگاری کی خدمت پر مامور تھا۔ "منتخب التواریخ" اسی کی لکھی ہوئی ہے۔

شاہ عالم سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک گیارہ حکمران گذرے اور کوئی ایک سو پچاس برس حکومت کی۔ شاہ عالم کا جانشین جہاندار شاہ ہوا۔ لیکن وہ ایک برس سے زیادہ حکومت نہ کر سکا۔ اُسے امور سلطنت سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ اور سارا وقت عیش و عشرت میں گذارتا تھا۔ اُسے ایک ڈومنی، لال کنور سے محبت تھی، جسے امتیاز محل کا خطاب دے کر محل میں ڈال لیا تھا۔ لال کنور کے اثر سے ڈوم ڈھاری سلطنت کے معاملات پر چھا گئے تھے۔ اُن کے اثر کا اندازہ ایک واقعہ

سے ہو سکتا ہے جو نظام الملک کے ساتھ پیش آیا۔ وہ ایک دن کسی زیارت کے لئے جا رہے تھے۔ راستے میں لال کنور کی دوگانہ زہرہ ہاتھی پر سوار قلعہ کو جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ بڑا لاؤ لشکر تھا۔ جب اس کے جلوسیوں نے نظام الملک کے آدمیوں کو رستے سے ہٹ جانے کے لئے کہا تو اس پر نظام الملک کے خدمتگار بھڑکے لیکن نظام الملک معاملہ فہم انسان تھے۔ انھوں نے اپنے خادموں کو حکم دیا کہ سڑک کے کنارے ہٹ کر کھڑے ہو جائیں۔ اتنے میں زہرہ کا ہاتھی ان کے پاس سے گذرا۔ زہرہ نے اپنے لوگوں سے پوچھا۔ یہ کون ہیں۔ جب اسے معلوم ہوا کہ یہ نظام الملک ہیں تو قریب آکر اس نے کہا "چیں قلیچ خاں پسر کور توئی؟" یہ سن کر نظام الملک کو بھی برا معلوم ہوا۔ انہوں نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ زہرہ کے جلوسیوں پر ٹوٹ پڑے۔ اور انہیں مار کر بھگا دیا۔ زہرہ خود داویلا مچاتی۔ پاپیادہ قلعہ کو چلی گئی۔ اور نظام الملک کی شکایت اس نے بادشاہ سے کی۔ نظام الملک کو اس کا علم تھا کہ بادشاہ لال کنور اور اس کے حاشئے کے لوگوں کے کتنے اثر میں ہے۔ غصے کی حالت میں انہوں نے اپنے آدمیوں سے زہرہ اور اس کے حواریوں کی خبر لینے کے لئے کہہ تو دیا، لیکن بعد میں انہیں خیال آیا کہ کہیں لال کنور ان کے خلاف بادشاہ کے کان بھر کے کوئی نقصان نہ پہنچائے، اس لئے وہ ذوالفقار علی خاں کے پاس گئے اور زہرہ کے ساتھیوں کی ان ناہنجار

حرکتوں کا تذکرہ کیا جو ان کے ساتھ پیش آئی تھیں۔ ذوالفقار علی خاں کا بادشاہ پر بڑا اثر تھا اور واقعہ یہ ہے کہ جہاندار شاہ کی تخت نشینی، انہیں کی مدد سے عمل میں آئی تھی۔ لیکن وہ بھی لال کنور اور اس کے ساتھی ڈوم دھاڑیوں کی حرکات ناشائستہ سے نالاں تھے۔ انہوں نے نظام الملک کو اطمینان دلایا کہ وہ بادشاہ سے ان لوگوں کی شکایت کریں گے۔ اس طرح سے ایک ناخوشگوار معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

جہاندار شاہ کے بعد فرخ سیر ۱۷۱۳ء میں تخت پر بیٹھا۔ اور اس نے چھ سات سال تک حکومت کی۔ فرخ سیر کے دربار میں قابل سیاست دان جیسے قمرالدین خاں نظام الملک، امیرالامرا سید حسین علی خاں، قطب الملک عبداللہ، میر جملہ، اکٹھے ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ تو بادشاہ کی کمزوری کی وجہ سے اور کچھ ان امیروں کی خود غرضیوں کی وجہ سے کوئی صورت ان کے آپس میں مل جل کر سلطنت کی ترقی کے لئے کام کرنے کی نہیں نکل سکی۔ بلکہ وہ پوری قوت کے ساتھ مخالف سمتوں کی طرف بڑھتے رہے۔ جس کی وجہ سے ایک کشمکش برپا تھی۔

فرخ سیر کی تعلیم و تربیت اچھی ہوئی تھی۔ وہ قرآن کا حافظ تھا۔ سیرت اور کردار کا وہ زور اور طبیعت میں وہ تدبر اس میں مفقود تھا جس کی وجہ سے اس کے اسلاف نے ہند میں ایک نہایت خوشحال سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ فرخ سیر کو اہم علمی اور ملکی معاملات سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی، اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے دربار کے رنگ

نے! عز نواز کبیشر نے "شکنتلا" ناٹک کا ترجمہ اس زمانے کی ہندی میں کیا تھا۔ اس کے دربار میں ایسے علماء اور فضلاء موجود تھے۔ جو روایتاً بادشاہ سے وابستہ رہا کرتے تھے۔ ان میں عبدالجلیل واسطی بلگرامی وغیرہ کے نام لے جا سکتے ہیں لیکن فرخ سیر کو علم و ادب سے لگاؤ نہیں تھا بلکہ اس کے دربار سے ان علماء کا لگاؤ روایتی تھا۔ جو کچھ کارنامے فارسی میں لکھے گئے وہ دراصل بادشاہ کی ہمت افزائی سے زیادہ، خود ان عالموں کی دلچسپی کے باعث انجام پائے۔

فرخ سیر کا جانشین محمد شاہ ہوا۔ محمد شاہ عام طور پر "رنگیلا" مشہور ہے۔ اس بادشاہ کا عہد بہت پُر آشوب عہد تھا۔ اس کی حکومت کی کمزوری اور تدبر کے افلاس نے، نادر شاہ کے ٹڈی دل کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ نظام الملک قمرالدین خاں کی سعی سفارش سے معاملہ کچھ رو براہ ہو گیا تھا۔ اور نادر مہمان کے طور پر قلعے میں آ کر رہ گیا تھا کہ بد معاشوں نے قلعے میں اس کے قتل ہونے کی خبر اڑا دی۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ محمد شاہ کے سپاہیوں کو قتل کرنے کے لئے چلے تھے اور زنگ خوردہ ہتھیاروں سے اس کے سپاہیوں کو قتل کرنے کے لئے چلے تھے کہ نادر نے غیض میں آکر قتل عام کا حکم دے دیا۔ کتنی خلق اللہ اور کتنے شائستہ لوگ اس قتل عام میں تلوار کے گھاٹ اتارے گئے، اس کا حساب لگانا آسان نہیں، کہتے ہیں نظام الملک نے پھر سفارش کی اور نادر کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ فارسی شعر پڑھا ؎

کسے نماید کہ زیر نگاہ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را دبارہ کشی

یعنی اب آپ کی نگاہ ناز کا مقتول بننے کے لئے کوئی باقی نہیں رہا۔ اب صرف یہ صورت باقی رہ گئی ہے کہ آپ خلق کو دوبارہ زندہ کریں اور قتل کریں۔

اس پر نادر شاہ نے مسکرا کر کہا۔

"بہ ریش سفید بخشیدم"

یعنی تیری سفید داڑھی کا خیال کر کے معاف کر رہا ہوں۔ اس کے بعد قتل عام کو موقوف کرنے کا حکم جاری ہوا۔ نادر شاہ جاتے ہوئے مملکت کا تقریباً سارا خزانہ اپنے ساتھ لیتا گیا۔

اس نئی آفت نے محمد شاہ کی حکومت کو اتنا کمزور کر دیا کہ اس کے بادشاہ گر سید بھائی سید عبداللہ قطب الملک جو الہ آباد کا گورنر تھا، اور سید حسین علی جو پٹنہ کا نائب السلطنت تھا دونوں سلطنت کے سیاہ و سفید پر قابض ہو گئے۔ اور بادشاہ کو اپنی مرضی کے مطابق تخت پر بٹھانے اور تخت سے اتارنے لگے سید عبداللہ وزیر اور سید حسین علی سپہ سالار افواج بنا دیا گیا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کا قلع قمع بالآخر نظام الملک نے کیا جو خود، دکن کی صوبہ داری کو غنیمت جان کر دار السلطنت سے چلے گئے تھے۔

محمد شاہ کے زمانے میں بھی فارسی کے اچھے عالم اور شاعر موجود

رہے ۔ ان میں قزلباش خاں امید، فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے ۔ مرزا عبدالقادر بیدل، جو غالب کے روحانی اُستاد تھے سلیمان قلی خاں وداد، علی قلی ندیم، میر شمس الدین فقیر، سراج الدین علی خاں آرزو سب فارسی کے عالم تھے، لیکن انہوں نے اردو میں بھی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ شیخ سعداللہ گلشن محمد شاہ کے عہد کے سر برآوردہ روحانی بزرگ تھے جن سے خلق خدا فیض یاب ہو رہی تھی ۔

ولی اسی زمانے میں دہلی آئے تھے ۔ اور ان کے کلام کی بڑی قدر ہوئی تھی ۔ ولی کی ملاقات شاہ سعداللہ گلشن سے بھی ہوئی۔ شاہ صاحب کے روحانی کمالات کے ولی بڑے معتقد ہو گئے۔ ولی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ شمال ہند میں تو وہ مشعل ہدایت ہی بن کر آئے۔ دہلی کے شعراء نے جب ان کا اردو کلام سنا تو انہیں ایسا لگا کہ گویا یہ تو انہیں کے دل کی بات ہے، اسی لئے اردو میں شعر کہنے کی تحریک وہاں آگ کی طرح پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے دہلی اور اطراف و اکناف میں اردو شاعری کی دھوم مچ گئی ۔ محمد شاہ خود اردو میں شعر کہنے لگے۔ چنانچہ ان کے ایک دو شعر یہ ہیں ؎

خوف سے یار کے یاراں! ڈسے لرزاں نہ کرو
زلف کا نام نہ لو اور پریشاں نہ کرو

پیری میں ہیں نہ کس طرح کروں سیر جہاں کی   دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گذر ہی کا

محمد شاہ موسیقی کا بھی دلدادہ تھا۔ اس کے عہد کے مشہور موسیقار سوارنگ نے خیال کو بہت ترقی دی تھی اس کی ایک راگنی کے بول ہیں۔

محمد شاہ تم سدا رنگیلے مینہا برسے بوند بوند

خاں آرزو، قزلباش خاں امید، امیر خاں انجام، جعفر علی خاں اور آنند رام مخلص اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ آرزو فارسی کے بڑے عالم تھے۔ اور فارسی کے اہم کارناموں کے مصنف ہیں۔ فارسی میں ان کی استادی کی شہرت اور شاعری کے ذوق کے باعث عوامی زبان اردو میں لکھنا وہ بہت بڑے کمال کی بات نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم کبھی کبھی وہ اردو میں شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے کچھ شعر مل جاتے ہیں۔ ذیل میں اُن کے ایک دو شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ ؎

آتا ہے ہر سحر اٹھ تیری برابری کو\
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

اس تند خو صنم سے جب سے لگا ہوا دل ملنے\
ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو

آنند رام مخلص کا خاندان سیالکوٹ کا رہنے والا تھا۔ مخلص فارسی میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا۔ مرزا عبدالقادر بیدل سے اسے تلمذ حاصل تھا۔ محمد شاہ کے زمانے میں وہ اعتماد الدولہ قمرالدین اور اس کے چچازاد بھائی سیف الدولہ صوبہ دار لاہور کا وکیل دربار مقرر ہوا تھا۔ اس کو رائے رایاں کا خطاب بھی ملا تھا۔ دہلی میں سراج الدین علی خاں آرزو،

محمد قلی خاں، معنی باب خاں، فتح سنگھ وغیرہ سے اس کی بڑی دوستی تھی اور یہ سب مل کر بیٹھتے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ خاں آرزو سے اس کو بہت محبت تھی، چنانچہ اسی کی سعی سفارش سے خاں مذکور کو دربار سے خطاب، منصب اور جاگیر عطا ہوئی تھی۔ انند رام مخلص نے فارسی میں کئی بلند پایہ تصانیف چھوڑی ہیں۔ وہ فارسی کا اچھا شاعر بھی تھا۔ خاں آرزو کی طرح اردو میں بھی شعر کہہ لیا کرتا تھا۔ اس کے کچھ شعر یہ ہیں ؎

یوں پکارے ہے کھڑا گلشن میں سرو از بیکسی
پہنچیو قمری کہ کیا آزاد جاتی ہے بہار
پھول پہ نرگس کہ گویا دانۂ شبنم نہیں
عاشقوں کے حال پر انکھیاں پھراتی ہے بہار

دھوم آونے کی کس کے گلزار میں پڑی ہے
ہار رگجے کا باکہ نرگس لئے کھڑی ہے

محمد شاہ کے عہد کا ایک اہم علمی کارنامہ، ہئیت کی ترقی تھی۔ محمد شاہی دربار کے امیر، راجہ جے سنگھ کو اس فن سے لگاؤ تھا۔ نظم و نسق کی اہم ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے بھی اپنے علمی مشاغل کے لئے اس نے مواقع نکال لئے تھے۔ چنانچہ دہلی میں اس نے ایک رصد گاہ تعمیر کرائی تھی۔ دہلی کی رصد گاہ کے نتائج کو جانچنے کے

مقصد سے کئی اور مقامات پر اسی طرح کی رصد گاہیں بنوائی گئیں۔ چنانچہ جے پور، بنارس، اجین، اور متھرا میں بھی راجہ کے حکم سے رصد گاہیں بنیں۔

محمد شاہ کے بعد کہنے کو تو مغلیہ سلطنت ایک سو برس اور قائم رہی لیکن جیسا کہ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے دہلی کی حکومت ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ تھی جس کے پانچ اور سجادہ نشین باری باری سے ہوئے۔ یہ احمد شاہ، عالمگیر ثانی، شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ثانی تھے۔ یہ سب کے سب گویا اپنے موسوم اول کے ناکارہ نقش ثانی تھے۔ جن سے گرتی ہوئی سلطنت کو سنبھالنا ممکن نہ ہوسکا۔ محمد شاہ کے عہد ہی میں اودھ اور دکن کے خطے دہلی سے کٹ کر علیحدہ ہو گئے تھے۔ ان علاقوں نے کوئی ڈیڑھ سو برس تک اس تہذیب اور شائستگی کی حفاظت کی اور اس کو ترقی دینے کی بھی کوشش کی جس کی نشوونما مغلوں کی طویل عہد جہاں بانی میں ہوئی تھی۔

محمد شاہ کے جانشین احمد شاہ نے ۱۷۴۸ء سے لے کر ۱۷۵۴ء تک کل سات برس حکومت کی۔ اس کی متزلزل حکومت پر روہیلوں کی بغاوت ایک اور کاری ضرب تھی جسے اودھ کے صوبہ دار صفدر جنگ نے مرہٹوں کی مدد سے فرو کیا۔ لیکن اس کا نتیجہ اور بھی برا ہوا۔ خود مرہٹوں کے ذہن میں ہندوستان پر حکومت کرنے کا خیال ابھرا، اور بڑی بھاری فوج کے ساتھ، انہوں نے لال قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ بادشاہ جو پہلے ہی سے

شاہ شطرنج تھا۔ قلعے میں گھر گیا۔ اس موقع پر احمد شاہ ابدالی ہندوستان آیا۔ اور مرہٹوں سے مقابلہ کر کے انہیں پسپا کیا۔ اس سے قلعہ کی آبرو تو بظاہر بچ گئی، لیکن دہلی پر تازہ تباہی نازل ہوئی۔ سماجی اور علمی زندگی غتہ ہو گئی۔ اور نظم و نسق کے کل پرزے بکھرنے لگے۔ جو امیر سلطنت کے ستون سمجھے جاتے تھے، وہ سلطنت کو ڈھانے کی فکر میں لگ گئے۔ ہر ایک کے دماغ میں یہی سودا سما گیا کہ پس پردہ خود بلا شرکت غیرے حکومت کرے۔ لیکن یہ محض خیال تھا، ایسا کرنے کی کسی میں قوت نہیں تھی۔ ایسی افراتفری کے زمانے میں، جس طرح کے سماجی فتنے سر اٹھا سکتے ہیں وہ سب ابھر رہے تھے چنانچہ دہلی کے گلی کوچے جو کبھی فارسی شعراء کے نغموں سے گونجتے تھے اب شیعہ اور سنی اور مغل اور ایرانی مناقشات اور الزامات کے شور و شغب سے گونج اٹھے۔

اس دور پر خلل میں بھی کبھی جب ذہنی سکون کے لمحات آتے شعر و سخن کی محفلیں گرم ہوتیں۔ ان محفلوں میں فارسی زبان کے شعراء اپنے تلامذہ کے ساتھ جو اردو میں لکھنے لگے تھے شرکت کرتے اور داد سخن دیتے۔

یہ در اصل فارسی سے اردو کی طرف عبور کا دور ہے، جس میں، آرزو، برہمن، فائز، مضمون، ناجی یکرنگ، اور فغاں نمایاں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اردو کلام کم یا زیادہ مل جاتا ہے۔ ان شعراء کی

دلچسپی کا محور غزل تھی۔ لیکن فائز اور بعض دوسرے شعراء نے اپنے اطراف کی دلچسپی کی چیزوں کے بارے میں بھی کچھ نظمیں چھوڑی ہیں۔ فائز دہلی کے ابتدائی دور کے ان شعراء میں سے ہیں، جن کے کلام پر ولی کا اثر بہت نمایاں ہے۔ کئی غزلیں انھوں نے ولی کی زمینوں لکھی ہیں۔ غزل سے ہٹ کر فائز نے اپنے زمانے کی تقریبوں میں سے ہولی پر ایک مختصر مثنوی لکھی ہے، اُن کی ایک اور مثنوی پنگھٹ پر حسین لڑکیوں کے ہجوم سے متعلق ہے۔ ایک مثنوی درگاہ قطب کی ایک حسین بھنگرن پر ہے۔ کچھ رقعے بھی انھوں نے نظم میں لکھے ہیں۔ کاچن، تنبولن، بہتہ کے میلے، جوگن وغیرہ پر بھی فائز کی نظمیں ملتی ہیں۔

ولی نے اپنی ایک مثنوی میں دریائے تپتی یا تاپتی میں نہان یعنی اشنان کی تفصیلات بڑے دلچسپ انداز میں لکھی تھیں۔ فائز نے "تعریف نہاں نگنبود" کے عنوان سے بالکل اسی طرح کی ایک مختصر مثنوی لکھی ہے۔ جس کے کچھ شعر ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں ؎

ندی پر نمایاں ہیں سبھی بدن
جیوں روپے کی تھالی میں ڈھلتے بدن
کھڑے گھاٹ پر ہیں سبھی سیمبرا
جھمل ان کے مُکھ سے سورج اور چندر
ترے دل کو پانی ہر ایک سندری
نظر کرتی پانی اوپر چندنی

میرے دل کو آتا ہے اُس سے حذر
کہ اُس کو نہ لاگے سُرج کی نظر
ہے اندر کی مانو سبھا جلوہ گر
کہ ہر نار دستی ہے رمبھا سوں در

فغاںؔ، جس کا نام اشرف علی خاں تھا، احمد شاہ کے رضاعی بھائی اور ندیم خاص تھے ان کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی وجہ سے احمد شاہ انہیں بہت چاہتا تھا۔ اور ظریف الملک کوکلتاش بہادر کا خطاب بھی انہیں دیا تھا جب احمد شاہ کو معزول کر دیا گیا، تو فغاںؔ نے ایک مختصر درد انگیز مثنوی لکھی تھی۔ لیکن اس ابتدائی زمانے میں دہلی کے شعراء میں مثنوی اور خاص طور پر ویسی طویل اور مکمل مثنوی جیسی کہ دکن کے شعراء لکھتے تھے مقبول نہیں تھی بلکہ چھوٹی چھوٹی مثنویاں، جیسی کہ ولیؔ لکھ گئے ہیں، تھوڑی بہت مقبولیت رکھتی تھیں۔ اصل میں غزل جس طرح ولیؔ کے یاس مقبول تھی دہلی کے شعراء میں بہت مقبول رہی۔ فائزؔ، مضمونؔ، ناجیؔ، یک رنگ وغیرہ کا مشقی دور ابھی ختم بھی نہیں ہوا تھا، کہ دہلی کی خاک سے مظہر جان جاں، آبروؔ، حاتمؔ اور تاباںؔ اٹھے، جنہوں نے غزل کو بہت ترقی دی۔ تا آں کہ میرؔا اور سوداؔ نے غزل اور شاعری کی دوسری صفوں کو عروج تک پہنچا دیا۔

احمد شاہ میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ مرکز گریز قوتوں کا سدباب کرکے سلطنت کو زوال سے بچا سکتا۔ چنانچہ اس کے عہد میں مغلوں کی وسیع سلطنت سکڑ کر دہلی اور اس کے نواح تک محدود ہوگئی تھی۔ احمد شاہ کو عماد الملک نے ۱۷۵۴ء معزول کرکے اندھا کردیا۔ اور جہاندار شاہ کو جو اب تک قید بھگت رہا تھا۔ تخت پر بٹھایا۔ جہاندار شاہ نے عالمگیر ثانی کا لقب اختیار کیا۔ لیکن اس کے لئے تخت اور قید میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ جب اُس نے ذرا ہل چل کی تو اپنے مقتدر وزیر کے غیض و غضب کا شکار ہو گیا۔ اور اس کے اشارے سے قتل کر دیا گیا۔ عالمگیر ثانی کا بیٹا، شاہ عالم ثانی جب تخت نشین ہوا اور تو وہ حکومت کی قید سے گھبرا کر مارا مارا پھرتا رہا اور بالآخر انگریزوں کی پناہ ڈھونڈ لی اور انہیں سلطنت کے معاملات میں دخیل ہونے کا موقع مل گیا۔ شاہ عالم ثانی کا بیٹا اکبر ثانی ۱۸۳۰ء تک دہلی کا نام نہاد بادشاہ رہا۔ اس کے بعد بہادر شاہ ثانی ۱۸۵۷ء تک برائے نام بادشاہت کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے باغیوں کو مدد دینے کے الزام میں اُن پہ مقدمہ چلا کر رنگون بھیج دیا۔ جہاں وہ پانچ سال تک کس مپرسی کی حالت میں زندہ رہے اور ۱۸۶۲ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مغلوں کے عہد میں سماج کا ڈھڑا جاگیردارانہ نظام پہ اٹھا تھا۔

جس کا اقتدار اعلیٰ خود بادشاہ کی ذات تھی۔ اس کے بعد امراء تھے جن کو زندگی کی وہ آسائشیں میسر تھیں جو عوام کے حصے میں نہیں آئی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اونچے طبقے اور عوام کے معیار زندگی میں بہت فصل تھا۔ عوام اور محنت کش، ان آسائشوں کا خیال تک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جن سے امراء مستفید ہو رہے تھے۔ امراء کی فضول خرچی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اُن کو اپنے بعد اپنی دولت اور جائداد کے بحق سرکار رجوع ہونے کا ڈر لگا ہوا تھا۔ ایک تسلّی کی بات یہ تھی کہ دولت ملک میں صرف ہوتی تھی۔ اس کے ملک کے باہر کھینچ کر جانے کا موقع نہیں تھا۔ جب تک مغلیہ امیر اپنی خدمات دیانت داری سے انجام دیتے رہے۔ انہوں نے سلطنت کے کاروبار کو بہت ترقی دی لیکن اورنگ زیب کے بعد سے کچھ تو بادشاہ کی نااہلی کے سبب سے اور کچھ امیروں کی خود غرضیوں کے باعث، یہ سارا نظام روبہ تنزل ہونے لگا تھا۔

امیر اور غریب طبقوں کے بیچ میں ایک اوسط طبقہ بھی تھا، جس میں حکومت کے چھوٹے عہدہ دار، متوسط تاجر اور بیوپاری شامل تھے۔ یہ لوگ کفایت شعارانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ان میں اخلاقی اور دوسری برائیاں بہت کم تھیں۔

ہندوستان کے لوگوں میں خاصی تعداد اوہام پرستوں کی بھی تھی۔

نجوم پر بھی اکثر لوگ عقیدہ رکھتے تھے۔ عام آدمی فوق الفطرت باتوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ اٹھارویں صدی میں ہندوستان کی سماجی زندگی پر عام طور پر مردنی چھارہی تھی، اس لئے ادب اور فن کے بلند پایہ کارنامے اس زمانے میں پیدا نہیں ہو سکے۔

ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ملک دو بڑے طبقوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑی یگانگت تھی۔ اپنے اپنے مذہبی عقائد اور وظائف علیحدہ رکھتے ہوئے بھی، انہوں نے مشترکہ سماجی زندگی کو ترقی دینے کے کافی مواقع نکال لئے تھے۔ عیدوں اور تہواروں میں سے بعض تو علیحدہ علیحدہ منائے جاتے تھے، لیکن کئی تقریبیں ایسی بھی تھیں جو قومی تقریبوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان میں ہولی، نوروزہ، بسنت، محرم، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہی وہ مشترکہ دلچسپیاں تھیں جو علاقائی زبانوں کی کثرت رکھنے والے بھارت میں ایک مشترکہ زبان کی نشوونما میں معاون ہوئیں۔

تعلیم کا وہ نظام جو آج کل رائج ہے، اس زمانے میں نہیں تھا، تاہم اچھے حکمراں اور ان کے متوسلین اور امرا، تعلیم و تدریس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اکثر علماء اور پنڈت بھی انفرادی طور پر درس و تدریس کے مرکز بن گئے تھے جو زیادہ تر خانقاہوں، مٹھوں اور مسجدوں سے وابستہ ہوتے تھے۔ ابتدائی نصاب محدود تھا۔ لیکن انفرادی طلباء، اونچے پایہ کی کتابیں پڑھتے اور بڑی گہری نظر سے ان کی تکمیل کرتے تھے۔

اکبر نے ہندی کا ادب کی بڑی سرپرستی کی۔ یہاں تک کہ اس کا پایہ بہت اونچا ہو گیا۔ کئی بلند پایہ شاعر اس زمانے میں پیدا ہوئے۔

اس سماجی پس منظر میں دہلی میں اُردو شاعری کو ترقی ہونے لگی لیکن ادب اس زمانے میں خواص کی ملک تھی، اس لئے سوائے چند شاعروں کے اکثر شاعر مرفہ الحال لوگوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے رہے۔ ابتدائی مرحلوں میں فارسی کی روایات میں پلے ہوئے شاعروں کے لئے اُردو میں لکھنا غالباً معیار سے نیچے اُترنا دکھائی دیتا تھا۔ اسی لئے ابتدائی دور کے شعراء کے کلام میں کچھ استہزا اور تمسخر کا شائبہ بھی نظر آتا ہے اور ان کے کارناموں سے یہ بھی نہیں ظاہر ہوتا کہ ان کے سامنے کوئی بہت اونچا معیار یا مقصد تھا۔ ابتدائی دور کے شعراء کے ظریفانہ انداز پر طنز اور مزاح کا دھوکہ بھی ہو سکتا ہے، جو بڑی مستحسن چیز ہے۔ لیکن مزاح اور استہزا میں فرق ہے اصل میں فارسی میں کہنے والوں کے لئے اُردو کی طرف اسی احساس کے ساتھ قدم بڑھانے میں سہولت تھی۔ اُن کے لئے یہ بہت بڑے کمال کی بات نہیں تھی۔ سہولت کی یہ صورت اس طرح بھی پیدا ہو گئی تھی کہ اُردو کے شعراء نے فارسی ہی کے فنی سلنچے اختیار کر لئے تھے۔ جن میں بحر یعنی وزن، قافیہ کے علاوہ تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور ایک حد تک لفظیات اور ترکیبیں بھی شامل ہیں۔ اس سے اردو شاعری کو ادبی معیاروں تک پہنچنے میں مدد ضرور ملی اور اس ماحول میں

جس میں فارسی شاعری کا ذوق رچا ہوا تھا، شاعری کا یہ انداز بہت جلد مقبول ہوگیا۔

اردو شعراء، فائز، شرف الدین مضمون، محمد شاکر ناجی، غلام مصطفےٰ یک رنگ، اشرف علی خاں فغاں اور مرزا مظہر جان جاناں میں سے ہر ایک نے غزل پر طبع آزمائی کی۔ بعضوں نے ایک آدھ مختصر مثنوی، مخمس وغیرہ بھی لکھ لیا۔ لیکن ان کی عام دلچسپی کا مرکز غزل بھی مضمون حضرت گنج شکر کی اولاد ہیں تھے ان کی بڑی عمر ہو چکی تھی۔ جب دہلی میں اردو شاعری کا چرچا ہوا۔ ان کو بھی اردو شاعری کا اتنا ذوق پیدا ہوگیا۔ کہ وہ اپنی بڑی عمر کا خیال کئے بغیر خان آرزو کے پاس شعر لے کر اصلاح کے لئے گئے۔ حالانکہ خان آرزو عمر میں ان سے چھوٹے تھے۔ یک رنگ کا بھی یہی حال تھا۔ وہ کہن سالی میں اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور مرزا مظہر کو اپنا کلام دکھاتے تھے ناجی، محمد شاہ کی حکومت کے رکن رکین، نواب عمدۃ الملک، امیر خاں انجام کے نعمت خانہ کے داروغہ تھے۔ انجام بھی اردو میں شعر کہتے تھے۔ ان شعراء کا کچھ کلام ذیل میں درج کیا جاتا ہے ؎

کیا کہوں انجام میں اس عشق کے آغاز کو
دوستداروں کو محبت دشمن جانی ہوئی

ہنسی تیری پیار سے پھلجھڑی ہے
یہی غنچہ کے دل میں گلچھڑی ہے
(مضمون)

گندمی چہرے کو اپنے زلف میں پنہاں نہ کر
ہند ی سنکر مبادا شور ڈالیں کال کا
ایک دم ناجی کے تئیں آکر جلا لے پیار سے
جاں بلب ہوں اے سجن، یہ وقت نہیں ہمال کا

یک رنگ پاس اور سجن کچھ نہیں بساط
رکھتا ہوں میں دو نین کہو تو نذر کروں

اشرف علی خاں فغاں کو احمد شاہ سے توسل تھا۔ وہ ظریف طبع اور بذلہ سنج انسان تھے۔ اور جب شعر و سخن کا ذوق دہلی میں پھیلا تو وہ بھی شعر کہنے لگے۔ وہ علی قلی خاں ندیم کے شاگرد تھے۔ فغاں کی مثنوی کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے جو انہوں نے احمد شاہ کی معزولی کے بعد لکھی تھی۔ اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

جہاں میں مرا ایک دلدار تھا
اسی سے مجھے تو سروکار تھا
نہ کچھ کام تھا مجھ کو گلزار سے
نہ واقف تھا ہرگز گل و خار سے

وہی ماہ تھا اور وہی شاہ تھا
غرض کچھ ہی تھا، میرا اللہ تھا
فلک نے یکایک ستم یہ کیا
دل شاہ کو داغ حرماں دیا

شاہ مبارک آبروؔ اور شیخ ظہور الدین حاتمؔ نے اردو شاعری کو زیادہ یکسوئی کے ساتھ اختیار کیا۔ یہ دونوں بھی غزل کے اُستاد تھے آبروؔ نے "آرائش معشوق" کے نام سے ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔ محمد شاہ کی فرمائش پر جعفر خاں نے حقہ پر ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی، جو نامکمل رہ گئی تھی۔ بعد میں شاہ حاتمؔ نے اس کو مکمل کیا۔ حاتمؔ بھی عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی مصاحبت میں تھے۔ ابتدائی زندگی میں وہ رند مشرب تھے۔ لیکن بعد میں فقیری اختیار کر لی تھی۔ اور جیسا کہ آزاد لکھتے ہیں۔ بانکوں کی طرح دوپٹہ سر پر ٹیڑھا باندھتے تھے۔ راج گھاٹ کے رستے قلعے کے نیچے شاہ سلیم کا تکیہ تھا، وہاں کچھ چمن تھے، کچھ درختوں کے سائے تھے، سامنے پر فضا میدان تھا۔ یہی شاہ حاتم کا رمنا تھا۔ شام کو وہ روز یہاں آتے اور شعر و سخن کا چرچا ہوتا۔ اُن کی ایک غزل ہے۔ سہ

یار کا مجھ کو اس سبب ڈر ہے
شوخ ظالم ہے اور ستمگر ہے

دیکھ سرو چمن ترے قد کوں
خجل ہے، یا پکل ہے بے بر ہے
حق میں عاشق کے تجھ لباں کا بچن
قند ہے، نیشکر ہے، شکر ہے
مارنے کوں رقیب کے حاتم
شیر ہے، ببر ہے، دھنتر ہے

شاہ حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں، دونوں ایک ہی سال یعنی سنہ ۱۱۹۹ء میں پیدا ہوئے تھے، دونوں نے طویل عمر پائی، جان جاناں کو بھی اردو شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور اپنے زمانے کے نوجوان شعراء کو اردو میں شعر کہنے میں رہبری کی۔ ان کو جو طویل عمر نصیب ہوئی اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ زبان کو ترقی دینے میں مظہر جان جاناں اور شاہ حاتم کی مساعی خاص طور پر کارگر ہوئیں۔ ابتدا میں دکن کے شعراء کے اثر کی وجہ سے جو پرانے الفاظ اور ترکیبیں دہلی کے شعراء کے کلام میں جگہ پاگئی تھیں، انہیں شاہ حاتم نے ترک کرنا شروع کیا، چنانچہ ان کا بعد کا کلام جو قدیم الفاظ اور اسالیب سے پاک ہے، اس کو انہوں نے اپنے دیوان سے علیحدہ کرکے "دیوان نادہ" کے نام سے الگ مرتب کیا ہے۔

میر، سودا، اور درد کی شاعری میں دہلی نے اردو شاعری کی ساری

اصناف کا عروج کمال دیکھا۔ انہیں اساتذہ کی مساعی نے اردو شاعری کو ایک ادبی حقیقت بنا دیا۔

مرزا رفیع سوداؔ اسی سال پیدا ہوئے جب سال فرخ سیر کی تخت نشینی عمل میں آئی (سنہ ۱۷۱۳ء) اور میر تقی میرؔ ان کے گیارہ برس بعد سنہ ۱۷۲۴ء میں پیدا ہوئے۔

سوداؔ اور میرؔ نے محمد شاہ کے عہد میں نشو و نما پائی۔ انھوں نے نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی تباہ کاریاں دیکھی تھیں اور مغلوں کی جہاں بانی کے طویل عرصے میں نشو و نما پائی ہوئی تہذیب اور شائستگی اور معاشرہ کے تار پود بکھرتے بھی دیکھے۔ انہیں اطمینان کا زمانہ دہلی میں کبھی نصیب نہ ہو سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر و سخن کی لو جو انہیں لگی ہوئی تھی، وہ ان کی توجہ کو اس ناساعد ماحول سے ہٹانے کا ایک ذریعہ تھی۔ گو ان کی طبیعت کے میلانات الگ الگ تھے، پھر بھی ان دونوں اساتذہ نے اردو شاعری کی ساری اصناف کو اتنا بلند کیا کہ وہ رشک فارسی بن گئی تھیں۔

سوداؔ پہلے پہل سلیمان قلی خاں وداد کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ لیکن بعد میں وہ شاہ حاتم کے شاگرد ہو گئے تھے۔ شاہ حاتم ان کی استادی پر فخر کرتے تھے۔ جب سوداؔ کا انتقال ہوا شاہ حاتم زندہ تھے۔ فرمایا۔ "افسوس میرا پہلوان سخن مر گیا" جب سوداؔ کی شاعری چمکی تو کئی امراء ان کی سرپرستی کرنے لگے۔ شاہ عالم بادشاہ نے ان کی

شاعری کی بہت شہرت سُنکر انہیں بلایا اور اپنی غزل اصلاح کے لئے دینے لگے۔ بادشاہ کی طرف سے فرمائشیں بھی آتیں، جن کی وجہ سے بعض وقت سودا جزبز ہو جاتے تھے۔ آخر ایک واقعہ کی بنا پر انہوں نے بادشاہ سے قطع تعلق کر لیا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن بادشاہ نے پوچھا "مرزا کئے غزلیں روز کہہ لیتے ہو"۔ سودا نے جواب دیا: "پیرومرشد جب طبیعت لگ جاتی ہے دو چار شعر کہہ لیتا ہوں"۔ اس پر بادشاہ نے کچھ ایسی بات کہی جس سے سودا مکدر ہو کر چلے آئے۔ بادشاہ نے کئی دفعہ بلایا، اور کہلا بھیجا کہ "اگر ہماری غزلیں بناؤ تو ہم تمہیں ملک الشعراء بنا دیں گے"۔ سودا نے جواب دیا: "حضور کی ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہے کرے گا تو میرا کلام ملک الشعرا کرے گا"۔

دربار کا جانا بند ہونے کے بعد بھی سودا کو کچھ تنگی نہ ہوئی۔ کئی امراء، جیسے بسنت خاں، مہرباں خاں وغیرہ موجود تھے، وہ سودا کی قدر دانی کیا کرتے۔ لیکن نادر شاہ کے حملے کے بعد مرہٹوں کے ہنگاموں اور تلنگوں کی گڑبڑ سے وہ بے حد پریشان ہو گئے۔ اس زمانے میں دہلی کی سیاست اور سماج کی جو حالت تھی اُس پر سودا نے ایک مخمس لکھا ہے جس کے کچھ بند یہ ہیں:-

قوی ہیں ملک میں مفلس، امیر ہیں سو ضعیف
ملکے کہاں جو ہیں دیکھے ہوں انہوں سے حریف

نہ کچھ ربیع میں حاصل نہ درمیان خریف
جو عامل اب ہیں محالات پر سویوں ہیں ضعیف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار کی اول

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری
سپاہی نامقصدی سبھوں کو بیکاری
اب آگے دفتر تن کی میں کیا کہوں خواری
سوال دستخطی کو پھاڑ کر پنساری
کسی کو آ نولہ دے باندھ کر کسی کو کنول

سخن جو شہر کی ویرانی کا کروں آغاز
تو اُس کو سن کے کریں ہوش جغد کے پرواز
نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز
جو کوئی شام کو مسجد میں جا دے بہر نماز
تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغ غول

ایک قصیدہ سودا نے گھوڑے کی ہجو میں لکھا ہے جس میں ایک واقعے کی صورت میں وہ ساری خرابیاں بیان کی ہیں جو اس زمانے میں دہلی میں نہ انچ تھیں ایک قصیدہ " شہر آشوب " میں بھی سودا نے انہیں حالات کا تذکرہ کیا ہے ۔

سودا نے کئی مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں سے بعض میں قصے بیان کئے ہیں ۔ لیکن یہ مثنویاں مختصر ہیں بعض مثنویاں جس انہوں نے ہجو

لکھی ہے۔ سودا، ہجو کے استاد مانے جاتے ہیں۔ ان کی ہجو میں بڑی چبھن ہوتی ہے۔ قصیدہ کو بھی سودا نے بہت ترقی دی اور کچھ قصیدے نہایت سنگلاخ زمینوں میں لکھے ہیں۔ اُن کے کچھ قصیدے ایسے ہیں جو اساتذہ فارسی کی ٹکر کے ہیں۔ غزل کا پایہ بھی سودا نے بہت بلند کیا الفاظ کے انتخاب، چُستی بندش اور روانی میں سودا کی غزل، پچھلے سارے غزل گو اساتذہ پر سبقت رکھتی ہے۔ مرثیہ کو بھی سودا نے ترقی دی۔

دہلی کی تباہی کے بعد سودا فرخ آباد گئے جہاں نواب احمد خاں بنگش کی مصاحبت میں کچھ دن رہے۔ ان کے مرنے کے بعد آصف الدولہ کے عہد میں وہ فیض آباد چلے گئے۔

سودا کے معاصر میر کی طبیعت غزل کی شاعری کے لئے بہت موزوں تھی۔ یوں کہنے کو میر نے کچھ قصیدے، مخمسات، ترجیع بند، ترکیب بند، اور ہجویں بھی لکھی ہیں۔ لیکن وہ غزل سربرآوردہ استاد مانے جاتے ہیں۔ غزل داخلی شاعری کے لئے موزوں صنف ہے اور میر کا رجحان داخلی شاعری کی طرف زیادہ تھا۔ ان کی یاس پسند طبیعت کی وجہ سے ان کی غزل کی اثر انگیزی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ میر کی غزل کی یاس انگیزی، کچھ تو ان کے اطراف کے حالات کا نتیجہ تھی اور کچھ ان کے ذاتی حالات کا

میر ایک صوفی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اُن کے والد بڑے متقی

آدمی تھے۔ عنفوانِ شباب میں انہیں ایک رشتہ دار کی لڑکی سے محبت بھی ہو گئی تھی۔ اسی لئے غزل میں جو واردات وہ بیان کرتے ہیں، ان کی آپ بیتی کے نقوش ہوتے ہیں۔ میرؔ نے خود اس طرف ایک شعر میں اشارہ کیا ہے، کہتے ہیں ؎

شعر کے پردے میں درد دل سنایا ہے بہت
مرثیہ نے دل کے میرے بھی رلایا ہے بہت

میرؔ کا وطن آگرہ تھا۔ مرکز کی افراتفری کے زمانے میں، معاش کی فکر دامن گیر ہوئی ہے تو وہ دہلی آ گئے۔ دہلی میں کچھ عرصہ صمصام الدولہ کے یہاں ملازم رہے۔ نادر شاہ کی خوں ریزی میں نواب مارے گئے تو کچھ دن کے لئے پھر آگرہ آ گئے تھے۔ لیکن فراخی کی یہاں کوئی صورت نظر نہیں آئی اس لئے ناچار پھر دہلی چلے گئے۔ کچھ دن تکالیف اٹھانے کے بعد رعایت خاں کے مصاحب ہو گئے۔ لیکن شکر رنجی کی بنا پر رعایت خاں کی نوکری ترک کر دی اور تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے نواب بہادر مہانرائن اور ناگرمل کے یہاں ملازم رہے دہلی کی تباہی میں میر صاحب کا گھر لٹ گیا۔ تلاش معاش میں کئی جگہ گھوم پھر کر دہلی واپس آنا پڑا۔ عالمگیر ثانی کو اردو شاعری سے لگاؤ تھا۔ کبھی کبھی وہ میر صاحب کو بلواتے تھے، لیکن میر صاحب کو بادشاہ کے یہاں جانا گوارا نہ ہوا۔ آخر وہ فیض آباد جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب لکھنؤ کے لئے روانہ ہوئے تو پوری گاڑی کرنے کیلئے کرایہ پاس نہیں تھا۔

اس لیئے ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے۔ میر کی طبیعت مسلسل آفتوں کی وجہ سے ایسی اُچاٹ ہو گئی تھی کہ ان کی طبیعت کھلتی نہیں تھی۔ آزاد لکھتے ہیں، اُن کا ساتھی راستے میں اُن سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میر صاحب اس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گئے اور کہا: "صاحب قبلہ، آپ نے کرایہ دیا ہے، بیشک گاڑی میں بیٹھئے۔ مگر باتوں سے کیا تعلق؟" اس نے کہا: "حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے۔ باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے"۔ میر صاحب بگڑ کر بولے "خیر آپ کا شغل ہے میری زبان خراب ہوتی ہے۔

میر کی غزلوں کے چھ دیوان ہیں۔ ان کی مثنویوں "شعلہ عشق"، اور "دریائے عشق" میں بہت موثر قصے بیان کئے گئے ہیں۔ "معاملات عشق" ان کی آپ بیتی ہے۔ میر توضیحی شاعری یا مرقع نگاری میں بھی بڑا کمال رکھتے تھے۔ انہوں نے برسات میں گھر کی تباہی پر جو مثنویاں لکھی ہیں وہ جزئیات نگاری اور منظر کشی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

میر کی ایک غزل کے کچھ شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

کیا جانیں وہ مرغان گرفتارِ چمن کو
جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آوے

صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

اے وہ، کہ تو بیٹھا ہے سرِ راہ پہ، زنہار
کہیو جو کبھو میرؔ بلاکش ادھر آوے

مت دشت محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے

میرؔ اور سوداؔ کے معاصرین میں خواجہ میر درد کا بھی بڑا درجہ ہے درؔد کا تعلق خاندان ارشاد و ہدایت سے تھا۔ دہلی میں ان کا گھر معتقدین اور مریدین کا مرکز بنا رہتا تھا۔ دہلی کی تباہی کے بعد جب بہت سے خاندان ترک وطن کر کے اِدھر اُدھر چلے گئے تھے تب بھی درؔد دہلی ہی میں مقیم رہے۔ اور اس زمانے میں بھی ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری رہا۔ خاندانی تعلق سے درؔد کو تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کی غزل پاکیزہ متصوفانہ غزل کا عمدہ نمونہ ہے۔ درؔد نے اپنی غزل کے بارے میں خود فرمایا ہے ؎

پھولے گی اس زمانے میں بھی گلزار معرفت
میں یاں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا

درؔد نے تصوف کے نکات اور صوفی کے واردات اپنی غزلوں میں بیان کئے ہیں۔ لیکن اس کے لئے انہوں نے دوسرے صوفی شاعروں کی

طرح عشق مجازی کے استعاروں اور کنایوں سے کام لیا ہے۔ درد کے کچھ شعر ہیں سے

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کو
واں یہ پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا!
ہم سبھی مہمان تھے تو آپ صاحب خانہ تھا

میر درد کے چھوٹے بھائی، میر اثر بھی اردو کے شاعر تھے وہ درد کے مرید اور معتقد تھے۔ اردو غزل سے بھی انہیں دلچسپی تھی، چنانچہ غزل وہ اچھی کہتے تھے۔ لیکن ان کا بڑا کارنامہ ان کی مثنوی "خواب و خیال" ہے۔ یہ مثنوی دہلی میں لکھی ہوئی مثنویوں میں سب سے پہلی ہے۔ اثر کو بھی تصوف سے بہرہ ملا تھا۔ مثنوی میں انہوں نے متصوفانہ انداز میں ایک نعمہ لکھا ہے۔ مثنوی قصے ہی سے شروع ہوتی ہے، لیکن اس کا منتہا سراپا پر ہوتا ہے اور قصے کا سررشتہ متصوفانہ اذکار میں گم ہو جاتا ہے۔ بیچ بیچ میں اثر غزلیں لکھتے ہیں، جن سے اپنے بڑے بھائی خواجہ میر درد سے ان کی عقیدت اور محبت ظاہر ہوتی ہے۔

سراپا لکھنے کی ایک کوشش، اورنگ آباد کے شعرا میں لالہ لچھمی نارائن شفیق نے بھی "تصویر جاناں" میں کی تھی۔ اس مثنوی کا مقصد بھی خیالی محبوب کا سراپا لکھنا تھا۔ دلی کے شعرا میں اس طرح کی ایک اور کوشش شاہ مبارک آبرو نے "آرائش معشوق" میں کی۔ اس طرح "خواب و خیال" تیسری کوشش ہے۔ اردو میں سراپا نگاری کی کوششیں ہندی کی "نک شک" کی نظموں سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔

میر اور سودا کے دوسرے معاصرین میں محمد حسین کلیم، انعام اللہ خاں یقین، قیام الدین قائم، میر محمد بیدار اور محمد میر سوز، سب میر اور سودا کی روایات شاعری کے پیرو تھے۔ غزل ان کی فکری کاوشوں کا محور تھی ان شعرا کی غزل ایک معیار تک تو پہنچ جاتی ہے۔ لیکن عام سطح سے اوپر ابھرنے نہیں پاتی۔ انہیں حدود کے اندر ان میں انفرادیت بھی نمایاں ہے۔ تاہم ان شعرا کی مساعی سے شعر زبان میں ستھرا پن پیدا ہوتا گیا۔

محمد حسین کلیم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے فصوص الحکم کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ یقین کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ لالہ لچھمی نارائن شفیق نے ان کے کلام کی بڑی داد دی ہے اور اپنے آپ کو ان کا معنوی شاگرد بتایا ہے۔ یقین کا ایک مختصر سا دیوان ہے، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ساری غزلیں پانچ پانچ شعر کی ہیں۔ قائم چاند پور کے رہنے والے تھے۔ لیکن دہلی میں آکر رہ گئے تھے۔ غزل اور مثنوی دونوں میں انہیں

مہارت تھی۔ قصیدے بھی انہوں نے لکھے ہیں۔ ان کی مثنویاں "عشق درویش"، "حیرت افزا"، اور "رمز الصلوٰۃ" بہت زیادہ مشہور نہیں ہیں۔ لیکن اردو شعراء کا ایک تذکرہ جو انہوں نے لکھا تھا وہ کافی اہم ہے یہ تذکرہ "مخزن نکات" کے نام سے موسوم ہے اور فارسی میں لکھا گیا ہے۔

بیدار ایک صوفی منش بزرگ تھے اور غزل استادوں کی طرح کہتے تھے۔ سوز بھی غزل گو تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد وہ بھی لکھنؤ چلے گئے۔ ان کی غزل کی زبان نہایت صاف ستھری ہے۔ کچھ چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی انہوں نے لکھی ہیں۔

شمالی ہند میں اردو شعر و سخن کی ترقی کے اس ابتدائی دور میں فارسی شعری زبان کی حیثیت سے میدان سے ہٹ چکی تھی، لیکن ادبی زبان وہ اب بھی باقی رہی۔ چنانچہ اس زمانے کے لکھنے والوں میں دو عملی خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے۔ ایک ہی شخص شعر کے لئے اور نثری کارناموں کے لئے علیحدہ علیحدہ زبان استعمال کرتا ہے۔ میر، سودا، درد، قائم غرض جتنے شاعروں نے نثر میں کچھ لکھنا چاہا۔ اس کے لئے فارسی زبان سے کام لیا ہے۔ چنانچہ میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعراء" قائم کا "مخزن نکات"، شفیق کا "چمنستان شعراء" سب فارسی میں ہیں خطوط اور مراسلات کے لئے بھی فارسی ہی کا چلن تھا۔ شعری کارناموں میں سرخیاں بھی فارسی میں ہی لکھی جاتی تھیں۔ دیوان اور کلیات

کے دیباچے اور مقدمے، غرض جہاں نثر سے کام لینا ضروری ہوتا، فارسی سے کام لیتے تھے۔ صرف سوداؔ نے اپنے دیوان مراثی کا دیباچہ مقفیٰ اور مسجع نثر میں لکھا ہے۔ ان واقعات سے فارسی کے گہرے اثر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اردو کے ساری علمی اور ادبی فضا کو ابھی نہیں گھیرا تھا، بلکہ شاعری دلی اور دوسرے شعراء کے نمونوں پر ایک تحریک کے طور پر چل پڑی تھی۔ اور نثر میں فارسی کی پرانی روایات ابھی تک باقی تھیں۔

اہلِ نظر کی تازہ بستیاں

اٹھارویں صدی کے وسط سے جب دہلی فساد اور بدامنی اور مصیبتوں اور آفتوں کی آماجگاہ بننے لگی اور بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار نے اس عہد کی تہذیب و شائستگی کی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور سماجی اور علمی زندگی کو پارہ پارہ کرنا شروع کر دیا تو، دہلی میں زندگی دوبھر ہو گئی۔ دیرپا ادبی اور فنی کارنامے اپنی نشو و نما کے لئے نسبتاً امن و شانتی کی فضا چاہتے ہیں۔ شعراء اور فنکار ناساعد حالات کے لئے بہت حسّاس ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دہلی پر پے در پے جو مصیبتیں نازل ہوئیں ان میں علم و ادب کے بہت سے سرپرست کام آئے اور جو بچے، وہ عرصۂ آفاق کو تنگ پاکر جہاں امان کی صورت نظر آئی چل دیئے۔ سوال یہ تھا کہ اب شاعر جناع

اور ادیب اگر دہلی میں رہیں تو کھائیں گے کیا؟ علم و ادب کے سرپرست ایک ایک کرکے اٹھ گئے تھے۔ کچھ تو نادر شاہی غیض و غضب کا شکار ہوئے اور کچھ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی دار و گیر میں خاتمہ بالخیر ہوئے۔ اگر کچھ سخت جان بچ گئے تھے تو ان کو اپنی سدھ اپنی تھی۔ ایسی فضا میں شاعروں، ادیبوں اور صناعوں کی خبر کون لیتا؟

لکھنؤ

اودھ کا علاقہ محمد شاہ کے عہد میں عملاً خود مختار ہو گیا تھا۔ اودھ کا دارالسلطنت، فیض آباد، دہلی سے نکلے ہوئے شاعروں، عالموں اور صناعوں کے واسطے کچھ عرصہ تک آسرا بنا رہا۔ اودھ کی حکومت کے بانی سید محمد امین برہان الملک فرخ سیر کے عہد میں دہلی آئے تھے اپنی فراست اور تدبر سے وہ جلد ہی دربار رس، اور بادی گارڈ کے فوجی افسر مقرر ہو گئے۔ جب محمد شاہ بادشاہ ہوئے، تو سادات بارہہ سید عبداللہ اور سید حسین علی کو ان کے راستے سے ہٹانے میں محمد امین نے بھی حصہ لیا تھا، جس کے صلہ میں انہیں برہان الملک کا خطاب عطا ہوا۔

جس زمانے میں اودھ کے شیخ زادوں نے بغاوت کی، برہان الملک کو ان کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا گیا تھا۔ برہان الملک

کی کامیابی پر انہیں اودھ کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا۔ برہان الملک کا صدر مقام، اجودھیا تھا۔ جو رام چندر جی کی راجدھانی رہ چکی تھی برہان الملک کے بعد ان کے بھانجے صفدر جنگ ان کے جانشین ہوئے انہیں کے زمانے میں فیض آباد بسایا گیا۔ صفدر جنگ کے زمانے میں دہلی پر احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا تھا۔ اس معرکے میں صفدر جنگ شہزادہ احمد شاہ کی رفاقت میں تھے۔ جب وہ پانی پت سے لوٹ رہے تھے راستے میں، محمد شاہ کے انتقال کی خبر ملی۔ صفدر جنگ نے موقع کو غنیمت جانا اور احمد شاہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ صبح سویرے وہ شہزادہ کے خیمے میں گئے اور تخت و تاج کی مبارک باد دی۔ مسافرت میں تاج کا کیا ذکر تھا۔ صفدر جنگ نے ہوشیاری کی اور بانس کی تیلیوں کا ایک تاج سا بنایا اور اس میں جواہر ٹانکے اور موتیوں کی جھالر لگا کر شہزادہ کے سر پر رکھا اور سلطنت کی مبارک باد دی۔ شہزادہ مارے خوشی کے کہہ اٹھا ''ہمیں، یہ سلطنت اور تمہیں اس کی وزارت مبارک'' یہ سنکر جلد جلد دہلی پہنچا اور احمد شاہ نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔ صفدر جنگ اسی وقت سے نواب وزیر اودھ کہلانے لگے

صفدر جنگ کے بعد جلال الدین مرزا شجاع الدولہ ۱۷۵۲ء میں اپنے باپ کے جانشین ہوئے۔ جب ۱۷۵۶ء میں عالمگیر ثانی کو مرہٹوں نے گھیر لیا تھا اور احمد شاہ درانی اس کی مدد کے لئے آیا، تو شجاع الدولہ بھی دہلی کی مدد کو فوج لے کر گئے۔ ۱۷۵۹ء میں عالمگیر کے قتل کے بعد

شہزادہ عالی گوہر شاہ عالم کو تخت پر بٹھانے میں انہوں نے بھی مدد دی جس کے صلے میں انہیں وزارت ملی۔

اُس وقت تک انگریزوں نے اپنی قوت اتنی بڑھا لی تھی کہ نظم و نسق کے معاملات پر اثر انداز ہونے لگے تھے۔ شجاع الدولہ نے مصلحت وقت جان کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ دوستی اور امداد کا معاہدہ کر لیا تھا۔ لیکن چپ چاپ فیض آباد میں انہوں نے اپنی فوجی طاقت بڑھانی شروع کی۔ شجاع الدولہ نے ابتدا میں لکھنؤ کو اپنا صدر مقام بنانا چاہا تھا، لیکن انگریزوں کے بڑھتے ہوئے عزائم کو دیکھ کر، احمد خاں بنگش کے مشورے سے وہ پھر فیض آباد آئے۔ اور اس شہر کو خوب ترقی دی۔ فیض آباد دہلی سے قریب ہونے کی وجہ سے دہلی سے جو عالم، شاعر اور شاعر اور صناع بے گھر ہو کر نکلتے انہیں فیض آباد میں آسرا ملنے کا پورا یقین ہوتا تھا۔ اس لئے دہلی کے سارے سربرآوردہ شاعر فیض آباد آ گئے تھے۔ میر تقی میر کو شجاع الدولہ نے فیض آباد بلایا تھا۔ لیکن میر کو اس وقت دہلی چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ لیکن بعد میں آصف الدولہ کے عہد میں وہ بھی لکھنؤ چلے آئے۔

شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد اپنی آبادی، نفیس عمارتوں اور کاروبار کی چہل پہل کی وجہ سے بڑا بارونق شہر بن گیا تھا۔ شجاع الدولہ کا انتقال ۱۷۷۵ء میں ہوا۔ ان کے زمانے میں لکھنؤ اور فیض آباد میں جو امن امان تھا اور اہل فن کی جو قدردانی ہوتی تھی اس نے دہلی کے

کئی شعراء کو فیض آباد اور لکھنؤ کی طرف کھینچا تھا۔ فیض آباد آنے والے سربرآوردہ شعراء میں سراج الدین علی خاں آرزو اور سودا تھے۔ شمالی ہند میں اردو نثر کا پہلا مکمل افسانوی کارنامہ "نو طرز مرصع" شجاع الدولہ کے عہد میں لکھا گیا۔ یہ چہار درویش کے قصوں کا اردو میں پہلا ترجمہ ہے اور بہت ہی مرصع زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس قصے کی عبارتوں اور اسلوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ نثر لکھنے کے لئے اردو مصنفین فارسی سے سہارا لے رہے تھے۔

آصف الدولہ ۱۷۷۵ء میں تخت پر بیٹھے ان کے تخت پر بیٹھنے کے بعد دار السلطنت فیض آباد سے بدل کر لکھنؤ آ گیا۔ اور شہر کی از سر نو تعمیر شروع ہوئی۔

آصف الدولہ اور ان کی والدہ بہو بیگم میں شکر رنجی ہو گئی تھی۔ اس لئے آصف الدولہ نے لکھنؤ کے قیام کو پسند کیا۔ آصف الدولہ کو نظم و نسق سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ انگریزوں نے فوجی انتظامات اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے اور آصف الدولہ کو عیش منانے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ نظم و نسق کی الجھنوں سے بے نیاز ہو کر آصف الدولہ لکھنؤ کی تزئین اور ترقی میں لگ گئے۔ جب راجدھانی لکھنؤ میں منتقل ہو گئی تو فیض آباد کی ساری زینت لکھنؤ میں سمٹ آئی۔

آصف الدولہ میں شجاعت اور تدبر کے وہ جوہر تو نہ تھے، جو ان کے اسلاف میں تھے۔ لیکن ان میں فیاضی کی صفت بڑی قابل تعریف

تھی۔ اسی لئے لکھنؤ کی تہذیبی اور ادبی زندگی کی نشو ونما میں بڑی مدد ملی۔ لکھنؤ کی سماجی، علمی اور ادبی ترقی کی بنیادیں انہیں کے عہد میں رکھی گئیں۔ کئی نفیس نفیس عمارتوں سے شہر کو زینت دی گئی۔ آصف الدولہ کا بنوایا ہوا امام باڑہ، اپنی بعض تعمیری خصوصیتوں کی وجہ سے ایک یادگار عمارت سمجھی جاتی ہے۔ اور اس امام باڑہ کی بنا اس طرح ہوئی تھی کہ آصف الدولہ کے زمانے میں ایک مرتبہ بڑا قحط پڑا تھا۔ اس قحط میں عوام تو عوام، متوسط خاندانوں کے لوگ بھی کھانے کو محتاج ہو گئے تھے۔ ان کے لئے روزی کا ذریعہ فراہم کرنے کی خاطر آصف الدولہ نے اس عمارت کا ڈول ڈالا۔ نقشہ تیار کرنے کے لئے اچھے اچھے مہندس بلوائے گئے اور بہت سے نقشوں میں سے کفایت اللہ نامی ایک ماہر تعمیر کا نقشہ پسند کیا گیا۔ عمارت کا کام رات کو ہوتا تھا تاکہ غریب اور فاقہ کش شرفا، رات کے اندھیرے میں آکر مزدوروں کے ساتھ شامل ہو کر سکیں۔ لکھنؤ میں سنگ مرمر یا پتھر کا ملنا آسان نہیں تھا، اس لئے امام باڑہ اور لکھنؤ کی دوسری عمارتیں چونے اور اینٹ سے تعمیر کی گئی ہیں۔ ان میں سے بہت سی عمارتیں مرور زمانہ کے ساتھ منہدم ہو گئیں، تاہم جو عمارتیں باقی ہیں وہ اپنی تعمیر کاری اور نفیس کام کی وجہ سے عمارت کی زینت ہیں۔

امام باڑہ کے علاوہ دولت خانہ کی عمارت اور عیش باغ بھی آصف الدولہ نے بنوایا تھا۔

آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ کو جو امن و امان کی زندگی نصیب ہوئی تھی۔ اس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ دہلی اور اطراف سے خاندان کے خاندان لکھنؤ میں منتقل ہوتے جا رہے تھے۔ اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے شہر میں بیسوں نئے نئے محلے آباد ہوئے۔ چنانچہ اما نی گنج، فتح گنج، نخاس دولت گنج، بیگم گنج، نواب گنج، بھوانی گنج، ترمنی گنج، غرض کتنے ہی نئے محلے اسی زمانے میں بسائے گئے۔ کچھ نئے پل بھی تیار ہوئے اور عمدہ کشادہ سڑکوں، باغوں اور مرغزاروں سے شہر کی زینت میں اضافہ کیا گیا۔

یہ لکھنؤ کی خوش قسمتی تھی کہ دہلی میں نشو و نما پائے ہوئے فن کار، صناع، شاعر اور ادیب اس کی ذہنی زندگی کو نکھارنے کے لئے ابتدا ہی میں میسر آئے۔ اس کی وجہ سے لکھنؤ کو دکن اور دہلی کی طرح ابتدائی اور مشقی مرحلوں سے گذرنا نہیں پڑا اور ترقی یافتہ تہذیبی اور اُردو شعر و ادب کی روایات وہاں ابتداء ہی سے نمایاں ہونے لگیں اور لکھنؤ کے سماج نے اپنے ماحول اور فطری اقتضاء کے مطابق ان کو اور آگے بڑھانا شروع کیا۔ آصف الدولہ کے عہد سے سماجی اور درباری زندگی ہی کا سلسلہ تھی۔ لکھنؤ کے حکمران خود دہلی کی مغلیہ روایات اور مذاق میں پرورش پائے تھے۔ لیکن دہلی سے جو تہذیب اور شائستگی یہاں پہنچی تھی اس پر رفتہ رفتہ مقامی حالات اور مزاج کا رنگ چڑھتا گیا۔ چنانچہ تھوڑے سے ہی عرصہ کے اندر لکھنؤ کی تہذیب

اور شائستگی ایک نئے سانچے میں ڈھلتی دکھائی دینے لگی۔

لکھنؤ کی شاہی سرپرستی میں زندگی کے سارے علمی اور حسن کارانہ پہلوؤں میں ترقی ہونے لگی تھی۔ اظہار کے واسطوں اور ذریعوں کی نفاست خواہ وہ روزانہ زندگی کے علمی مشاغل میں ہو یا ان کی ذہنی زندگی کی حسن کارانہ، علمی، ادبی اور شعری دلچسپیاں ہر جگہ نمایاں تھی عیش و عشرت کی زندگی جو لکھنؤ کے حکمرانوں کو میسر آ گئی تھی۔ اس کا اثر متوسط طبقوں سے گذر کر تھوڑا بہت عوام پر بھی پڑنے لگا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی بساط سے زیادہ توجہ عیش کوشی پر صرف کرنے پر اور بات ہے کہ ان کے مطمح نظر میں وہ گہرائی اور گیرائی نہیں تھی، جو ایک ابھرتی ہوئی قوم کی خصوصیت ہوتی ہے۔

ادبی لحاظ سے لکھنؤ کو جو بنا بنایا سامان مل گیا تھا وہ آغاز کے لئے یقیناً شاندار اور قابل فخر تھا۔ اردو کے سربرآوردہ شاعر فیض آباد پہنچنے لگے تھے۔ استاد الاساتذہ، خان آرزو نادرشاہ کے حملے کے بعد دہلی سے دل برداشتہ ہو کر فیض آباد چلے گئے تھے۔ اور بہو بیگم کے بھائی، سالار جنگ نے یہاں ان کی مدد کی، آرزو کا انتقال فیض آباد ہی میں ہوا۔ احمد شاہ بادشاہ کی معزولی کے بعد میر سوز بھی لکھنؤ آ گئے۔ آصف الدولہ نے ان کو اپنے دربار میں نمایاں جگہ دی اور اپنی استادی کے لئے منتخب کیا۔ اشرف علی خان فغاں احمد شاہ کی معزولی کے بعد مرشد آباد چلے گئے تھے لیکن بعد کو وہ بھی لکھنؤ

آ گئے۔ سودا، مرہٹوں کے ہنگامے کے بعد دہلی سے فرخ آباد چلے گئے تھے۔ اور وہاں سے وہ بھی فیض آباد آ گئے۔ اور شجاع الدولہ نے انہیں اپنے یہاں ملازم رکھ لیا تھا۔ میر کو بھی نواب نے فیض آباد آنے کی دعوت دی تھی، لیکن میر کو نامساعد حالات نیز بھی دہلی سے اس گہری وابستگی کے باعث جس کا اظہار انھوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے ؎

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

دلی سے نکلنا گوارا نہ ہوا۔ لیکن بالآخر آصف الدولہ کے عہد میں وہ بھی لکھنؤ آ گئے اور آصف الدولہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔

سودا اور میر کے لکھنؤ آ جانے کے بعد سے لکھنؤ کی ادبی تاریخ کا شاندار باب شروع ہوتا ہے۔ سودا اور میر کی شہرت ان سے پہلے ہی لکھنؤ پہنچ گئی تھی۔ اور وہاں ان کی قدر بھی ہوئی۔ میر اور سودا کی طبیعت کے جوہر دہلی ہی میں بروئے کار آ چکے تھے۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ سے متوسل ہونے کے بعد ان کا کچھ کلام سرانجام پایا، دونوں اساتذہ کے قصیدے آصف الدولہ کی مدح میں لکھے ہوئے ان کے کلیات میں موجود ہیں۔ آصف الدولہ کے شکار کے موقع پر اکثر میر اور سودا بھی ان کے ساتھ رہتے تھے۔ چنانچہ ان کے شکار کی مہموں کی تفصیلات پر دونوں شعرا نے کئی "شکار نامے" بھی لکھے ہیں۔ سودا کے ایک

"شکار نامہ" کے چند شعر ذیل میں دئے جاتے ہیں ؎

بہ دہر آصف الدولہ جس کا ہے نام
سلیمان شکوہ و ذوی الاحترام

کیا اس نے ناگہ بہ عزم شکار
قدم رنجہ اپنا سوئے کوہسار

نہ تھا چار پائے کو ہرگز بچاؤ
کیا قصد جس دم سوئے نیل گاؤ

پھر اس دشت میں جتنے کچھ تھے درند
کمند اجل سے گئے پائے بند

مگر واں سے جیتے گئی چیل نائے
سو حلقہ بگوش اس کے وہ ہو کے آئے

لکھنؤ میں ابتدا ہی سے شاعری، دربار سے وابستہ ہونے لگی تھی، اور اس کا محور، فکر و فن کی بجائے، بادشاہ جہاں پناہ کی ذات بننے لگی تھی۔ چنانچہ میر کبھی جو "وصف گل دیا سمن" سے جی چراتے تھے، دربار کے شعری وقائع نگار بننے پر مجبور ہو گئے تھے۔

آصف الدولہ نے ایک گھوڑا خریدا تھا، میر نے اس کی تعریف میں ایک قطعہ لکھا تھا، جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

وزیر زماں نے لیا ایک اسپ
ہے وہ رشک گلگون باد بہار

کردں اس کی کیا تیز گامی شرح
ہرن اسپ شمشیر سے ہوشکار
تک اک کسماد سے جو راکب تو پھر
نہیں اوس کو رانوں میں ہرگز قرار
غرض اسپ ہے یا چھلاوا ہے یہ
رہیں زیر ران اوسکے ایسے ہزار

مسیر کو لکھنؤ میں نسبتاً فراغی رہی لیکن وطن کا خیال ان کے دل سے کبھی نہ ٹل سکا۔ ایک طویل غزل نما نظم میں انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گذار
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حال زار
خاک دہلی سے جدا ہم کو کیا یکبار گی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار
منصب بلبل غزل خوانی تھا سو دہ اسیر
شاعری زاغ وزغن کا کیوں نہ ہو وے اب شعار
طائر خوش زمزمہ کنج قفس میں ہیں خموش
چہچہے چڑیاں کریں ہیں صحن گلشن میں ہزار

جب سے میر اور سودا جیسے مردان پیشہ سخن نے فیض آباد اور لکھنؤ کو جا بسایا یعنی دہلی کے دوسرے شعراء میں ایک عام تحریک

لکھنؤ جانے کی اُبھرنے لگی تھی۔ چنانچہ میر حسن، جو کچھ عرصہ پہلے اپنے والد میر ضاحک کے ساتھ فیض آباد آ چکے تھے لکھنؤ میں منتقل ہو گئے۔ انشاء، مصحفی، حسرت اور اُن کے شاگرد، جرأت، منت، رنگین غرض دہلی کے سارے اہم اور غیر اہم شاعر لکھنؤ چلے آئے۔ شاہ نصیر بھی لکھنؤ آئے تھے۔ لیکن بعد کو وہ حیدر آباد چلے گئے۔

ان شعراء کی آمد کے بعد لکھنؤ میں اردو شاعری کا ذوق اتنا پھیلا کہ رسیلی اودھی بولی کی اِس سرزمین سے کتنے ہی اچھے اچھے سخنور اٹھے اور رفتہ رفتہ اردو شاعری اور ادب کے مرکز دہلی کے بعد لکھنؤ کا مقام معین ہو گیا۔

لکھنؤ میں بھی غزل مقبول ترین صنف رہی لیکن لکھنؤ کے بعض شعراء نے یہ محسوس کر کے کہ میر اور سودا کے بعد غزل میں اس بلندی تک پہنچنا آسان نہیں ہے، دوسری اصناف شاعری کی طرف بھی توجہ کی۔ میر حسن نے مثنوی "سحر البیان" لکھی جو اردو مثنوی نگاری کا معراج کمال ہے۔ شمالی ہند میں مثنوی کی صنف میں قصہ، سب سے پہلے ایک مبسوط اور مکمل روپ میں "سحر البیان" ہی میں کہا گیا ہے لیکن "سحر البیان" کی عظمت میں محض قصے کی تکمیل ہی کو دخل نہیں بلکہ اس میں اس زمانے کے اونچے طبقوں کی زندگی کے کچھ ہلکے اور کچھ گہرے نقوش بھی مل جاتے ہیں۔ اس سے تھوڑی ہی بہت روشنی سماجی نظام

پر بھی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ عوام اور خواص کے معتقدات اور اوہامات اور ان کی دلچسپیوں کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ زبان کی سادگی اور بول چال کے انداز کی لطافت کے سبب میر حسن کی مثنوی کے کئی اشعار ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ اور اردو ادب کا جز بن گئے ہیں۔ چند مثالیں یہ ہیں ؎

تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار
نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار

فقیری جو کیجئے تو دنیا کے ساتھ
نہیں خوب جانا ادھر خالی ہاتھ

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

یہ گھر گو کہ میرا ہے تیرا نہیں
پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

کبھی یوں بھی ہے گردش روزگار
کہ معشوق عاشق کے ہو اختیار

جہاں راستی چاہیئے، راستی
کہی جس جگہ چاہیئے واں کجی

میر حسن کا انتقال ۱۷۸۶ء میں ہوا۔

غلام قادر روہیلہ کی بغاوت اور چیرہ دستیوں کے بعد، دہلی کے شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ اور ان کے متوسلین بھی لکھنؤ آگئے تھے۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ نے ان کے لئے خزانہ سے چھ ہزار روپیہ ماہوار مقرر کر دیا تھا۔ سلیمان شکوہ کو اردو شاعری سے دلچسپی تھی۔ وہ اردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ اور شعار آغا تخلص کرتے تھے۔

سلیمان شکوہ جب تک لکھنؤ میں پناہ گزین رہے، انھوں نے اپنی دوسری دلچسپیوں کے علاوہ شعر و سخن کے مشاغل کو بھی جاری رکھا۔ مصحفی جب دہلی سے آئے تو انہیں کے دربار سے متوسل ہو گئے، اور ان کی غزلوں کی اصلاح کرتے تھے۔ پھر یہ خدمت انشاء کو تفویض کی گئی اور مصحفی کی تنخواہ گھٹا دی گئی۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی شعراء جو دہلی سے لکھنؤ آئے وہ بھی سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ دہلی سے آنے والوں کے لئے یہ ایک فطری بات بھی تھی کہ انھیں سلیمان شکوہ سے زیادہ یگانگت محسوس ہوتی، کیونکہ انھیں وہ اپنا شہزادہ سمجھتے تھے۔ شاعر ہونے کے ناطے وہ دہلی کے اکثر شعراء سے واقف بھی تھے۔ کچھ شاعر جو اس سے پہلے لکھنؤ آگئے تھے اور آصف الدولہ کے دربار میں ملازم ہو گئے تھے ان میں اور سلیمان شکوہ کے دربار کے شاعروں میں جلد ہی کچھ مسابقت کا جذبہ سا پیدا ہو گیا۔ یہ واقعہ اردو شاعری کے پھیلاؤ کے لئے مفید ہوا اور زبان کو بھی اس سے

فائدہ پہنچا، لیکن اس سے شعر و سخن کے مذاق اور فکر میں بلندی نہیں پیدا ہو سکی، بلکہ اُسے پستی کی طرف ڈھکیلنے کا باعث بنتی گئی۔

مصحفی اور انشاء میں جو دوستی اور یگانگت تھی اس میں بھی اسی نفسانفسی کے زمانے میں کچھ خلل پڑ گیا۔ رفتہ رفتہ ان کے طرفداروں کے دو کیمپ سے بن گئے۔ ان کے ساتھ کچھ اور سخن فہم اور سخنور بھی شریک ہو گئے۔ اور آپس میں چوٹیں چلنے لگیں۔

انشاء کی طبیعت میں چہل، طنز اور ظرافت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ جب تک وہ دلی میں رہے اپنی بذلہ سنجی اور طبیعت کی طرّاری کی وجہ سے وہاں کے حلقوں میں مقبول، حتیٰ کہ شاہ عالم بادشاہ کے بھی منظورِ نظر رہے تھے۔

انشاء کی طبیعت کی چہل کا یہ حال تھا کہ شاہ عالم کے اندھے ہو جانے کے بعد بھی، وہ اُن کو چھیڑنے سے نہیں چوکتے تھے، اور جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے غلام قادر ان کی بصارت لے گیا تھا، انشاء ان سے اپنا مطلب نکال لیتے تھے۔ کبھی جمعرات کو وہ بادشاہ کے پاس بیٹھے بیٹھے یکایک اجازت طلب کرتے، بادشاہ پوچھتے "خیر باشد کہاں، کہاں؟" انشاء جواب دیتے "حضور آج جمعرات ہے۔ غلام نبی کریم جاتے، شاہ دین کا دربار ہے، کچھ عرض کرے۔" شاہ عالم ادب سے کہتے "ہاں کبھی ضرور جاہیئے، سید انشاء اللہ خاں ہمارے لیے بھی کچھ عرض کرنا۔" انشاء نے کہا "حضور غلام کی ارزداور کونسی

ہے۔ حضور، بادشاہ عالی جاہ کے دربار میں غلام خالی ہاتھ کیونکر جائے، کچھ نذر و نیاز، کچھ تبرّاً کو ترحمت ہو،" بادشاہ کہتے۔ "ہاں بھئی درست، درست مجھے تو خیال نہیں رہا" یہ کہہ کر شاہ عالم... جیب میں ہاتھ ڈالتے اور کچھ روپے نکال کر دیتے۔ انشاؔء اسے لے لیتے اور ایک دو دعائیہ فقرے کہہ کر پھر عرض کرتے، "حضور، دوسری جیب میں دستِ مبارک جائے تو فدوی کا کام چلے کیونکہ وہاں سے پھر کبھی نوآنا ہے" بادشاہ کہتے "ہاں بھئی، سچ ہے، سچ ہے۔ بھلا وہاں سے دو دو کھجوریں تو لا کر کسی کو دو۔ ہاں نیچے کیا جائیں گے کہ تم آج کہاں گئے تھے"

اس واقعہ سے ایک طرف تو انشاؔء کی شوخ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے دوسری طرف اس سے شاہ عالم بادشاہ کی بے بسی اور بے چارگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

انشاؔء دہلی سے نکل کر کچھ عرصہ مرشد آباد میں رہے پھر وہ لکھنؤ آئے۔ کلکتہ اس زمانے میں انگریزوں کی جد و جہد کا مرکز بنا ہوا تھا مرشد آباد کے قیام سے انشاؔء انگریزی الفاظ سے بھی تھوڑے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ چنانچہ اپنے اشعار میں وہ انگریزی کے الفاظ بھی بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ لکھنؤ آنے کے بعد انشاؔء کی شاعری خوب چمکی۔ ان کی طبیعت باغ و بہار تھی۔ اور ان کے قلم میں تیزی تھی۔ اس لئے وہ بہت کچھ لکھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ غزل

قصیدہ، مثنوی، مسمط، غرض ان کی طبیعت میں جیسی لہر آئی انہوں نے ویسی صنف سے کام لیا۔ نثر میں بھی انھوں نے ایک دو کارنامے ایسے چھوڑے ہیں جو ان کی طبیعت کی ندرت کے مظہر ہیں ان میں سے ایک "رانی کیتکی اور کنور اودے بھان" کی کہانی ہے، جو بہت ہی سادہ زبان میں لکھی گئی ہے "سلک گوہر" میں انہوں نے یہ التزام کیا ہے کہ کوئی حرف نقطہ دار نہ آنے پائے۔ اس بات کا التزام بہت کٹھن کام تھا۔ اسی لئے اس کی زبان بہت مشکل اور اسلوب بیان پیچیدہ ہو گیا ہے۔ یہ کہانی چند صفحوں سے لمبی نہ لکھی جا سکی۔

انشاء کئی زبانوں سے واقف تھے۔ وہ فارسی عربی جانتے تھے۔ اس کے علاوہ ترکی، پشتو، کشمیری، پنجابی، مارواڑی وغیرہ سے بھی واقف تھے۔ شاید بنگالی بھی وہ جانتے ہونگے۔ کیونکہ وہ مرشد آباد میں رہ چکے تھے۔ انشاء کا ایک اہم کارنامہ "دریائے لطافت" ہے جس میں اردو زبان کی قواعد عروض اور بلاغت کے مسائل فارسی میں لکھے ہیں۔ مرزا قتیل نے بھی اس کتاب کے لکھنے میں اُن کی مدد کی تھی۔ قواعد کے حصے میں اردو کی اصوات یا حروف کی جو تفصیل انہوں نے لکھی ہے، وہ بہت زیادہ علمی تو نہیں ہے، تاہم صوتی تجزیہ کی یہ ابتدائی کوشش بہت اہمیت رکھتی ہے "دریائے لطافت" سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان کے

پھیلاؤ کی وجہ سے اُس کی کئی بولیاں اور خاص طور پر طبقہ داری بولیاں نشو و نما پانے لگی تھیں۔ ان بولیوں کے کچھ نمونے انشاؔ نے دیئے ہیں عروض میں اردو نے فارسی اوزان اختیار کر لئے ہیں۔ لیکن انشاؔ نے ان اوزان کو اردو بنانے کی ایک انوکھی تجویز پیش کی ہے مثلاً اردو کا ایک وزن ہے "مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن"، یہ اس کی جگہ انشاؔ نے "پی جان پری خانم پی جان پری خانم" کے ارکان کے ساتھ وزن بنایا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سنجیدہ معاملات میں بھی وہ شوخی اور چہل سے باز نہیں آسکتے تھے۔

انشاؔ نے عورتوں کی زبان میں بھی اشعار کہے ہیں اسے "ریختی" کہتے ہیں۔ ریختی گو شعراء میں انشاؔ کے علاوہ اُن کے دوست رنگین اور ان کے معاصر جراءت بھی تھے۔ ریختی کی اہمیت ادبی سے زیادہ لسانی اور ثقافتی ہے۔ اس میں بہت سے ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اس زمانے میں لکھنؤ کی عورتوں کی زبان کے ساتھ مخصوص تھے۔ عورتوں کی زندگی اور عورتوں کی بعض مخصوص دلچسپیوں کے مشاغل پر بھی اس سے روشنی پڑتی ہے۔ ریختی کو ہم اس زمانے میں اور خاندان کی خواتین کی سماجی زندگی کے ایک پہلو کی تصویر سمجھ سکتے ہیں۔

سعادت علی خاں کی گدی نشینی کے بعد انشاؔ ان کے دربار سے متوسل ہو گئے تھے۔ تھوڑے عرصہ کے اندر اندر سعادت علی خاں

کو ان کے مزاحیہ کلام ، ان کے لطیفوں اور چٹکلوں سے ایسا لطف آنے لگا تھا کہ وہ اکثر انشا کو اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ لیکن انشا کو ایک حکمران کی طبیعت کا تجربہ نہیں تھا یا کم سے کم وہ یہ نہیں سمجھ سکے تھے کہ سعادت علی خاں اور شاہ عالم میں فرق ہے۔ انشا کی کبھی کبھی بڑھ چڑھ کر کہہ بیٹھنے کی جو عادت تھی، اس کے سبب سعادت علی خاں ان سے ناراض ہو گئے تھے اسی وجہ سے آخری زمانے میں انشا کی زندگی تکلیف میں بسر ہوئی ۔

انشا کے معاصر شعرا اور اگلے دور کے دوستوں میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی اس وجہ سے اہمیت رکھتے ہیں کہ غزل میں وہ اس سلامت کو برقرار رکھتے ہیں جو وہ دہلی سے ساتھ لائے تھے۔ مصحفی امروہہ کے رہنے والے تھے لیکن ان کی پرورش دہلی میں ہوئی ۔ دہلی سے وہ لکھنؤ گئے جہاں ان کا قیام آخر دم تک رہا۔ مصحفی بہت پرگو شاعر تھے ۔ فی البدیہہ کہتے تھے اور فرمائش پر کہتے تھے۔ ان کا ذریعہ معاش کچھ نہیں تھا۔ آزاد لکھتے ہیں کہ وہ غزلیں بیچتے تھے جب مشاعرہ قریب ہوتا تو وہ طرح مشاعرہ میں بہت سے شعر لکھ رکھتے تھے۔ عین مشاعرہ کے دن لوگ آتے ۔ آٹھ آنے سے ایک روپیہ تک اور جہاں تک کسی کا شوق مدد کرتا دیتا ۔ یہ اس میں سے ۹، ۱۱، یا ۱۲ شعر کی غزل نکال کر حوالے کر دیتے تھے ۔ ان کے نام کا مقطع کر دیتے تھے۔ پھر سب کو دست کر جو کچھ بچتا وہ خود لیتے ۔ آزاد یہ بھی لکھتے ہیں ۔

ایک مشاعرے میں جب شعروں پر بالکل تعریف نہیں ہوئی تو انھوں نے تنگ ہو کر غزل زمین پر دے ماری اور کہا کہ روئے فلاکت سیاہ، جس کی بدولت کلام کی یہ نوبت پہنچی ہے۔

مصحفی میر تقی میر کے ساتھ بھی کئی مشاعروں میں شریک رہے۔ ایک مشاعرے میں، جس میں میر بھی موجود تھے۔ انھوں نے غزل پڑھی تھی جس کا مطلع تھا۔

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو
مکھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

جب انھوں نے یہ شعر پڑھا

یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

تو میر نے کہا تھا "بھئی ذرا اس شعر کو پھر پڑھنا" میر کا کا اتنا کہنا ہزار تعریفوں کے برابر تھا۔ مصحفی نے کئی دفعہ اٹھ کر سلام کئے اور کہا کہ "میں اس شعر پر اپنے دیوان میں نمبر رکھوں گا کہ حضرت نے دوبارہ پڑھوایا تھا"۔

مصحفی غزل کے استاد ہیں۔ اور جہاں تک ہو سکتا ہے۔ غزل میں میر کی سی سادگی برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سادگی میں شوخی اور چونچلا مصحفی کی خصوصیت ہے لیکن وہ پھکڑپن میں

نہیں اُترآتے۔ انشآء کی ان بے شکر رنجی کے بعد انشآء نے ان کی بڑی بڑی پھبتیاں کہی تھیں، لیکن مصحفی ان کی سطح پر اتر کر جواب نہیں دیتے تھے۔ ایک دفعہ مصحفی نے سلیمان شکوہ کی محفل میں غزل پڑھی تھی، جس کا مطلع یہ تھا ؎

تھا مصحفی مائل گریہ کہ پس از مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

انشآء نے جو غزل کہی تھی اس میں مصحفی کے شعر کا مضحکہ اڑایا تھا ؎

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس از مرگ
رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

بعض وقت انشآء اس سے بھی زیادہ کھل کھیلتے تھے لیکن مصحفی نے کبھی کبھی صرف اتنا کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لی ؎

مدت سے ہوں میں سرخوش صہبائے شاعری
ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری
میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجان شعر کو
برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری
اک طرفہ خر ہے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے
سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

مصحفی، مقطع اور انشآء مشہور، اور دونوں کے معرکے

سلیمان شکوہ کے دربار میں ہوتے تھے۔ شہزادہ بہادر کو اس میں یقیناً لطف آتا تھا۔ ورنہ کسی شاعر کی شاید یہ ہمت کم ہو سکتی کہ وہ شہزادہ کے سامنے دوسرے کا مضحکہ اڑائے اور اس پر پھبتی کسے امیروں کا کچھ مذاق ہی ایسا ہو گیا تھا۔ اور شعراء کو ان امیروں کو خوش رکھنے اور ان کا دل بہلاتے رہنے کی ضرورت تھی کیونکہ اس زمانے کے اکثر شعراء کی روزی اور اس کی فراخی کا انحصار ان کی اپنی اسی صلاحیت پر تھا۔

مصحفی کا اثر لکھنؤ کی نوجوان نسل کے شعراء پر کافی گہرا پڑا۔ چنانچہ ان کے شاگردوں کی تعداد بڑی کثیر تھی۔ انھوں نے اردو اور فارسی شعراء کے تین تذکرے "عقد ثریا"، "ریاض الفصحاء" اور "تذکرہ ہندی گویاں" لکھے تھے۔ ان تذکروں میں بہت سے ایسے شاعروں کا حال لکھا ہے جو ان کے شاگرد رہ چکے تھے۔

انشاء کے ایک اور دوست سعادت یار خاں رنگین تھے جن کا خاندان بھی دہلی سے تعلق رکھتا تھا۔ ابتداء میں وہ فوج میں ملازم رہے تھے۔ بعد میں ملازمت ترک کر کے وہ گھومتے پھرتے رہے اور گھوڑوں کی تجارت کو پیشہ بنا لیا۔ غالباً اسی سلسلے میں وہ دکن بھی آئے تھے۔ آخر میں رنگین لکھنؤ آ گئے جہاں انشاء کے ساتھ مل کر انھوں نے شعر و سخن کے بہت سے معرکے سر کئے۔ شاعر کی حیثیت سے وہ بہت بلند پایہ نہیں رکھتے۔ لیکن ان کے ادبی کام

بہت رنگا رنگی نوعیت کے ہیں وہ غزل، قصیدہ، مثنوی سب ہی اصناف میں لکھنے تھے۔ مثنویوں میں ان کی ایک "مثنوی دل پذیر" میں قصہ کہا گیا ہے۔ ان کی دوسری مثنویاں، جو ہتھیاروں کے استعمال اور گھوڑوں کی بیماریوں کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ رنگین کے اپنے تجربے کی باتیں ہیں۔ ریختی میں وہ انشا کے شانہ بہ شانہ تھے۔ رنگین اردو نثر بھی ابھی اچھی لکھ لیتے تھے۔ چنانچہ ان کی تصانیف "مجالس رنگین اور "اخبار رنگین" اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہیں کہ ان سے ان کے زمانے کی معاشرت پر روشنی پڑتی ہے اور شاعروں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

آصف الدولہ کا انتقال ۱۷۹۸ء میں ہوا، اور ان کے بیٹے وزیر علی مسند نشین ہوئے۔ لیکن وہ حکومت کے نااہل ثابت ہوئے اور چار مہینے کے بعد سعادت علی خاں ۱۷۹۸ء میں تخت پر بیٹھائے گئے ان کی تخت نشینی کے محرک انگریز تھے۔ انگریزوں کی حکمت عملی ہمیشہ یہ رہی کہ غیر مستحق کی طرف داری کریں کیونکہ اگر ان کو کامیابی ہوگئی۔ تو حکمراں ان کا ممنون احسان بنا رہتا۔ اور ان کے احکام پر چلتا۔ سعادت علی خاں کو انہوں نے اس لئے منتخب کیا تھا سعادت علی خاں سے آصف الدولہ کچھ زیادہ خوش نہیں تھے اس لئے وہ بنارس بھیج دیئے گئے تھے۔ آصف الدولہ کے انتقال کے بعد انگریزوں نے ان سے سودا کرنے کی ایک تجویز بنائی۔ چنانچہ بنارس میں ایک انگریز

حاکم نے ان سے مل کر پوچھا کہ "نواب صاحب، اگر آپ کو اودھ کی حکومت مل گئی تو انگریزی حکومت کو کیا دیجئے گا" سعادت علی خاں کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وزیر علی خاں کے ہوتے ہوئے اودھ کی حکومت انہیں مل سکے گی۔ جب انگریز حاکم سے خلاف توقع یہ بات سنی تو کہہ دیا" آدھا ملک انگریزوں کے نذر کروں گا"۔

کہتے ہیں کہ بہو بیگم بھی وزیر علی خاں سے ناخوش تھیں بہرحال جب سعادت علی خاں تخت پر بیٹھے تو وعدہ کے مطابق آدھا ملک انگریزوں کے نذر کرنا پڑا۔ اس کی وجہ سے ملک کی آمدنی گھٹ گئی تاہم سعادت علی خاں جزرس انسان تھے، انہوں نے ایک طرف تو دربار کے مصارف گھٹا کر اور دوسری طرف آمدنی کے کچھ ذرائع بڑھا کر کافی روپیہ جمع کر لیا تھا۔

سعادت علی خاں کے دربار سے کئی شعراء متوسل تھے۔ انشاء سے ان کو پہلے پہل بہت لگاؤ رہا۔ لیکن انشاء نے بعض وقت پاس ادب ملحوظ نہ رکھا، جس کی وجہ سے بعد میں وہ انشاء سے مکدر ہو گئے تھے۔ انشاء کے علاوہ اور بھی کئی شاعروں سے وہ سلوک مساوک روا رکھتے تھے۔ سودا ان کی تخت نشینی کے سال مرے۔ سودا کا انتقال آصف الدولہ کے عہد میں ہو چکا تھا۔ میر ان کی تخت نشینی کے بعد بھی بارہ سال تک زندہ رہے۔ ان کا اور جرأت کا انتقال

ایک ہی سال ہوا۔ مصحفی سعادت علی خاں کے زمانے میں موجود تھے اور شعر وسخن کی خدمت کر رہے تھے۔

سعادت علی خاں کفایت شعار ہونے کے باوجود ان کو لکھنؤ کی زینت بڑھانے کا خیال تھا۔ چنانچہ انھوں نے کئی نئی عمارتوں سے شہر کو آراستہ و پیراستہ کیا۔ ان کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں ایک لال بارہ دری تھی جس میں اب کتب خانہ ہے یہ عمارت ان کے زمانے میں قصر السلطان کے نام سے موسوم تھی۔ ایک اور عمارت " دل آرام" اور دوسری " دلکشا "، کے نام سے بنوائی تھی" دلکشا " ایک بلند ٹیکرے پر واقع ہے جہاں سے ندی کا منظر بڑا دلکش دکھائی دیتا ہے ان کی بنوائی ہوئی ایک اور کوٹھی " حیات بخش " کے نام سے موسوم تھی" منور بخش " اور " خورشید منزل "، بھی انہیں کے عہد میں تعمیر ہوئیں۔

سعادت علی خاں کے زمانے کی عمارتوں کے سلسلے میں دو باتیں نمایاں ہیں۔ ایک تو ان کی وضع قطع دوسرے ان کے نام سعادت علی خاں نے انگریزوں سے جو سودا کیا تھا، ان کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انگریزوں کے دست نگر ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کی کئی عمارتیں انگریز انجینیروں کی نگرانی میں بنیں۔ ان عمارتوں پر مغربی طرز تعمیر کاری کا اثر ہے۔ پرانی ہند اسلامی تعمیر کاری کے حسین نمونوں کے درمیان، یہ نئی عمارتیں " پاپوشش میں لگی ہوئی آفتاب کی کرن "، سی معلوم ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان عمارتوں کے ناموں کا

لکھنؤ کے پڑھے لکھے سماج کی ذہنیت پر شعریت اور استعارہ کا جو رنگ چڑھنے لگا تھا اس کے آغاز کا پتہ چلتا ہے۔ استعارہ اور کنایہ میں گفتگو کرنے کا انداز لکھنؤ کے عوام پر اتنا چھا گیا تھا کہ معمولی معمولی آدمی بھی استعارہ اور کنایہ میں گفتگو کرنے کو پسند کرتے تھے۔ کبھی کبھی "ضلع" بھی بول جاتے تھے۔ چوک میں پونڈے بیچنے والا پکارتا سنائی دیتا۔ "ارے" یہ کنکوے کون لوٹے گا"۔ ایک صاحب کربلائے معلا سے لوٹنے کے بعد ایک محفل میں سفید براق کپڑے پہنے ہوئے تشریف لائے تو ایک لڑکا ان کو دیکھ کر بول اٹھا "ایں، یہ فرات کا بگلا کہاں سے آ گیا"۔

سعادت علی خاں کے بیٹے غازی الدین حیدر جب تخت پر بیٹھے تو ان کی دل چسپی کی مناسبت سے عیش و عشرت کے لوازمات کو ترقی ہونے لگی۔ انگریزی اثر ان کے زمانے میں دربار اور سیاست دونوں جگہ بہت بڑھ گیا تھا۔ ان کی ایک بیوی انگریز بھی تھی جس کے لئے انہوں نے ایک محل "ولایتی باغ" کے نام سے بنوایا تھا۔ دہلی کے حکمرانوں کا پاس لحاظ ان کے یہاں نام کو بھی نہیں رہا تھا۔ انگریزوں کی شہ پر وہ خود "بادشاہ" بننے کے لئے تیار ہو گئے اور انگریزوں کے دیئے ہوئے "بادشاہ" کے لقب کو خوشی سے قبول کر لیا اس کے معاوضے میں انہوں نے انگریزوں کو باپ کے جمع کئے ہوئے روپیہ میں سے بہت سا روپیہ نذر کیا ہے "شاہی" کے لقب کو مسلم بنانے کے لئے ....

انہوں نے مچھی بھون کے مقابل ایک نیا بازار بسایا تھا، جس کا نام "بادشاہ گنج" رکھا تھا۔

نصیر الدین حیدر کو شعر و ادب اور علم و فن سے کچھ زیادہ لگاؤ تو نہیں تھا، تاہم کچھ شعراء کی سرپرستی ان کے دربار میں رسماً جاری رہی۔ اصل میں اردو شعر و سخن کا ذوق اب لکھنؤ کے سماج میں رچ چکا تھا۔ اور سرپرستی کے بغیر بھی وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ دہلی سے آئے ہوئے شاعروں کے چل بسنے کے بعد وہاں کوئی ادبی خلا پیدا نہ ہوا۔ بلکہ فیض آباد اور لکھنؤ کی خاک سے نئے سخنور اٹھے۔ اُن میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جو دربار اور سرپرستی سے بہ احتیاط بچتے رہے۔ انہیں شاعروں اور ان کے بعد ابھرنے والے ادیبوں کے کارناموں کی بدولت، لکھنؤ کا نام ایک اہم ادبی مرکز کی حیثیت سے اردو کی ادبی تاریخ میں بہت نمایاں ہو گیا ہے۔

لکھنؤ میں جو نیا سماج بن رہا تھا، نئی تہذیب اور شائستگی نشو و نما پا رہی تھی اور جو نیا ادبی شعور اور شعری ذوق ابھر رہا تھا اُس کے ساتھ ساتھ زبان اور اسلوب میں جو عمل اور رد عمل اور نیا بیٹھ بٹھاؤ ہو رہا تھا اس کی شروعات کا اندازہ میر حسن کی "سحر البیان" اور انشاء اور جرات کی شاعری سے کچھ کچھ ہو چکا ہے۔ لکھنؤ کے دبستان کی نشو و نما حقیقت میں شیخ امام بخش ناسخ اور حیدر علی آتش سے

ہونے لگی۔

ناسخ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اور عنفوان میں وہ لکھنؤ آ گئے تھے۔ اس زمانے میں استادِ شعراء میر زندہ تھے۔ ناسخ کو بھی شعر و سخن سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اور آزاد لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ اپنی غزل لے کر میر کے پاس گئے۔ میر نے ضروری اصلاح دے دی لیکن ناسخ بہت آزاد طبیعت انسان تھے ان کو اس بات کا احساس ہوا کیوں نہ اپنی اصلاح میں خود آپ کرو۔ چنانچہ اس کے بعد سے وہ شعر کہہ کر رکھ چھوڑتے اور بعد میں اس کی اصلاح کرتے جاتے۔ لیکن ابھی تک ان میں اتنی خود اعتمادی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ مشاعرے میں غزل پڑھنے کی جرأت کرتے۔

ناسخ غزل کے استاد ہیں۔ غزل میں انہوں نے ایک خاص اسلوب کی ابتدا کی جس میں جذبات سے زیادہ زبان، الفاظ اور اسلوب کو اہمیت حاصل ہے۔

ناسخ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مصحفی سے بھی کچھ دنوں تک اصلاح لیتے رہے۔ لیکن بعد میں ایک شعر پر ان سے تکرار ہوگئی اور ناسخ نے ان کے یہاں جانا ترک کر دیا۔ اس کا سبب آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ ناسخ طبیعت کے حساس واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ غازی الدین حیدر نے جب انہیں خطاب دینا چاہا تو انھوں نے اس بنا پر اسے رد کر دیا کہ ان کا مقام "بادشاہ" کی حیثیت سے

کچھ نہیں تھا. وہ اپنے آپ کو دہلی کے بادشاہ کے خطاب اور اعزاز کا مستحق سمجھتے تھے. مہاراجہ چندو لال نے انہیں بارہ پندرہ ہزار روپیہ بھیج کر حیدرآباد آنے کی دعوت دی. لیکن وہ نہیں گئے. دوسری طرف دہلی سے جو شاعر لکھنؤ آئے تھے، ان کے لئے زبان یقیناً ایک متماد فاصلہ بن گئی تھی، اور لکھنؤ کی اردو میں دہلی بولنے والوں کو وہ بے زبان تو نہیں کہتے تھے لیکن یہ احساس ضرور تھا کہ یہ اہل زبان نہیں ہو سکتے. اس کا اندازہ انشاء کی "دریائے لطافت" کی بعض بحثوں سے ہو سکتا ہے. مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ "پورب والے "کل ہم، تمہارے یہاں گئے تھے" کی بجائے "کل ہم تمہارے کے یہاں گئے تھے" بولتے ہیں. وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے روزمرہ کو اہل دہلی کی صحبت میں صحیح کیا، لیکن لب و لہجہ سے مجبور ہیں. زبان کھولی اور پہچان لئے گئے. گو اہل شاہجہاں آباد گفتگو کرتے وقت پورب کی زبان کے ایک دو لفظ بول جائیں. اور پوربی، اردو کے روزمرہ کے مطابق گفتگو کرے اور اپنے ملک کا ایک لفظ بھی اس میں داخل نہ کرے تاہم لب و لہجہ سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ شاہجہاں آبادی ہے. اور یہ پوربی. کچھ اسی طرح کے خیالات تھے جو ناسخ کے مصحفی سے روٹھنے کا باعث ہوئے اور یہی ناسخ کی شاعری اور اس کے مخصوص کردار کی تشکیل کے ذمہ دار بھی ہوئے. ناسخ اہل دہلی کے اعتراض کو رفع کرنے

کے لیئے جذبات اور احساسات کی قربانی کرکے بھی شعر میں زبان کو اہمیت دینے پر مجبور تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ناسخ زبان کے بہت بڑے استاد تو مانے جانے لگے، لیکن شاعر وہ بہت کم رہ گئے۔ انھوں نے دہلی کے مخصوص الفاظ اور فقروں اور محاوروں کو ترک کرکے اور ان کی جگہ فارسی اور عربی الفاظ کو داخل کرکے زبان کو قید مقام سے آزاد کیا، اور اس کو ایک عام زبان کے طور پر ترقی کرنے کے راستے پر ڈال دیا۔

ناسخ کے اچھی شاعری میں، زبان پر ساری توجہ صرف کرنے کے باوجود بھی ان کی بعض غزلیں اور غزلوں میں بعض شعر بہت اچھے نکل آئے ہیں۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی، ان کی شاعری سے شعری تصورات کو کچھ بڑا فائدہ نہیں پہنچا۔ ان کی غزل پڑھتے ہوئے کچھ ایسا لگتا ہے کہ وہ دل سے نہیں دماغ سے شاعری کر رہے ہیں، وہ خیال اور جذبات کے بجائے لفظوں اور صنعتوں سے شاعری کرنا چاہتے ہیں۔ جو حقیقت میں شاعری نہیں ہے۔ ناسخ کی غزل کے کچھ شعر ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔

میری آنکھوں نے تجھے دیکھ کے وہ کچھ دیکھا
کہ زبانِ مژہ پر شکوہ ہے بینائی کا

تو وہ خورشید ہے۔ اسلئے جو گلستان میں نقاب
چہرۂ گل میں تلون ہو وہیں حربا کا

جنوں پسند ہے مجھ کو ہو بولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

ذبح وہ کرتا تو ہے پر چاہئیے اے مرغ دل
دم پھڑک جائے تڑپنا دیکھ کر صیاد کا

ناسخ کے معاصرین میں خواجہ حیدر علی آتش بہت اونچا پایہ رکھتے ہیں. وہ لکھنؤ کے اساتذہ غزول میں زبان کی سلامت کی وجہ سے ممتاز ہیں. ان کے والد دہلی کے رہنے والے تھے لیکن فیض آباد آ گئے تھے. اور بعد میں لکھنؤ چلے گئے. آتش مصحفی کے شاگرد تھے. اس لئے مصحفی کی سادہ بیانی کا ان پر اثر ہے. تاہم اس زمانے میں لکھنؤ کے استاد اول ناسخ کے اثر سے شعری فضا پر ہی صنعت گری چھائی ہوئی تھی اس لئے آتش بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکے. ناسخ میں اور ان میں چشمک تھی. لیکن غیر شعوری طور پر وہ ناسخ کا انداز اختیار کر لیتے ہیں. آتش کے یہاں ایسے اشعار بہت ہیں جو عمدہ تغزل کے نمونے کہے جا سکتے ہیں. ناسخ زبان کو صحت کے ساتھ برت گئے لیکن آتش زبان کو حسن کے ساتھ استعمال کرتے ہیں. اسی لئے میر، سودا، میر حسن، غالب وغیرہ کی طرح آتش کے کئی اشعار اپنی عمومیت اور حسن اسلوب کی وجہ سے ضرب المثل کے طور پر استعمال ہونے

لگے ہیں۔ مثلاً ان کی ایک مشہور غزل کے کچھ اشعار ہیں ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

صیاد گلعذار دکھاتا ہے سیر باغ
بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا

غازی الدین حیدر اور ان سے بڑھ کر ان کی بیگم کو مذہبی امور سے زیادہ لگاؤ تھا۔ لکھنؤ کے حکمرانوں کا مذہب شیعہ تھا، اور بادشاہ اور ان کی بیگم کی وجہ سے مذہب کا اثر دربار میں اور دربار سے گذر کر سارے شہر میں پھیلنے لگا۔ حکمرانوں کی اسی مذہبی دلچسپی کی بدولت لکھنؤ کی تہذیبی اور مجلسی زندگی میں رفتہ رفتہ بہت سے نئے عقائد نشو و نما پاتے گئے۔ عشرہ محرم میں اور اس کے بعد بھی امام کے چہلم تک بہت سے رسوم اور عزاداری کی نئی نئی باتیں رائج ہوئیں۔ اس عقیدت مندی کے باعث غازی الدین حیدر نے دریا کے کنارے موتی محل سے لگا ہوا نجف اشرف بنوایا تھا۔ جہاں مرنے کے بعد وہ دفن ہوئے۔

غازی الدین حیدر اور ان کے جانشینوں کے بڑھے ہوئے مذہبی رجحان کے نتیجے کے طور پر مذہبی عقائد سے زیادہ رفتہ رفتہ اُن کے تہذیبی اور ادبی پہلو ابھرنے گئے۔ اسی کا ایک اہم عنصر مرثیہ نگاری، مرثیہ اور نوحہ خوانی اور سلام ہے جن کو لکھنؤ میں ایک نئی زندگی ملی۔ اردو کے سربرآوردہ مرثیہ نگار شاعر میر ببر علی انیس اور مرزا سلامت علی دبیر کے ادبی شعور کا نشو و نما غازی الدین حیدر ہی کے عہد میں ہوا، مرثیہ کا تعلق ادبی اور مجلسی زندگی سے زیادہ ہوگیا تھا۔ اس لئے کہ مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ ماحول کے اسی اقتضا نے ان دونوں شاعروں کو دوسری شعری اصناف سے ہٹ کر مرثیہ پر پوری توجہ مبذول کرنے کی طرف مائل کیا۔ چنانچہ اِن اساتذہ نے مرثیہ کو بہ حیثیت ادبی اور شعری فن کے اتنا اونچا اٹھایا کہ اس میں بانبہ شاعری، رزمیہ شاعری مرقع نگاری اور جذبات نگاری کے جوہر نمایاں ہونے لگے۔

لکھنؤ میں مرثیہ اور مثنوی کی نشو و نما کا ایک سبب غزل کی اس یکسانیت اور روایت پسندی کے خلاف ردعمل بھی تھا۔ جو اب غزل میں پیدا ہوگئی تھی۔ میر حسن نے مثنوی کا ادبی معیار اونچا کرکے لکھنؤ کے شعراء میں مثنوی نگاری کا ایک مذاق سا پیدا کر دیا تھا چنانچہ میر حسن کے بعد میر تقی خاں ہوس، پنڈت دیا شنکر نسیم، آفتاب الدولہ قلق، نواب مرزا شوق، جیسے مثنوی نگار اٹھے۔ آخری تاجدار اودھ

واجد علی شاہ اختر نے بھی کئی مثنویاں لکھی تھیں۔ لیکن مرثیہ نگاری میں انیس اور دبیر کے بعد ان کی ٹکر کے لکھنے والے پیدا نہ ہو سکے۔

انیس اور دبیر نے اپنے مرثیوں کے ذریعے سے اردو شاعری کے پایہ کو بلند کیا۔ اس کی حدود میں وسعت پیدا کر دی اور داخلی شاعری سے ہٹ کر خارجی شاعری کے بہت سے محاسن اس میں پیدا کئے۔

انیس اور دبیر دونوں معاصر تھے۔ اور دونوں نے بہ یک وقت، ایک ہی صنف شاعری کو منتخب کیا تھا۔ لیکن ان کی طبیعت کے جوہر جداگانہ مختلف تھے۔ انیس سادہ پرکار صناع ہیں اور دبیر عالم، شاعر۔ اسی لئے میر انیس نے شاعری کی زیادہ خدمت انجام دی اور دبیر نے عقائد کی۔ انیس نے اپنے بعض مرثیوں میں امام حسین کی جنگ کی تفصیلات کے سلسلے میں آپ کے گھوڑے کی پھرتی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کے ایک دو بند یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

سمٹا، جما، اڑا، ادھر آیا ادھر گیا
چمکا، پھرا، جمال دکھایا، ٹھہر گیا
تیروں اڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا
برہم کیا صفوں کو پرے سے گذر گیا

گھوڑوں کا تن کبھی ٹاپ سے اس کے فگار تھا
ضربت تھی نعل کی سروہی کا وار تھا

آہو کی جست، شیر کی آمد، پری کی چال
کبکِ دری خجل، دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال
اِک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال

غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد ۱۸۲۷ء میں ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت پر بیٹھے، نصیر الدین حیدر باپ کے حقیقی جانشین تھے۔ انگریزوں کی سیادت ان کو باپ دادا سے ورثے میں ملی تھی۔ باپ کا مذہبی جذبہ بھی ان میں تھا۔ چنانچہ باپ نے نجف اشرف بنوایا تھا تو بیٹے نے کربلا بنوائی۔ نصیر الدین حیدر نجوم پر عقیدہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک رصدگاہ بنوائی تھی، جو عوام میں ..... "تارے والی کوٹھی" کے نام سے مشہور تھی۔ یہ رصدگاہ ایک انگریز ہیئت داں، کرنل ولکاکس کے انتظام میں تھی۔ اس کے لئے بڑی بڑی دوربینیں ولایت سے منگوائی گئی تھیں۔ کہتے ہیں کہ یہ رصدگاہ واجد علی شاہ کے زمانے تک رہی۔ واجد علی شاہ نے اس کی دوربینوں کو کوئی کھلونا جان کر حیدری نامی طوائف کو دے دیا۔ اور حقیقتہ

ختم ہوگیا۔

نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ائمہ اثنا عشر کے احترام کے مراسم میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔ اسی طرح محرم کی اعزاداری کے سلسلے میں بھی بہت سی نئی روایتیں قائم ہو گئی تھیں۔ نصیر الدین حیدر کے انتقال پر پھر نزاع پیدا ہوئی۔ ان کی بیگم منا جان کو بادشاہ بنانا چاہتی تھیں اور انگریز سعادت علی خاں کے بیٹے نصیر الدولہ کے حق میں تھے۔ رزیڈنٹ کے منع کرنے کے باوجود بیگم نے منا جان کو تخت پر بیٹھا دیا۔ رزیڈنٹ نے بہت کوشش کی کہ منا جان تخت خالی کر دیں۔ لیکن بیگم نے نہیں مانا۔ آخر انگریز فوجوں نے جو پہلے سے تیار رکھی گئی تھیں گولہ باری شروع کر دی۔ بہت سے لوگ مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ منا جان تخت سے گر کر بھاگنا چاہتے تھے کہ گرفتار کر لئے گئے۔ اور نصیر الدولہ محمد علی بادشاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھائے گئے۔

محمد علی بادشاہ جب تخت پر بیٹھے وہ ۶۳ برس کے بوڑھے تھے۔ اس لیے وہ احتیاط سے کام کرتے رہے۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے عمل دخل کی روک تھام کا ان کے پاس کوئی منتر نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی توانائیوں کو اعتقادی کاموں میں صرف کرنے کو بہتر جانا۔ انہوں نے حسین آباد میں امام باڑہ تعمیر کیا۔ اور ایک عالی شان مسجد بھی بنوانے لگے۔ تھے اور چاہتے

تھے کہ یہ مسجد دہلی کی جامع مسجد سے سبقت لے جائے۔ آبادی کی وسعت اور رونق کے لحاظ سے یہ لکھنؤ کا بہترین زمانہ تھا۔ غالباً کسی انگریز نے بادشاہ کے سامنے اس زمانے کے لکھنؤ کو بابل سے تشبیہ دی تھی۔ بادشاہ کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا۔ بابل کے سات منزلہ مینار کی طرح کی ایک عمارت بنوا کر اسے پورا بابل بنانے کی انہوں نے جی میں ٹھان لی اور اس مقصد سے ایک سات منزلہ عمارت تعمیر کرنی شروع کی تھی۔ اس کی پانچ منزلیں بننے پائی تھیں کہ محمد علی بادشاہ کا انتقال ہوا اور یہ عمارت نامکمل رہ گئی۔ اب اس کے کھنڈر باقی رہ گئے ہیں۔ اور "ست کھنڈے" کے نام سے موسوم ہیں۔

محمد علی بادشاہ کے جانشین ان کے بیٹے امجد علی شاہ ہوئے محمد علی شاہ نے ان کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا تھا اور اچھے اچھے علماء و فضلاء اس کام کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امجد علی شاہ کو مذہب میں اتنا غلو ہو گیا کہ وہ پورے ملا بن گئے تھے۔ بادشاہ ہونے کے بعد ان کی بڑی خواہش یہ تھی کہ لوگ ان کی اقتدا کریں۔ ان کی اس طرح کے مشاغل کی وجہ سے ریاست کے کاروبار میں ابتری پیدا ہونے لگی تھی۔ کچھ تعمیری کام جو ان کے ایما سے انجام پائے ان میں دریا پر لوہے کا ایک پل تھا جو اب تک موجود ہے۔ محمد علی شاہ کی زندگی کا سب سے زیادہ پائدار کارنامہ غالباً حضرت گنج کی

آبادی تھی۔ یہ محلہ اور بازار آج تک موجود ہے، اور لکھنؤ کا سب سے زیادہ بارونق محلہ اور چہل پہل کا مرکز ہے۔ اسی زمانے میں امجد علی شاہ کے وزیر امین الدولہ نے امین آباد بسایا تھا یہ بھی حضرت گنج کی طرح آج تک آباد اور بارونق ہے۔

امجد علی شاہ کا انتقال ۱۸۴۷ء میں ہوا اور واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ ان کا عہد لکھنؤ کی شاہی تاریخ کا آخری باب ہے واجد علی شاہ کو بھی ان کے باپ نے مذہبی آدمی بنانا چاہا تھا۔ لیکن وہ کچھ بنے اور کچھ نہ بن سکے۔ ان کی طبیعت فطرتاً عیش پسند واقع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ائمہ طاہرین کے احترام میں انہوں نے جو کچھ کیا اور عورتوں کو ممتوعات بنا کر رکھنے کا جو اہتمام کیا وہ باپ کی تربیت کا اثر تھا۔ اس کے مقابلے میں عورتوں کی فوج تنظیم دینے کی کوشش اور اسی طرح کے دوسرے واقعات ان کے ذاتی رجحانات کا پتہ دیتے ہیں۔ طبیعت اور تربیت کو انھوں نے اس طرح ملا دیا تھا کہ جو عورتیں انہیں پسند آتی تھیں انہیں ممتوعہ بنا کر محل میں داخل کر لیتے۔ اور انہیں محل کا خطاب دیتے تھے۔ عورتوں کی فوج اور مردانہ فوج کی قواعد بھی وہ خود ہی لیا کرتے تھے۔ اور فوجی قواعد کے احکام کے لیئے فارسی اصطلاحیں جیسے "راست رو" "پس بیا"، "دست چپ بگرد"، وغیرہ خود انہوں بنائی تھیں۔

واجد علی شاہ کی عیش کوشی کے رجحان نے انہیں موسیقی کی

طرف بھی مائل کیا تھا۔ اصل میں شجاع الدولہ کے عہد سے لکھنؤ کے معاشرہ کا ایک اہم جز موسیقی بھی بن گئی تھی۔ شجاع الدولہ اہلِ ہنر کے بڑے قدردان تھے ان کو موسیقی کا بھی شوق تھا۔ اس کے باعث ہزاروں گانے بجانے والی عورتیں اور مرد دہلی سے لکھنؤ آکر آباد ہو گئے تھے۔ غازی الدین حیدر کو بھی موسیقی سے بہت دل چسپی تھی۔ ان کے زمانے میں اچھے اچھے گویئے لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے انہیں میں سے ایک حیدری خاں مشہور گویئے تھے۔ وہ ذرا آشفتہ مزاج واقع ہوئے تھے اس لئے سڑی حیدری خاں مشہور تھے۔ غازی الدین حیدر کو ان کا گانا سننے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن غازی الدین حیدر ہوادار پر سوار دریا کی سیر کو نکلے تھے۔ اور رومی دروازے کے پاس پہنچے تھے کہ کسی نے بتایا، سڑے حیدری خاں جا رہے ہیں۔ بادشاہ نے انہیں بلوایا اور گانا سنانے کی خواہش ظاہر کی۔ حیدری خاں نے جواب دیا۔ "جی ہاں" کیوں نہ سناؤں گا۔ مگر مجھے آپ کا مکان نہیں معلوم ہے"۔ بادشاہ وقت کے لئے یہ عجیب جواب تھا۔ لیکن غازی الدین حیدر نے اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ ان کو محل بلوا کر ان کی ناز برداری کی اور گانا سنا۔

واجد علی شاہ کے عہد میں بھی موسیقی کا بہت چرچا رہا لیکن فنی اعتبار سے اس کا معیار گھٹ گیا تھا۔ ان کے بعد لوگوں میں انیس الدولہ اور مصاحب الدولہ مشہور تھے۔ واجد علی شاہ بھی

سنگیت کے فن سے واقف تھے اور اس فن کو باسط خاں نامی استاد سے سیکھا تھا۔ گانے کے ساتھ نرت یعنی ناچ کو بھی لکھنؤ میں بہت ترقی ہوئی تھی۔

واجد علی شاہ کو رہس کا بہت شوق تھا۔ رہس اور لیلا کے جلسوں میں وہ خود حصہ لیتے تھے۔ اور کنھیا بننے اور ان کی معشوقات گوپیوں کا بھیس لیتیں۔ واجد علی شاہ نے اپنا مشہور قیصر باغ اسی طرح کے مشاغل کے لئے بنوایا تھا۔ یہاں برسات کے موسم میں بسنت کا میلا لگتا تھا۔ جس میں عوام کو بھی آنے کی اجازت تھی۔ قیصر باغ کے یہ میلے مشہور تھے اور دہلی کی پھول والوں کی سیر کا عکس ہوتے تھے۔ ان میلوں میں بادشاہ جہاں پناہ موتیوں کی راکھ جسم پر ملتے اور لیلا ہوتی۔ واجد علی شاہ کے اسی شوق نے ان کے زمانے کے مشہور شاعر امانت کو "اندر سبھا" لکھنے کی ترغیب دی جسے بعد میں پارسی ناٹک کمپنیوں نے باضابطہ ناٹک بنا دیا۔ اور شہر شہر گھوم کر دکھاتے پھرتے تھے۔ امانت کی "اندر سبھا" کی مقبولیت نے مداری لال کو ایک ایک اندر سبھا لکھنے پر مائل کیا۔ جو مداری لال کی اندر سبھا کہلاتی ہے لیکن یہ زیادہ مقبول نہیں ہو سکی۔

واجد علی شاہ کے زمانے شعر و شاعری کا چرچا بھی بہت پھیل گیا تھا جتنے شاعر اس زمانے میں لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے وہ سارے ہندوستان کے شاعروں کی تعداد سے زیادہ تھے۔ لیکن جہاں تک

شاعری کے معیاروں کا تعلق ہے، اس عہد میں کچھ ترقی نہیں ہوئی اس زمانے میں ناسخ اور آتش کے تلامذہ میں امداد علی بحر، سید اسمٰعیل حسن منیر، سید محمد خاں رند اور وزیر علی صبا کی شاعری کی دھوم تھی۔
منیر الدولہ برق، واجد علی شاہ کے مصاحب اور استاد تھے۔ انھوں نے ایک ضخیم دیوان چھوڑا ہے۔ لیکن کلام میں تکلف اور تصنع بہت ہے۔
ناسخ کے ایک اور شاگرد امداد علی بحر کا شمار اپنے زمانے کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ وہ غزل اچھی کہتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی ناسخ کی طرح سے بعض جگہ تصنع کے آثار ملتے ہیں۔ صحت زبان اور الفاظ کی تحقیق کے معاملے میں بھی وہ اپنے استاد کے قدم بہ قدم تھے۔ مرزا مہدی حسن آباد، ایک پرگو شاعر تھے۔ اُن کے دو دیوان، ایک مثنوی اور ایک واسوخت یادگار ہیں۔

واسوخت کی صنف کو بھی لکھنؤ میں ترقی ہوئی۔ امانت نے اندرسبھا کے علاوہ ایک واسوخت بھی لکھی تھی جو ان کے شعری کارناموں میں اہمیت رکھتی ہے۔ خواجہ محمد وزیر وزیر، میر علی اوسط رشک۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر اور سید اسمٰعیل حسین منیر ناسخ کے نامی شاگرد ہوئے ہیں۔

آتش کے شاگردوں کی بھی ایک کثیر تعداد اس زمانے میں لکھنؤ میں موجود تھی۔ ان میں نواب سید محمد خاں رند، آتش کے بعد غزل کے استاد مانے گئے ہیں۔ ان کے کلام میں صفائی ہے۔ وزیر علی صبا، واجد علی

شاہ کے دربار سے دوسو روپیہ ماہوار پاتے تھے۔ وہ عاشقانہ رنگ میں غزل اچھی کہتے تھے۔ ان کا ایک ضخیم دیوان "غنچہ آرزو" کے نام سے موسوم ہے۔ ایک مثنوی "شکارنامہ واجد علی شاہ" بھی انھوں نے لکھی تھی۔

آتش کے شاگردوں میں پنڈت دیا شنکر نسیم کو اُن کی مثنوی "گلزار نسیم" کی وجہ سے بڑی شہرت ہوئی۔ اس مثنوی کا اسلوب "اپنے ایجاز" تشبیہوں کی ندرت، استعاروں اور صنائع بدائع کی بدولت اپنی مثال آپ بن گیا ہے۔ اس کا قصّہ گل بکاؤلی کا پرانا قصّہ ہے، لیکن نسیم نے اپنے اسلوب کی ندرت سے قصّے میں نئی جان ڈال دی ہے۔ بعض وقت اس مثنوی کے اسلوب کو لکھنؤ کے اسلوب کا نمائندہ بھی سمجھا گیا ہے، بکاؤلی کے باغ سے گل غائب ہونے کے بعد اس کی جو حالت ہوئی، اس کا نقشہ نسیم نے اس طرح کھینچا ہے ؎

گل کا جو الم چمن چمن ہے
یوں بلبل خامہ نعرہ زن ہے
گلچیں نے وہ پھول جب اُڑایا
اور غنچہ صبح کھکھلایا
وہ سبز باغ خواب آرام
یعنی وہ بکاؤلی گل اندام

جاگی مرغ سحر کے غل سے
اٹھی نکہت سی فرش گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پھر آب رہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل
جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل
سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا
شمشاد انہیں سولی پہ چڑھانا

مثنوی نگاری میں نواب مرزا شوق نے بھی ایک معین مقام پیدا کرلیا ہے۔ شوق آتش کے شاگرد تھے۔ انہوں نے کئی مثنویاں لکھیں جن میں "زہر عشق" اور "بہار عشق" اہمیت رکھتی ہیں۔ شوق کی مثنویوں کا

مقاصد یوں تو فقرہ پیش کرنا بھی ہے۔ لیکن ان مثنویوں کے ذریعے سے لکھنؤ کی عورتوں کی بول چال اور ان کے مخصوص محاوروں کو قلمبند کرنا ان کے زیادہ پیش نظر تھا۔ اس اعتبار سے، شوق کی مساعی، انشاء، جہات اور رنگین کی ریختی کا ایک دوسرا روپ تھا۔ اصل میں ریختی کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہیں خواتین کی زبان میں لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ شوق کی مثنویوں کے قصے سارے کے سارے حزنیہ ہیں۔ کہیں کہیں کچھ خلاف عادت واقعات بھی ان میں شامل ہوگئے ہیں۔ تاہم فوق فطری واقعات سے یہ مثنویاں پاک ہیں۔ ریختی اور شوق کی مثنویوں کا محرک ایک ہی تھا۔ لیکن ان کی پیش کش کے طریقے جدا جدا ہیں۔ ریختی کے قابل اعتراض واقعات ان مثنویوں میں نہیں ملتے۔

واجد علی شاہ کو بھی شعر و شاعری سے بہت لگاؤ تھا۔ انہوں نے چھ دیوان، سات مثنویاں، مراثی کی تین جلدیں چند قصائد کے علاوہ کئی نثری رسالے بھی اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کی مثنویوں میں "دریائے تعشق" سب سے زیادہ اہم ہے۔ "حزن اختر"، آپ بیتی ہے۔ جس میں واجد علی شاہ نے خود اپنے حالات اور سفر کی صعوبتوں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ واجد علی شاہ کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہ خطوط مقفیٰ اور مسجع عبارتوں میں لکھے ہوئے ہیں۔

لکھنؤ کے دوسرے نثری کارناموں میں فقیر محمد خاں گویا اور

رجب علی بیگ سرور کے قصے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ گویا لکھنؤ کے ایک رئیس اور شاہی فوج میں رسالدار تھے۔ ناسخ سے ان کو تلمذ تھا ناسخ کے شعری اسلوب کو انھوں نے نثر میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ گویا نے انوارِ سہیلی کا ترجمہ اردو میں " بستانِ حکمت " کے نام سے کیا تھا۔ ترجمہ میں انھوں نے فارسی انشاء کا مقفیٰ اور مسجع انداز اختیار کیا۔ اس ترجمے کی اہمیت ادبی کم اور تاریخی زیادہ ہے۔

" بستانِ حکمت " کے مقابلے میں رجب علی بیگ سرور کا قصہ " فسانۂ عجائب " ادبی اہمیت رکھتا ہے۔ مقفیٰ نگاری کے علم انداز کا اثر سرور پر بھی ہے۔ لیکن وہ اس کا استعمال اعتدال کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ بول چال کی زبان میں بھی لکھتے ہیں " فسانۂ عجائب " کا دیباچہ اصل کتاب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں سرور نے لکھنؤ کی خوبی، اس کے دلکش مناظر اور مختلف پیشوں کے سربرآوردہ لوگوں کا تذکرہ اس عمدگی سے کیا ہے کہ آخری شاہانِ اودھ کے زمانے کا لکھنؤ اور اس کی چہل پہل کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے ان کے بیان کا ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔

" سبحان اللہ بحمدہ عجیب شہر گلزار ہے، ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے۔ ہر شخص اپنے طور کا با وضع قطعدار ہے۔ دورویہ بازار کس انداز کا ہے۔ ہر دوکان میں سرمایہ ناز و نیاز کا ہے۔ ہر چند ہر محلے میں جہان کا ساز و سامان مہیا ہے۔ پر اکبری دروازے سے جلو خانے اور پکے پل تک کہ

صراط مستقیم ہے۔ کیا جلسا ہے۔ نان بائی خوش سلیقہ بشیرمال، کباب، نان، نہاری، جہاں کی نعمت اس آبہاری کی جس کی بُو باس سے دل طاقت پائے۔ دماغ معطر ہو جائے، وہ سرخ سرخ پیاز سے نہاری کا بگھار، سڑیلی جھنکار بشیرمال شنگرف کے رنگ کی خستہ بھری بھری، ایک بار کھائیے، نان نعمت کا مزہ پائیے، تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔ کباب اس آب و تاب کے کہ مرغ و ماہی کا دل سینہ آہ حسرت بھری سے کباب، حبیتی کے حلوا سوہن پر عجب جوبن۔ اس کی شیرینی کا گفتگو میں لب بند، جہاں کو پسند آیا

آگے اسی دلچسپ انداز میں وہ قاری کو لکھنؤ کی سیر کرانے اور ہر ہر دکان پرمنٹ دو منٹ کے لیئے رک کر اس کا تعارف کرانے اور وہاں کے لذائذ اور لطافتوں کا مزہ چکھانے جاتے ہیں، اثنائے راہ میں وہ مشاہیر لکھنؤ کے ہر پیشے کے سربرآوردہ اشخاص سے بھی تعارف کراتے جاتے ہیں۔

مٹیابرج کلکتہ

واجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ کی حکومت کی بساط الٹی اور اس کے ساتھ ہی ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کا دور آیا۔ جس نے لکھنؤ کی تہذیب اور شائستگی کے عناصر اور شعری اور ادبی ذوق کو منتشر کر دیا۔

۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے سلطنت اودھ کو اپنے قبضے میں

لینے کا تصفیہ کر لیا۔ اور واجد علی شاہ کو تخت سے ہٹا کر ان کے اخراجات کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا۔ واجد علی شاہ اس فیصلے کے خلاف گورنر جنرل سے داد خواہی کے لئے کلکتہ گئے۔ اگر وہاں کامیابی نہ ہو تو ان کا ارادہ انگلستان جانے کا تھا۔ تاکہ حکومت برطانیہ سے فریاد کریں۔ لیکن وہ کلکتہ وہ ایسے گئے کہ وہیں کے ہو رہے۔ گورنر جنرل سے کچھ مطلب براری نہ ہو سکی۔ لیکن طبیبوں نے بحری سفر سے انہیں منع کیا۔ اس لئے انہوں نے اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ ولیعہد کو انگلستان روانہ کیا اور خود کلکتہ میں رہ گئے۔ ان کے قیام کے لئے انگریزوں نے بھاگیرتی ندی کے کنارے مٹیا برج کے پاس کی کئی کوٹھیاں انہیں دے دیں۔

واجد علی شاہ کو کلکتہ پہنچے ہوئے مشکل سے کچھ مہینے گذرے ہوں گے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ اور دہلی سے لے کر میرٹھ عظیم آباد اور بنگالے تک یہ آگ پھیل گئی۔ کلکتہ میں باغیوں نے واجد علی شاہ کے ایک دس سالہ لڑکے کو تخت پر بٹھایا۔ اور واجد علی شاہ کی ملکہ حضرت محل مختار بنیں۔ لیکن ان کے مقابلے میں ایک اور حکومت باغیوں نے احمد اللہ شاہ کی سرکردگی میں بھی قائم کر لی تھی کچھ شیعہ سنی اختلافات بھی رونما ہو گئے تھے۔ اس بے ترتیبی اور بے مرکزیت کی وجہ سے ہندوستانیوں کی پیش نہ جا سکی اور انگریزوں کو کامیابی ہوئی اس کے بعد دار و گیر کا بازار گرم ہوا۔ ہزاروں خاندان تباہ ہو گئے اور جو بچ سکے اپنی جان بچا کر لکھنؤ سے نکل گئے۔

ہنگامہ کے زمانے میں واجد علی شاہ کو فورٹ ولیم کالج میں نظر بند رکھا گیا تھا۔ جب انگریزوں کی جیت ہوگئی اور کوئی خدشہ باقی نہ رہا تو انہیں مٹیا برج منتقل کر دیا گیا۔ اس دوران میں واجد علی شاہ کے رفیقوں نے انہیں مقدمے سے دست کش ہونے اور ۔ ۔ ۔ ۔ انگریزوں کی پنشن قبول کر لینے کا مشورہ دیا۔ جسے انہوں نے منظور کر لیا۔

اب واجد علی شاہ کو یقین ہوگیا کہ انہیں کلکتہ ہی میں قیام کرنا ہے، کیونکہ لکھنؤ وہ اب کس منہ سے جا سکتے تھے۔ مٹیا برج میں انہوں نے شاہی کروفر کے سامان مہیا کرنے شروع کر دیئے۔ متوعات بنانے کا سلسلہ پھر جاری ہوگیا۔ مثلاً ایک بھشتی کو انہوں نے آب رساں بیگم کا خطاب دے کر محل میں داخل کر لیا۔ ایک مہترانی کو رانی بنا کر انہوں نے مصفا بیگم کے خطاب سے نوازا۔ ناچنے گانے والیوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کی ایک پوری پلٹن متوعات میں داخل تھی۔ کچھ رادھا منزل والیاں تھیں، کچھ جھومر والیاں کچھ لکن والیاں، ایک طائفہ نتھ والیوں کا تھا، ایک گھونگھٹ والیوں کا اور یہ سب کی سب بیگمیں بنائی گئی تھیں۔

واجد علی شاہ نے مٹیا برج میں کئی نئی عمارتیں بھی بنوائیں۔ ان کا ایک سلطانہ خانہ تھا۔ اس میں اسد منزل، مرصع منزل، شہنشاہ منزل تفریح بخش، بادامی، آسمانی، سلطانی اور نہ جانے کیسے کیسے ناموں سے

انہوں نے چھوٹی بڑی عمارتیں بنوا ڈالیں۔ باغ لگوائے، تالاب اور حوض بنوائے۔ اور ان سب پر طرہ یہ کہ وحشی اور پالتو جانوروں اور پرندوں کا ایک اچھا خاصہ عجائب خانہ تیار کرا دیا۔ اس طرح سے ان کے ذوق و دلچسپی میں اگر کچھ چیزوں کی کمی رہ گئی تو ان کی تکمیل کی یہاں کوشش کی۔

اردو شاعروں میں سے کئی شاعر جن کو ان کے دربار سے علاقہ تھا۔ ان کے ساتھ کلکتہ آ گئے تھے۔ ان میں سے سات سربرآوردہ شعراء تھے جن میں وہ اکبر کے نورتن کے توڑ پر سبعہ سیارہ کہتے تھے۔ ایک فتح الدولہ برقؔ تھے جو ناسخؔ کے شاگرد تھے۔ اور غزل ناسخؔ ہی کے رنگ میں کہتے تھے۔ ان کو واجد علی شاہ کے ساتھ وفاداری پر فخر تھا چنانچہ اپنے انتقال سے پہلے ایک شعر بادشاہ کی خدمت میں لکھ کر بھیجا تھا ؎

برقؔ، جو منہ سے کہا تھا وہی کر کے اٹھے
جان دی آپ کے دروازہ پہ مر کے اٹھے

دوسرے مہتاب الدولہ درخشاںؔ، اسیرؔ کے شاگرد تھے اور اپنی یگانہ روئی کی بدولت ممتاز تھے۔ گلشن الدولہ بہارؔ، بھی ناسخؔ کے شاگرد تھے اور اپنے زمانہ کے اچھے مرثیہ گو تھے۔ مرثیہ لکھتے بھی خوب تھے۔ اور پڑھتے بھی خوب تھے۔ برقؔ کے بھتیجے، مالک الدولہ صولتؔ، ناسخؔ کے بڑے معتقد تھے۔ اور ان کا دیوان پڑھتے نہیں تھے بلکہ اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ ناسخؔ کے ایک اور شاگرد مرزا مسیتا عیشؔ

نیز مرزا امداد علی یاور بھی مٹیا برج میں موجود تھے، یاور، برق شاگرد تھے۔ وہ شاعر تو بہت زیادہ مشہور نہیں مگر ان کے بعض شعر بہت مشہور ہیں۔ مثلاً

رہ گئی رات کٹ گئی شب ہجر
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی
آنکھوں آنکھوں میں لے لئے گئے دل
کانوں کان ایک کو خبر نہ ہوئی

مظفر علی منیر ولی عہد اور بادشاہ کے بعض محلات کے استاد تھے شیخ صادق علی مائل، بادشاہی مرثیے کے نواسے اور آتش کے بڑے معتقدین میں سے تھے۔ بادشاہ کے داماد، مرزا جہاں قدر ہنر اور شہزادہ مرزا آسماں جاہ انجم اور ولی عہد حامد علی مرزا کوکب، سب شاعر تھے جس طرح شاہ عالم بادشاہ کے فرزندوں نے اُن کے تخلص آفتاب کی رعایت سے اپنے تخلص شعاع، قمر وغیرہ رکھ لئے تھے اسی طرح واجد شاہ اختر کے فرزندوں نے تخلص منیر، کوکب، سب، اختر کے ضلعے ہیں۔

مٹیا برج میں معرکہ کے مشاعرے بھی منعقد ہوتے رہتے تھے نواب مرزا خاں داغ بھی کچھ دن کے لئے کلکتہ گئے تھے۔ اُن کے آنے کی تقریب میں کئی مشاعرے منعقد ہوئے تھے۔

مٹیا برج، کلکتہ کا یہ مختصر مجمع شعراء دراصل لکھنؤ ہی کی شعری

روایات کا سلسلہ تھا۔ ان شعراء نے اردو شاعری میں فکروفن کے لحاظ سے بھی کوئی اضافہ نہیں کیا۔

دہلی

انیسویں صدی کے ربع دوم میں دہلی کی فضا پھر ایک مرتبہ نئے نغمہ سنجوں کے ترانوں سے گونجنے لگی۔ یہ زمانہ مغلیہ دہلی کے آخری سنبھالے کا تھا۔ مرہٹوں کے ہنگاموں اور احمد شاہ ابدالی کی چڑھائی کے مابعد اثرات بھی لوگوں کے دلوں سے محو ہونے لگے تھے۔ اور بادشاہ اور رعایا کسی قدر اطمینان کا سانس لینے کے قابل ہوئی تھی یہ صحیح ہے کہ دہلی کی وہ اگلی رونق پھر واپس نہ آسکی۔ لیکن اسی خزاں میں بھی اس کی رونق رشک صد گلستاں تھی۔ بہت سے ثقہ خاندان اور اکثر علماء و فضلاء اور شاعر اور صناع جو دہلی سے نکل چکے تھے انہیں اس عرصہ میں لکھنؤ اور کچھ دوسرے مقامات میں پناہ مل گئی تھی اور وہ نئی زندگی شروع کر چکے تھے، انہیں دہلی لوٹنے کا موقع نہیں تھا کچھ شاعر اور صناع جو لکھنؤ میں جم نہ سکے یا جنہیں دہلی سے لگاؤ تھا دہلی آ گئے۔ ان میں شاہ نصیر بھی تھے۔ وہ انتشار اور جبرادت کے زمانے میں لکھنؤ گئے تھے۔ لیکن پھر دہلی لوٹ آئے۔ شاہ عالم بادشاہ نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ اسی زمانے میں شیخ ابراہیم ذوق بھی ان کے شاگرد ہوئے۔ اس کے بعد حیدرآباد

کے عالم دوست دیوان، راجہ چندو لال نے انہیں حیدرآباد بُلوالیا۔

کچھ نئے خاندان، اطراف واکناف سے دہلی آئے۔ انہیں میں غالب کا خاندان بھی تھا جو آگرہ سے دہلی آگیا تھا۔ غالب کی شاعری دہلی ہی میں چمکی اور ان کا ادبی ذوق نکھرا۔

یہ دور آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر کا دور تھا۔ ظفر خود بھی شاعر تھے اور انہوں نے شعراء کی سرپرستی بھی کی۔ اس وقت دہلی کی شعری فضا پر ذوق چھائے ہوئے تھے۔ اس لئے انہیں کا انتخاب استادشاہ کی حیثیت سے ہوا۔

یہ صحیح ہے کہ مغل شہنشاہیت کی عمارت لڑکھڑا رہی تھی لیکن ابھی گری نہیں تھی۔ شہنشاہ کا بھرم کچھ کچھ باقی تھا۔ بہادر شاہ کو شعروسخن کا جو ذوق تھا اس کی وجہ سے قلعہ معلی یعنی لال قلعہ میں شعروسخن کی محفلیں گرم رہتی تھیں اس چہل پہل نے دلی کی مایوس کن فضا میں کچھ ہل چل سی پیدا کردی تھی۔ دہلی علم و فن کا ہمیشہ گہوارہ رہا۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی کئی جید عالم وہاں موجود تھے۔ ان میں سے مولانا قطب الدین اور ان کے فرزند غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب جن سے بہادر شاہ کو بڑی عقیدت تھی۔ مفتی میرلال، جو "سراج المعرفت" کے مصنف تھے مولانا امام بخش صہبائی، منشی احمد حسین سحر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو کے تین سربرآوردہ شاعر تین لازوال شخصیتیں اور تین ابدی نغمہ سنج اس زمانہ میں دہلی میں اُبھرے۔ ان میں سے ایک تو

شیخ ابراہیم ذوق دوسرے حکیم مومن خاں مومن اور تیسرے مرزا اسد اللہ خاں غالب ہیں۔ اس زمانے کے آخری ایام نواب مرزا خاں داغ کو بھی نمود حاصل ہونے لگی تھی لیکن وہ دہلی میں زیادہ قیام نہ کر سکے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں نے انہیں دہلی سے نکالا۔ اور وہ رام پور میں کچھ عرصہ رہ کر، حیدرآباد چلے گئے تھے۔

ذوق کو اپنے زمانے میں قبولیت عام حاصل تھی۔ انہوں نے شعری تصورات، اسالیب اور موضوعات میں پچھلی روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ انہیں نکھارا اور ابھارا۔ حسن بیان کے نئے نئے سانچے ڈھالے وہ قصیدہ اور غزل دونوں کے اُستاد تھے۔ قصیدہ میں وہ سودا کے بعد سب سے بڑے استاد مانے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کے قصیدوں کا اسلوب بہت ادق اور پیچیدہ ہے۔ غزل گو کی حیثیت سے ان کا مخصوص مقام یہ ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں دہلی میں غزل کی پرانی روایات کو بڑی حد تک برقرار رکھا اور اپنی طبیعت کے میلان کی مناسبت سے اسے صوری اور معنوی حیثیت سے نکھارا۔ عام طور پر ان کے موضوع وہی ہیں۔ جو ان سے پہلے غزل گو برتتے رہے ہیں لیکن انہوں نے بہت سی باتوں کو اپنے مخصوص انداز اور اسلوب میں پیش کیا ہے۔ حسن و عشق کا ابدی اور ازلی لاگ اور لگاؤ۔ ان کے دل کش موضوع ہیں۔ اس پرانی داستان کے نئے پہلو بھی وہ کہیں کہیں پیش کرتے ہیں۔

اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ کے تجربوں کا انہوں نے پھر سے تجربہ کیا ہے، اور اب وہ انہیں کے تجربے معلوم ہوتے ہیں۔ بیان اور اسلوب کی سادگی اور سلاست اور محاوروں اور روزمرہ کے برتنے میں ذوق اپنے معاصرین میں نمایاں ہیں۔ ذوق کی بعض غزلیں اور غزلوں کے بعض اشعار اپنی سادگی کی وجہ سے زبان زد خاص و عام ہوگئے ہیں۔ مثلاً ؎

بیمار ترا صورت تصویر نہالی
کیا اٹھے جو بستہ غم اٹھ نہیں سکتا
پردہ درِ کعبہ سے اٹھانا تو ہے آساں
پر پردۂ رخسار صنم اٹھ نہیں سکتا

حکیم مومن خاں بھی غزل ہی میں اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی غزل کا انداز دوسرا تھا۔ مومن خاں عالم تھے اور نجوم، طب اور کئی علوم سے ان کی واقفیت اچھی تھی۔ اسی لئے ان کی غزل میں غیر شعوری طور پر علمیت کا پرتو جھلک جاتا ہے۔ غزل گوئی میں ان کا فن خاص ہے۔ مطلب میں کھانچے رکھنے میں انہیں لطف آتا ہے۔ بعض وقت یہ خواہش اتنی نمایاں ہو جاتی ہے کہ شعر چیستاں بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مومن خاں کے یہ دو شعر ہیں ؎

موئے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

پس شکستن خم ز جر محتسب معقول
گنا ہگار نے سمجھا گنا ہگار مجھے

اِس انداز فکر کی ایک نفسیاتی وجہ سمجھ میں آتی ہے بعض زبانوں میں شاعروں اور ادیبوں نے ادنیٰ درجے کے شاعروں کی مقبولیت سے انتقام لینے کے لئے ایسے پر ہیچ انداز اختیار کئے گئے تھے۔ مومن خاں کا بھی کچھ یہی حال معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ان کا یہ شعور سوتا ہوتا ہے تو وہ بڑے دل کش شعر بھی سرانجام کر سکتے ہیں جیسے یہ دو تین شعر ہیں سہ

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزہ غماز دیکھتا

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس، نزاکت آواز دیکھنا

مومن کا دل زخم خوردہ تھا۔ انہیں ایک عورت سے محبت رہی تھی اس لیے غزل میں عشق و محبت کی جو واردات وہ بیان کرتے ہیں ان میں بڑی حد تک صداقت ہے۔ وہ حسن و عشق کے تیور نئے نئے انداز سے پیش کر سکتے ہیں۔

غالب اس عہد کے اور شاید ہر عہد کے سب سے سربرآوردہ شاعر ہیں۔ وہ قصیدہ بھی لکھتے تھے اور ان کے معرکتہ الآرا قصیدے منقبت میں ہیں۔ لیکن انہوں نے ایک آدھ قصیدہ مدحیہ بھی لکھا ہے۔

اور ان کا یہ اچھا قصیدہ ہے۔ اس سے قصیدہ نگاری کا ایک نیا رجحان ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی مدح میں غلو اور اسلوب میں روایتی رعب داب نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر غالب کو مدح نگاری کی طرف زیادہ توجہ کرنی پڑتی، تو وہ اردو قصیدہ نگاری میں ایک نئے انداز کے بانی ہوتے۔ غالب نے ایک دو مختصر مثنویاں بھی لکھی ہیں۔

لیکن غالب کے مہتم بالشان کارنامے شاعری میں غزل اور نثر میں ان کے رقعات ہیں۔ غالب کی غزل اپنا ایک انوکھا انداز رکھتی ہے۔ غزل کے محدود موضوعات کے میدان میں ان کی یگانہ روی ایک نیا ماحول اور ایک نیا آہنگ پیدا کر دیتی۔ اور ایک جنت نظر اور فردوس گوش بن جاتی ہے۔ غالب اپنی غزل کو فکر کی گہرائی اور گیرائی دونوں ہی سے موثر بناتے ہیں۔ صنعت نگاری اور محاورہ بندی سے حسن پیدا کرنے کے سستے طریقوں کو اختیار کرنے سے ان کی طبیعت ابا کرتی ہے۔

اصل میں غالب اپنی ذہانت کے لحاظ سے ایک بلند پایہ فن کار تھے۔ لیکن اردو شاعری کی روایت سے انقلابی انحراف کے لیے اس فضا سے کوئی محرک نہ مل سکا۔ ان کا آدرش ہر پھر کر فارسی اساتذہ کے کارنامے تھے۔ اس لیے ان کی روایت کی زنجیریں اس جکڑی ہوئی طبیعت اتنا کہہ کر مچل کر رہ گئی۔

بقدر ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لئے

تاہم "کچھ اور" سے کم وسعت جو ان کے بیان نے پیدا کرلی تھی، وہ بھی اردو شاعری میں ایک نئی کرن کے پھوٹنے اور ایک نئی سحر کے طلوع ہونے سے کچھ کم خوشگوار نہیں ہے۔

غالب کا دوسرا اہم کارنامہ ان کے رقعات ہیں۔ غالب اگر شاعری میں کوئی انقلابی انحراف پیدا کرسکے۔ تو نثر اور خاص طور پر خطوط لکھنے کے انداز میں انہوں نے ایک بنیادی انحراف پیدا کردیا۔ غالب سے پہلے رقعہ لکھنے میں انشاء کے سارے محاسن کو صرف کرنا ناگزیر سمجھا جاتا ہے تھا۔ پہلے القاب کا طومار ہوتا تھا، پھر انشاء کے محاسن کی نگہداشت۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ خط بھی ایک رسمی تحریر بن جاتی، اور پڑھنے والا خط پڑھنے کے بعد بھی لکھنے والے سے اس سے زیادہ قریب نہیں آسکتا تھا، جتنا وہ پہلے تھا۔ غالب نے القاب کو گھٹایا اور اظہار مدعا کے سادہ اور فطری انداز کو بڑھایا ان کی طبیعت میں چھپے ہوئے مزاح کے جوہر نے عبارت میں ایک حسن، ایک بانکپن پیدا کیا۔ اور زبان کی سادہ پرکاری نے، ان کے خانگی خطوط کو سب کے لئے دلچسپی سے پڑھنے کی چیز بنادیا۔

غالب کے خطوط سے ایک دو مختصر اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں:۔

منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

"کیوں صاحب، اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے آپ کی ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ مرزا صاحب ہی آئے نہ منشی صاحب ہی تشریف لائے۔ ہاں ایک بار منشی شیو نرائن نے کرم کیا تھا اور خط میں رقم کیا تھا کہ اب ایک فرمہ باقی رہا ہے۔ اس راہ سے یہ تصور کر رہا ہوں کہ اگر ایک فرمہ نثر کا باقی ہوتا تو اب قصیدہ چھاپا جاتا ہے۔ اور اگر فرمہ قصیدہ کا تھا تو اب جلدیں بننی شروع ہو گئی ہوں گی۔ تم سمجھے میں تمہارے اور بھائی منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا حاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو تمہارا اور ان کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر گویا وہ مکالمہ ہے، جو باہم ہوا کرتا ہے۔ پھر تم کہو مکالمہ کیوں موقوف ہے؟ اور اب کیا دیر ہے؟ اور وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

یوسف مرزا کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

کوئی ہے، ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب وہ آئے ہیں نے خط تم بھیجا ہے۔ مگر تمہارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے۔ اب سن لو، تفضل حسین خاں اپنے ماموں موئد الدین خاں پاس میرٹھ ہے۔ شاید دلی آیا ہو۔

مگر میرے پاس نہیں آیا۔ والدان کے غلام علی خاں اکبر آباد میں ہیں۔ مکتب داری کرتے ہیں۔ لڑکے پڑھاتے ہیں روٹی کھاتے ہیں۔ تم لکھتے ہو، پچاس محل واجد علی شاہ کے کلکتہ گئے۔ تمہارے ماموں محمد قلی خاں کے خط میں لکھتے ہیں کہ شاہ اودھ بنارس گئے۔ اس خبر کو اس خبر کے ساتھ منافات نہیں ہے اُدھر سے آپ بنارس کو چلے ہوں، ادھر سے بیگمات کو وہاں بلا ہو۔ مگر میری جاں ہم کو کیا ؎

"عالم پس مرگ چہ دریا چہ سراب"

رام پور

شعر و ادب کی جو نئی بستیاں بسیں اُن میں رام پور کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ چھوٹی سی ریاست انیسویں صدی کے وسط میں اُردو کے کئی ایسے بے سہارا شاعروں اور ادیبوں کے لئے سہارا اور ان کے درد کا مداوا ثابت ہوئی۔ جنہیں دہلی اور لکھنؤ کے سیلاب حوادث نے بہا کر رام پور پہنچا دیا۔ رام پور دوسرے شہروں کے مقابلے میں لکھنؤ اور دہلی سے بہت قریب ہے اس لئے ان مقامات کے شاعروں اور ادیبوں کو اپنے گھر سے نکلنے کے بعد یہاں جانے میں زیادہ سہولت ہوتی تھی۔ رام پور کے فرماں روا

نواب یوسف علی خاں اور ان کے بیٹے نواب کلب علی خاں بڑے علم دوست رئیس تھے۔ اور شعر و سخن سے بھی ان کو مس تھا۔ اس لئے ایسے سارے شعراء کی جو دہلی یا لکھنؤ سے رام پور آئے بقدر حوصلہ انھوں نے مدد کی نواب یوسف علی خاں ناظم تخلص کرتے تھے اور مومن خاں کے شاگرد تھے۔ بعد میں وہ غالب سے بھی اصلاح لیتے رہے۔ اور سب سے آخر میں میر ظفر علی اسیر کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ بخت و اتفاق سے مولانا فضل حق خیر آبادی مفتی سعد اللہ، مولانا ارشاد حسین مجددی، مولانا سید حسن شاہ محدث جیسے علماء کو رام پور میں اکٹھا کر دیا تھا۔ ان کے اثر سے رام پور میں علم و فن کی سطح بلند ہو گئی تھی۔

نواب کلب علی خاں ۱۸۶۵ء میں اپنے والد کے جانشین ہوئے ان کے زمانے میں رام پور، لکھنؤ سے نکلے ہوئے علماء اور شعراء کا ملجا بنا ہوا تھا۔ لکھنؤ کی تباہی کے بعد امداد علی بحر، ضامن علی جلال لکھنوی، تسلیم، منیر اور آتش کے شاگرد شرف اور ناسخ کے کئی سربرآوردہ شاگرد، جیسے انس وغیرہ، اور دوسرے بیسیوں شاعر رام پور آ گئے تھے۔ کئی علماء اور شعراء کو نواب نے خود بلوا لیا تھا۔ شاعروں کے زمرہ میں کسی کو ملازم رکھنے کی بجائے مختلف محکموں میں ملازم رکھ لیتے اور سلوک مسلوک بھی کیا کرتے تھے۔ مقربین کے رہنے کے لئے ایک کوٹھی علیحدہ بنا رکھی تھی، جو مصاحب منزل

کے نام سے موسوم تھی۔ رام پور میں ناسخ اور آتش کے شاگرد اپنے اختلافات کے باوجود ایک ساتھ رہنے پر مجبور تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ایک طرح سے سوچنے بھی لگے۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ رام پور لکھنؤ نہیں تھا۔ دوسری بات یہ تھی نواب کلب علی خاں سنجیدہ طبیعت رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے اثر سے شعرار کی نوک جھونک بڑھ نہ سکی۔

غالب اور مومن کا قیام بھی رام پور میں کچھ عرصہ تک رہا تھا۔ امیر مینائی رام پور آنے سے پہلے واجد علی شاہ کی ملازمت میں رہ چکے تھے۔ لیکن رام پور میں وہ بہت عرصہ تک مقیم رہے۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے رامپور میں مرتب ہوئے اور کئی تصانیف یہیں منظر عام پر آئیں۔ نواب کلب علی خاں کے حکم سے انھوں نے رام پور کے اردو شعرار کا تذکرہ "انتخاب یادگار" کے نام سے مرتب کیا تھا۔

امیر مینائی اردو شعرار میں ایک اونچا مقام رکھتے ہیں فکر اور زبان پر ان کی استادانہ قدرت مسلم ہے۔ امیر کی ذہانت تنوع پسند تھی۔ وہ طبعاً ایک متقی انسان تھے۔ اس لئے کئی قصیدہ نعتیہ لکھے۔ اور مثنویاں بھی آنحضرت نعت میں لکھی ہیں۔ غزلوں کا بھی ایک نعتیہ دیوان انھوں نے مرتب کیا تھا۔ لغات نگاری سے امیر مینائی کو گہرا لگاؤ تھا۔ لغات میں ان کا بڑا کارنامہ "امیر اللغات" ہوتا۔ لیکن اس

کی تکمیل نہ ہو سکی۔ اس لغات کو امیرؔ نے رام پور میں لکھنا شروع کیا تھا، اور صرف دو جلدیں شائع ہوئی تھیں۔

بظاہر امیرؔ جیسے ثقہ شاعر کو عاشقانہ شاعری سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی عاشقانہ غزلیں زیادہ مقبول ہوئیں ان کا ابتدائی کلام بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن بعد کا کلام جو اُن کے دوسرے مجموعے "صنم خانہ عشق" میں شامل ہے۔ زبان اور انداز بیان ہر لحاظ سے کافی اہم ہے۔ جن شاعروں اور ادیبوں کا اثر اُردو ادب پر پڑا ہے ان میں امیرؔ بھی شامل ہیں۔ ان کے کئی شعر ضرب المثل بن گئے ہیں۔ مثلاً یہ شعر جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جسٹس محمود نے اپنے ایک فیصلے میں بطور سند لکھا تھا ؎

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر

جو چپ رہے گی زبان خنجر، لہو پکارے گا آستین کا

امیرؔ آخری زمانہ میں حیدر آباد آ گئے تھے۔ داغؔ اُس وقت یہاں آ چکے تھے۔ رام پور اور حیدر آباد دونوں جگہ امیرؔ اور داغؔ کی یک جائی کچھ عرصہ تک رہی۔ اُن کی آپس میں چوٹیں بھی چلتی رہتی تھیں۔

لکھنؤ کے آخری دور کے ریختی گو، میر یار علی جان صاحب بھی رام پور آ گئے تھے۔ انھوں نے ایک مسدس "تہنیت جشن بے نظیر" کے نام سے لکھی ہے۔ یہ حقیقت میں رام پور کی شائستگی کا مرقع ہے۔

اس سے رام پور کی زندگی کے تہذیبی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ وہاں کے شاعروں، عالموں، خوشنویسوں، صناعوں، غرض ہر طبقے کے مشاہیر کا بھی اس میں تذکرہ ملتا ہے۔

نواب کلب علی خاں نے اپنی مسند نشینی کی یادگار میں ایک میلہ کی تاسیس کی تھی۔ یہ میلہ، میلہ جشن بے نظیر کے نام سے مشہور تھا۔ اور حقیقت میں لکھنؤ کے قیصر باغ کے میلے اور دہلی کی پھولوں والوں کی سیر کا چربہ تھا۔ اصل میں رام پور کی تہذیبی عمارت، لکھنؤ کے مسالے سے تیار ہوئی تھی۔ اس لئے شعر و شاعری اور علوم و فنون کی طرح دوسرے شعبوں میں بھی رام پور کی زندگی، لکھنؤ کا سلسلہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب کی حیات ابھی کچھ باقی رہ گئی تھی جو رام پور میں آکر پوری ہوئی۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ لکھنؤ کے سے ذرا ئع رام پور کو نصیب نہیں تھے۔

مسدس ""جشن بے نظیر"" گویا رجب علی بیگ سرور کے فسانہ عجائب کے دیباچہ کا منظوم جواب ہے۔ اس میں رام پور کی زندگی کی چہل پہل دکانوں کی سجاوٹ، ناچ گانے کی دلچسپیوں، کھیل تماشوں، شعراء کی نغمہ سرائیوں وغیرہ ویسے ہی نقشے ملتے ہیں۔ جیسے لکھنؤ کے بارے میں سرور نے کھینچے ہیں۔ یہ میلا بھی اصل میں پھول والوں کی سیر اور قیصر باغ کے میلے کا جواب تھا۔ چنانچہ ناظم صاحب نے اپنے مسدس میں اس طرف اشارہ کیا ہے لکھتے ہیں۔

دلی کے اُجڑے ہوئے والوں سے بہتر یہ میلا ہے

زندگی کا یہ نقشہ بھی بہت پائدار ثابت نہ ہوا۔ جلد ہی رام پور کی بہار پر بھی خزاں آئی اور زندگی کا وہ البیلا پن ختم ہو گیا۔ اس کے ساتھ شعراء کی وہ محفلیں بھی درہم برہم ہو گئیں۔

رام پور کے علاوہ کچھ اور مقامات تھے، جہاں کے رئیس شعر و سخن سے دل چسپی رکھتے تھے۔ ان کی علم دوستی کی وجہ سے یہ مقامات کچھ شاعروں اور ادیبوں کے بڑے اڈے رہے۔ ان میں عظیم آباد راجہ شتاب رائے اور ان کے بیٹے جو راجا تخلص کرتے تھے، شعراء کے دوست اور سرپرست تھے۔ اشرف علی خاں فغاںؔ ان کے یہاں رہ چکے تھے بہار میں عام طور پر شعر و سخن کا ذوق پھیلا ہوا تھا اور دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کی قدر ہوتی تھی۔ نوابان مرشد آباد میں نواب نازش محمد خاں، شہاب جنگ شعر و سخن سے دل چسپی رکھتے تھے۔ ان کی دعوت پر مرزا ظہور علی خلیقؔ جو مشہور مرثیہ گو تھے، مرشد آباد چلے گئے تھے۔ اس سے پہلے میر سوزؔ اور میر قدرت اللہ قدرتؔ بھی مرشد آباد میں رہ چکے تھے۔

آگرہ

آگرہ دہلی سے بہت زیادہ دور نہیں۔ اس کے علاوہ مغلیہ دور میں دہلی کے راجدھانی بننے سے پہلے عرصہ تک یہ شہر بھارت کا

دارالسلطنت بھی رہا ہے۔ علم و فن، تعمیر کاری اور تہذیب اور شائستگی کی بہت سی روایات آگرہ ہی سے دہلی پہنچیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ راجدھانی کے دہلی منتقل ہو جانے کے بعد سے آگرہ کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی تھی اس کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی اور شعر و سخن کا ذوق جب لکھنؤ میں ارتقائی مراحل طے کر رہا تھا، آگرہ میں کسی طرح کی ادبی ہل چل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ لیکن اس پرسکون فضا سے اردو شاعری میں نئی روایات کا بانی ایک شاعر نظیر اکبر آبادی نشو و نما پاتا ہے۔ یہ نئی روایات اردو شاعری میں عوامی جذبات، احساسات اور دلچسپیوں کو سمونے کی روایات تھیں۔ نظیر کی شاعری اپنے رنگ میں منفرد ہے اور اس کا رنگ اردو کے کسی شاعر کے رنگ سے نہیں ملتا۔ نظیر کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اردو شاعری کے مرکزوں سے دور تھا۔ اس لیے وہ اردو شاعری کی مروجہ روایات سے ناواقف رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی جنم بھومی دلی تھی۔ اور دلی میں وہ رہ بھی چکا تھا وہ اردو شاعری کی روایات سے واقف بھی تھا۔ اور ان کو برتا بھی ہے لیکن اردو شاعری میں اس کا اصلی اضافہ وہ ہے جس میں اس نے اپنے اطراف کی دلچسپیوں اور زندگی کی رنگا رنگیوں کو روایتی اسالیب سے ہٹ کر سادہ، فطری اور عام پسند اسالیب میں پیش کیا ہے۔ اس نے اظہار کے سانچے میں بھی اپنے نئے بنائے اور عوام کی بول چال کو اپنی زبان بنایا۔

نظیر کی شاعری میں اثر اور لطف اس وجہ سے بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اسی زندگی کو پیش کرتا ہے، جسے وہ برت چکا ہے اور جس سے وہ مانوس ہے۔ اس نے ہولی میں ہولی منائی، دیوالی میں جوا کھیلا، عیدوں میں کج کلاہ بن کر اکڑتا پھرا۔ جمنا میں پیرا کی کی کرشن لیلا کی سبھاؤں میں اور کرشن کے گن گائے۔ نظیر کی شاعری کے یہ ایسے نقشے ہیں جو اردو شاعری کو پہلی دفعہ زندگی کے رو در رو لا کر کھڑا کر دیتے ہیں لیکن نظیر کی روایات اس کے زمانے میں نامقبول رہیں اس لئے اس کی پیروی کسی نے نہیں کی۔

نظیر کی نظم "برسات کی بہاریں" ایک دلچسپ نظم ہے اس کا ایک بند یہاں پیش کیا جاتا ہے ؎

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

نظیر نے "کوڑی کے بیان میں" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس میں معاشی خوش حالی کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ اس کا ایک بند ہے ؎

کوڑی نہ ہے جس کے پاس وہ اہلِ یقیں ہیں
کھانے کو ان کے نعمتیں سو بہترین ہیں
کپڑے بھی ان کے تن پہ نہایت مہین ہیں
سمجھیں گے اس کو وہ جو بڑے نکتہ چین ہیں
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

حیدر آباد

اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں دکن کی سیاست جس کا مرکز اورنگ آباد تھا کئی طرح کی کشمکش کی آماجگاہ بنی رہی۔ نظام الملک نے اورنگ آباد میں ایک مستحکم حکومت کی بنیاد ڈال دی تھی۔ لیکن ان کے انتقال کے ساتھ ہی دکن میں اقتدار کی کشمکش شروع ہو گئی۔ میر احمد خاں، ناصر جنگ ان کے جانشین تو ہو گئے لیکن نظام الملک کے بھانجے ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ بھی تخت کے دعویدار تھے۔ فرانسیسی اور انگریز جن کے قدم ہندوستان میں جمنے لگے تھے دونوں اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ فرانسیسیوں نے دکن میں اثر و نفوذ پیدا کر لیا تھا۔ اس کے مقابلے میں انگریزوں کو شمال میں اقتدار حاصل ہو رہا تھا اب تک اودھ کے دربار پر انہوں نے اپنا اقتدار جما لیا تھا۔ یہ

دونوں قومیں ایک دوسرے کی ترقی پر حسد کرتی تھیں۔ فرانس اور انگلستان کے درمیان جوں ہی جنگ شروع ہوئی۔ یہ دونوں قومیں ہندوستان میں بھی برسرِ پیکار ہو جاتیں۔ نظام الملک کی جانشینی کے سلسلے میں دونوں کو اپنی اپنی قوت آزمانے کا موقع ہاتھ آگیا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنا اثر بڑھانے کے لئے ہمیشہ ناحق کی حمایت کی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ فرانسیسی مظفر جنگ کے طرفدار ہیں۔ تو انگریزوں نے سوچا نظام الملک کے فرزند ناصر جنگ کو اپنا مہرہ بنایا جائے اور ان کا داؤں چل بھی گیا۔ لیکن ناصر جنگ جلد ہی شہید کر دیئے گئے اور مظفر جنگ ان کی جگہ مسند نشین ہوئے۔ اس سے فرانسیسیوں کا اقتدار دکن میں بڑھ گیا۔ انگریزوں کی سازش نے بالآخر مظفر جنگ کو بھی راستے سے ہٹا دیا۔ اور وہ قتل کر دیئے گئے۔ اس کے بعد پھر شورش کھڑی ہو گئی۔ مرہٹے نظام الملک کے بڑے بیٹے غازی الدین کے طرفدار ہو گئے تھے۔ غازی الدین خاں جو دہلی میں وزیرِ اعظم تھے۔ دہلی کی حالت مخدوش پا کر وہ بادشاہ سے دکن کی صوبیداری کی سند لے کر دکن آئے۔ لیکن فرانسیسیوں نے میر محمد خاں صلابت جنگ کو تخت پر بٹھا دیا۔ اور غازی الدین خاں مقابلہ میں ہار گئے، تو چپکے بیٹھ رہے۔

تہذیب اور شائستگی کی ترقی اور شعر و فن کی نشو و نما کے اعتبار سے سیاسی کش مکش کا یہ زمانہ بہت ہی بنجر رہا۔ تاہم تاریخ یہاں بھی

اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ شمال سے دکن آنے والے اور زیادہ تر فارسی ادب اور شاعری کی روایات میں نشو ونما پائے ہوئے حکمراں اور امرار جو پہلے پہلے فارسی کو واسطہ بنائے ہوئے تھے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُردو میں شعر کہنے لگے تھے نامر جنگ کا کچھ اردو کلام بھی ہم تک پہنچا ہے۔

صلابت جنگ کے بعد جب نظام الملک کے چوتھے بیٹے نظام علی خاں جو آصف جاہ ثانی کے لقب سے مشہور ہیں مسند نشین ہوئے تو انہوں نے مرہٹوں کی آئے دن کی شورش سے دور رہنے کے لئے راجدھانی کو اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل کر دیا حیدرآباد قطب شاہی دور میں تہذیب اور شائستگی کا مرکز رہ چکا تھا تاہم نئی حکومت کا مرکز بننے کے بعد کچھ نئی عمارتیں بنوائی گئیں اور کچھ محلات تعمیر ہوئے۔ اس طرح اس پرانے شہر کو نئی راجدھانی کے لئے موزوں بنا لیا گیا۔ اورنگ آباد سے عہدہ داروں اور نظم ونسق کے کل پرزوں کے ساتھ ساتھ علمار اور شعرار بھی حیدرآباد منتقل ہوئے، چنانچہ مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی اور اُن کے شاگرد لالہ لچھمی نارائن شفیق حیدرآباد آئے بلگرام کے ایک اور عالم حکیم الدین بھی جو پنچھی تخلص کرتے تھے اورنگ آباد سے حیدرآباد آئے

پنچھی حیدرآباد آتے ہوئے اپنے ساتھ براق کی ایک نقل بھی

لائے تھے۔ وہ محلہ حسینی علم میں مقیم رہے۔ اور وہ مقام جہاں وہ براق رکھی گئی تھی، پنچھی کی براق کے نام سے موسوم ہوا۔ چنانچہ یہ محلہ اب تک موجود ہے۔

جمال اللہ عشقؔ اور عبدالولی عزلتؔ بھی حیدرآباد آگئے تھے عشقؔ غلام قادر ساؔئی کے شاگرد تھے۔ بعد میں انہوں نے عزلت سے بھی اصلاح لی تھی۔

عزلت بڑا عمدہ مذاق شعر رکھتے تھے۔ دہلی میں ان سے میر تقی میر کی خوب ملاقاتیں رہتی تھیں۔ عزلتؔ نہ صرف غزل کے استاد تھے بلکہ انہیں ہندی کبت، پہیلیوں اور گیتوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کی غزل کے کچھ شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں ؎

عبث توڑا مرا دل ناز سکھلانے کے کام آتا
یہی آئینہ تھا، خود بیں کے اترانے کے کام آتا
لئے عزلتؔ کے موئے سر بیاباں کے ببولوں نے
جو بچتا یہ جنوں، جاروب ویرانے کے کام آتا

کئے ویراں میرا۔ دل، دلبروں کے ہاتھ کیا آیا
یہ بیت اللہ توڑے سے بتوں کے ہاتھ کیا آیا

مرزا علی لطف، صاحب "گلشن ہند"، جو اورنگ آباد میں تھے وہ بھی حیدرآباد آگئے۔ اورنگ آباد سے آنے والے دوسرے اردو

اور فارسی شاعروں میں عارف الدین خاں عاجز، میر قمرالدین منت، شاہ تجلی علی اور اسد علی خاں تمنا بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ تجلی علی نظام علی خاں کے دربار کے مورخ بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے آصفی عہد کی تاریخ "تزک آصفیہ" کے نام سے لکھی ہے یہ زمانہ ارسطو جاہ کے عروج کا زمانہ تھا۔ وہ سلطنت کے سیاہ وسفید پر قابض تھے۔ شعروسخن سے بھی انہیں دلچسپی تھی اور وہ شعراء کے سرپرست تھے۔ اس لئے اس عہد کے شاعروں نے اردو اور فارسی میں جتنی مدحیں ان کی لکھی ہیں۔ خود شاہ وقت کی بھی نہیں لکھیں۔ شاہ تجلی نے ان ساری مدحیات کو "مجموعہ فصاحت" میں اکٹھا کر دیا ہے۔ تجلی نے ایک تذکرہ شعراء "خزینہ سخن" بھی لکھا تھا۔

تمنا فارسی اور اردو کے اچھے غزل گو شاعر تھے۔ ان کا شعرائے اردو کا ایک تذکرہ "گل عجائب" اردو ادب کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے۔

نظام علی خاں کو علم و ادب سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ وہ سپاہی تھے۔ اور جہاں تک نظم ونسق کا تعلق ہے۔ وہ تساہل سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ جفاکش سپاہی اور تجربہ کار سپہ سالار تھے۔ ان کے عہد میں بھی انگریزوں کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں چنانچہ کلائیو نے شاہ عالم سے بنگال اور بہار کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام حاصل کر لی۔ اس میں ریاست حیدرآباد کے کچھ شمالی علاقے بھی

تھے۔ جو شمالی سرکار کے نام سے موسوم تھے۔ نظام علی خاں کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ ان کے علاقے اس طرح ہاتھ سے چلے جائیں اس لئے وہ انگریزوں پر فوج کشی کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن انگریزوں نے لڑائی کو مصلحت وقت کے خلاف جان کر ان سے صلح کر لی انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے میسور کے حکمران، حیدر علی خاں میں اور نظام علی خاں میں اَن بن پیدا کر دی تھی۔ کیونکہ ان دونوں کا اتحاد خود انگریزوں کے حق میں نقصان رساں ثابت ہوتا۔ کئی جنگیں ہوئیں، جن کا سلسلہ ٹیپو سلطان کے زمانے تک جاری رہا۔ بالآخر ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں کو چین نصیب ہوا۔

نظام علی خاں کے زمانے میں وزیروں کی بدانتظامی اور اپنی مقبولیت کی خاطر بے دریغ خرچ کرنے کی وجہ سے، سلطنت کو معاشی بد حالی کا شکار ہونا پڑا تھا۔ یہ بدحالی اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ کہتے ہیں: میں اپنے لخت جگر کو چند ٹکوں کے عوض بیچنے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھیں۔ اس زمانے میں بڑا قحط بھی پڑا تھا۔ مہدویہ اور دوسرے مذہب والوں میں فسادات بھی برپا ہوئے تھے۔ جن کی وجہ سے ریاست میں بدامنی رہی۔ عوام اس بدحالی، بدنظمی اور فسادات کے شکار تھے لیکن اوپر کے طبقوں میں فاقہ مستیوں کا وہی حال تھا اور عیش و عشرت کی کوئی جہت فراموش نہیں ہوئی تھی۔

سکندر جاہ کے زمانے میں حالات کچھ درست ہوئے اور زندگی کی دلچسپیاں ابھرنے لگی۔ تو بادشاہ اور عوام رنگ رلیوں میں مصروف ہونے لگے۔ بسنت ایک قومی تہوار کے طور پر بڑے ذوق و شوق منائی جاتی۔ شاہی باغوں میں جھولے پڑتے، جھولنے والے زندگی کی ڈراونی، گھناونی حقیقتوں کو جھولے کی پینگوں میں گم کرنے کی کوشش کرتے تھے اور بسنت رُت اچھی گزر جاتی۔ سلطنت کے عمائد بادشاہ کی خدمت میں نذریں پیش کرتے اور رواج کے مطابق نذر کے ساتھ زعفرانی اور بسنتی جوڑے عبیر و گلال اور زعفرانی رنگ سے منقش سبو چے بھی بھیجے تھے۔

ناصر الدولہ تک انگریزوں کا اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا کہ مراسلت میں نظام کے لئے "مابدولت" کے القاب لکھنے کا جو دستور تھا، وہ ترک کر دیا گیا۔ اور کمپنی اب "نیازمند" باقی نہیں رہی تھی۔

اس زمانے کی سیاسی اور ادبی تاریخ پر مہاراجہ چندو لال چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس مطلق العنان فیاض نے ارسطو جاہ کی جگہ لے لی تھی۔ چنانچہ جو ادیب، شاعر اور عالم اس زمانے میں حیدرآباد میں تھے یا شمال سے آئے تھے وہ زیادہ تر چندو لال کے دربار ہی سے وابستہ رہے۔ جتنے شاعر اس زمانے میں حیدرآباد میں جمع ہو گئے تھے ان کی گنتی کی جائے تو یہ تعداد بڑی کثیر ہو جاتی ہے۔ ہجر، کمتر، ناطق، الفت، مرزا، شوق، شرر، سخن، سجاد، ضیا، قربان وغیرہ

اس طویل فہرست میں سے چند نام ہیں یہ صحیح ہے کہ ان میں سے کسی
وہ رتبہ حاصل نہیں ہوا کہ اردو شاعری پر اپنی چھاپ چھوڑ جائے
تاہم ان کی مشق سخن اتنی پختہ تھی کہ وہ اپنے زمانے میں اساتذہ کے
زمرہ میں شمار کئے جاتے تھے۔

ان شعراء سے ہٹ کر وہ اساتذہ ہیں جنھیں ہم بھول بھی نہیں سکتے
ان میں قمرالدین منتؔ، ایماںؔ، احساںؔ، قیسؔ اور چنداؔ کافی اہمیت
رکھتے ہیں۔

شیر محمد خاں ایماںؔ اپنے زمانے کے مسلم الثبوت استاد غزل تسلیم
کئے جاتے ہیں۔ اُن کے یہاں ہر سال زبردست مشاعرے منعقد ہوتے
تھے۔ جن میں مقامی اور شمالی ہند کے شعراء شریک ہوتے تھے۔

مہ لقا بائی چندا، جو اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ہے
ایماںؔ کی شاگرد تھی۔ چنداؔ نے بھی ایک مختصر سا غزلوں کا دیوان چھوڑا
ہے۔ اس دیوان کی خصوصیت یہ ہے کہ یقین کے دیوان کی طرح اس کی
ہر غزل میں صرف پانچ پانچ شعر ہیں۔ چنداں کا مذاق نکھرا ہوا تھا۔
اور وہ فکر رسا رکھتی تھی۔ اس کی شاعری کا رجحان مذہب کی طرف
زیادہ ہے۔ چنداؔ کے ایک دو شعر درج ذیل ہیں جو غالب کی زمین
میں کہے گئے ہیں ؎

ہلال مہ تو کو کم دیکھتے ہیں۔
وہ ابرو کا تیرے خو خم دیکھتے ہیں

حرم کو بنا یا ہے بس دیر دل میں
تجھے جب سے ہم اسے صنم دیکھتے ہیں

چندو لال بھی اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ فارسی نثر میں وہ دو تین کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ اردو غزل کے دو دیوان انہوں نے چھوڑے ہیں۔ چندو لال کی طلب پر شاہ نصیر حیدر آباد آئے تھے۔ اور ان کے دربار سے شاہ نصیر کے لئے سات سو روپیہ تنخواہ مقرر تھی۔ شیخ حفیظ دہلوی کو بھی چندو لال نے حیدر آباد بلوا لیا تھا شاہ نصیر مشکل گو تھے۔ وہ صنعت گری کے زیادہ قائل تھے تاہم شعری اسالیب کو مالا مال کرنے میں ان کا جو حصہ ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شرف بھی ان کے لئے کچھ کم نہیں کہ ذوق ان کے شاگرد تھے۔

شیخ حفیظ سے بھی چندو لال نے مشورہ سخن کیا تھا۔ انہیں وہ ایک ہزار ماہوار دیا کرتے تھے۔ حفیظ غزل کے سربرآوردہ شاعر تھے ان کا رنگ شاہ نصیر سے بالکل مختلف ہے۔ سلامت اور سادگی ان کی غزل کا جوہر ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند شعر پڑھے جا سکتے ہیں ؎

حفیظ ان شاعروں کی مجھ کو کج فہمی نے مارا ہے
لال اس کو سمجھتے ہیں جو ہے جانِ جہاں ابرو

بتو تم بندگی دل سے ہماری دور مت کیجو
رقیبوں کا کہا بہر خدا منظور مت کیجو

چندو لال کے ما جب راجہ مکھن لال مکھن بھی فارسی اور اُردو کے شاعر تھے۔ وہ فارسی میں "تاریخ مکھن لال" کے بھی مصنف ہیں اُردو میں انہوں نے غزل نہیں کہی۔ کچھ مسدس، حضرت محبوب سبحانی کی منقبت میں لکھے تھے۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سے انہیں گہری عقیدت تھی۔ مکھن نے عمر خیام کے رباعیات کا بھی اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جو اُردو نثر میں ہے۔ اس مقدمہ میں غزل کی شاعری کی تنگ دامانی کا وہ شکوہ کرتے ہیں۔ خود انھوں نے کبھی غزل نہیں کہی۔

چندو لال شاداں نے غزلوں کے دو دیوان چھوڑے ہیں۔ وہ غزل منجھی ہوئی کہتے تھے۔ یہ اچھی بات ہے کہ ان پر نصیر سے زیادہ حفیظ کا اثر تھا۔ چنانچہ شاداں کی غزل سادہ اور سلیس ہوتی ہے۔ شاداں کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ ~

مثال ماہ پردے سے اگر دلدار پیدا ہو
زمین و آسمان سے روشنی اک بار پیدا ہو

صنم کے عشق میں پابند ہونے کا مزہ جب ہے
برہمن کے گلے میں خود بخود زنار ہو پیدا

اب شکل دکھا حجاب مت کر
سو جاں سے ترے نثار ہیں ہم

میسور

میسور کے علاقوں میں جو کنڑی زبان بولنے والوں کا قلب سمجھا جاتا ہے، پرانی اردو بولنے والے سب سے پہلے علاءالدین خلجی کی فتوحات کے بعد ہی داخل ہو چکے تھے تغلقوں کے دور میں جب جنوب کے اکثر علاقے راست دہلی کے نظم ونسق کے ماتحت آ گئے تھے اُس وقت میسور پر راجا حکومت کرتے تھے۔ دکن دہلی کی سلطنت کا صوبہ بن جانے کے بعد شمال سے گورنر مقرر ہو کر یہاں آنا تھا۔ جس کا صدر مقام سرا تھا۔ یہ شہر اب ایک چھوٹا سا گاؤں رہ گیا ہے۔ لیکن اردو بولنے والوں کی یہاں اکثریت ہے۔

میسور کے علاقے پر اردو بولنے والوں کا اقتدار اٹھارویں صدی کے نصف آخر کے آغاز میں قائم ہوا۔ حیدر علی خاں جو میسور کی فوج میں ملازم تھے اور ترقی کرتے کرتے سپہ سالار کے منصب پر پہنچ گئے تھے نئی حکومت کے بانی تھے۔ وہ بڑے اچھے سپاہی تھے۔ مگر علم و ادب میں انہیں زیادہ درک نہیں تھا۔ تاہم انہوں نے اچھے اچھے علماء اور شعراء کو اپنے دارالسلطنت سری رنگ پٹن میں اکٹھا کر لیا تھا۔ کچھ اردو شاعر بیجاپور اور گولکنڈہ کے سقوط کے بعد جنوب

بعض حصوں میں، اور میسور چلے گئے تھے۔ کچھ علماء میسور کے علاقوں میں بھی آگئے تھے۔ ان میں شاہ صدر الدین اور شاہ کمال الدین کے خاندان نے رشد و ہدایت کے کام کو یہاں آگے بڑھایا۔ شاہ صدرالدین نے کچھ رسالے اس نواح کے لوگوں کو اسلام کے عقائد سمجھانے کیلئے اردو میں لکھے تھے۔ بعض شعراء کا کلام بھی دستیاب ہوتا ہے۔ جس کی اہمیت ادبی سے زیادہ تاریخی ہے۔

حیدر علی خاں کو اپنی نئی سلطنت کے استحکام میں بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ اس لئے انہیں تہذیبی روایات اور علوم وفنون کی طرف توجہ کرنے کے مواقع کم ملے۔ پھر بھی ان کے دربار میں فارسی کے اچھا انشاء پرداز اور شاعر اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان کے دربار کا میر منشی لالہ مہتاب رائے سبقت اردو کا اچھا شاعر تھا۔ اس کا مختصر سا اردو کلام دستیاب ہوتا ہے۔ وہ فارسی کا انشاء پرداز اور شاعر تھا لیکن اردو میں بھی اس نے کچھ غزلیں اور کچھ قطعے لکھے ہیں سبقت کے کچھ شعر ذیل میں درج ہیں ؎

عجب مزے کی حلاوت ہے اس کی باتوں میں
زبان غنچہ دہن کی کچھ انگبیں تو نہیں
میری فغاں تو سنا پر کہا نہ ظالم نے
کہ یہ غریب صفت سبقت حزیں تو نہیں

حیدر علی خاں کے بیٹے فتح علی ٹیپو سلطان نے دارالسلطنت کی مادی تعمیر کے ساتھ ساتھ ذہنی تعمیر کی بھی کوشش کی وہ بہت ذہین انسان تھے اور انہیں شعر و ادب سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ ان کی تخت نشینی کے وقت سبقت، فیروز اور دوسرے کئی شاعر جو دارالسلطنت میں موجود تھے فارسی میں قصیدے لکھ کر پیش کئے تھے حسین علی کرمانی اور زین العابدین ان کے دربار کے مورخ اور واقعہ نگار تھے۔ سبقت اس زمانے میں کسی وجہ سے گھر بیٹھ گئے تھے۔ زین العابدین نے ٹیپو سلطان کے حکم سے ایک کتاب فارسی میں "تحفۃ المجاہدین" لکھی تھی۔ مگر وہ "فتح المجاہدین" مشہور ہوگئی ہے۔ اس میں فوجی نظم و نسق اور دوسرے متعلقہ امور کی تفصیلات درج ہیں۔ ٹیپو سلطان نے بھی واجد علی شاہ کی طرح، فوجی قواعد کے لئے احکام فارسی میں وضع کئے تھے۔ اس کے علاوہ فوجی ترانے بھی اردو میں لکھوائے تھے۔

مثلاً یہ ترانہ صبح کے وقت گایا جاتا تھا ؎

وصفِ حسنِ خلق گر تیرا لکھوں اے شہریار
بے گماں ہر بیت ہووے مطلعِ صبحِ بہار

جنگ کے وقت یہ ترانہ گایا جاتا تھا ؎

برقِ جاں، کوہ گراں، پیکِ اجل، دستِ اجل
تیغ و گرز و تیر و خنجر کے ترے ہیں نام چار

سلطان کو معاشی اور سماجی سدھار کا بھی بڑا خیال تھا۔ اس زمانے میں میسور کے بعض دور دراز کے حصوں کی عورتیں اور مرد برہنہ رہتے تھے۔ سلطان کے حکم سے ان کے لئے لباس پہننا ضروری گردانا گیا۔ رسم و رواج کے لئے بھی قاعدے اور قوانین بنائے گئے تھے۔ ٹیپو سلطان کو موسیقی کا بھی ذوق تھا۔ چنانچہ موسیقی کے اصول پر انھوں نے ایک کتاب "مفرح القلوب" کے نام سے لکھوائی تھی۔ اس میں بھی کچھ گیت اردو میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

سری رنگ پٹن کی زینت سلطان کے زمانے میں کئی اچھی اچھی عمارتوں سے بڑھائی گئی تھی۔ ایک وسیع جامع مسجد بنوائی گئی تھی جو اب تک موجود ہے۔

کاویری ندی کے کنارے پر فضا مقام پر سلطان نے ایک محل بنوایا تھا۔ جو "دریا دولت باغ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی دیواروں پر مشہور تاریخی واقعات کے مرقع بنوائے گئے تھے۔ ان میں سے بہت سی تصویریں اب تک جوں کی توں موجود ہیں۔

مدراس

مدراس کا صوبہ اب صرف تامل بولنے والے علاقوں پر مشتمل رہ گیا ہے۔ لیکن اٹھارویں صدی کے وسط میں، جب یہاں اُردو بولنے والوں کا اقتدار قائم ہوا۔ یہ علاقہ کرناٹک کے رئیس کے

تخت تھا۔ اس سے پہلے مدراس میں بھی شمال سے آنے والوں کی ریاست قائم ہوئی تھی۔ جس کے بانی جلال الدین احسن شاہ تھے اور نگ زیب کی فتوحات دکن کے بعد جنوبی ہند کے سارے علاقے براہ راست دہلی کے نظم ونسق کے تحت آ گئے تھے اور دہلی سے یہاں صوبہ دار مقرر ہوتے تھے۔

جب نظام الملک نے دکن کی صوبہ داری حاصل کرلی، اور عملاً وہ خودمختار بن گئے تو جنوبی ہند کے سارے حصے انہیں کے ماتحت سمجھے جاتے تھے لیکن کچھ تو دہلی کے مرکزی اقتدار کی کمزوری کے سبب سے کچھ مرہٹوں کے عزائم اور کچھ مغربی قوتوں کی دکن میں زور آزمائی اور سازشوں کے نتیجے کے طور پر جنوبی ہند کے الگ الگ حصوں میں مرکز گریز قوتیں نشوونما پارہی تھیں۔ نظام الملک نے انوارالدین خاں کو کرناٹک کا نائب یا نواب مقرر کیا تھا۔ ان کا خاندان... گوپاموہ سے تعلق رکھتا تھا، اس لئے فطرتاً انہیں اردو سے دلچسپی تھی۔ اور اردو ان کے گھر کی دربار کی زبان تھی۔ اور ادبی زبان بھی بن گئی تھی۔ گو دفتری زبان روایتاً یہاں بھی فارسی تھی۔

نظام الملک کے انتقال کے بعد ناظم کرناٹک عملاً خودمختار ہو گئے تھے۔ انگریزوں سے انہوں نے معاہدہ کرلیا تھا۔ اور فرانسیسیوں نے جب مدراس پر قبضہ کرلیا تھا تو انوارالدین خاں فرانسیسیوں کو بے دخل کرنے میں انگریزوں کی مدد کی تھی۔ اس لئے انگریزوں نے

اس علاقے پر انوار الدین خاں اور ان کی اولاد کے قبضے کے تسلسل کا یقین دلایا تھا۔

انوار الدین خاں کے بعد محمد علی والا جاہ کرناٹک کے نواب مقرر ہوئے ان کی عمل داری میں رفتہ رفتہ انگریزوں کا عمل دخل اتنا بڑھا کہ والا جاہ اور ان کے جانشین انگریزوں کے ساتھ ہاتھ میں کٹ پتلی ہو کر رہ گئے تھے چنانچہ والا جاہ کے بعد جو چھ یا سات حکمراں ہوئے ان سب کی یہی حالت تھی۔ والا جاہ کے جانشین عمدۃ الامراء ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد انگریزوں نے تاج الامراء اس کو چند شرائط کے ساتھ اس کا جانشین بنانا چاہا لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا۔ اس لئے انگریزوں نے والا جاہ کے ایک پوتے عظیم الدولہ کو نواب مقرر کیا ان کے انتقال کے بعد یکے بعد دیگرے اعظم جاہ، محمد غوث خاں، عظیم جاہ نواب ہوئے۔ عظیم جاہ کے زمانے سے یہ نام نہاد حکمراں انگریزوں کے صرف وظیفہ خوار رہ گئے تھے۔ ظہیر الدولہ، سر محمد علی خاں، پرنس آف آرکاٹ کہلانے تھے۔

اردو شاعری کا ذوق ان علاقوں میں گولکنڈہ کے سقوط کے بعد پھیلا۔ چنانچہ انوار الدین خاں اور والا جاہ جنہیں علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی، علماء اور شعراء کے سرپرست بھی تھے۔ ولی ویلوری اور سید محمد والا انہیں کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

فرشتہ کا بیٹا میر اسمٰعیل ابجدی بیجاپور کی تباہی کے بعد مدراس کے قریب چینگل پیٹ میں آکر مقیم ہوگیا تھا۔ اس نے "انور نامہ" کے نام سے آرکاٹ کی منظوم تاریخ لکھی تھی۔ والاجاہ کے زمانے میں محمد باقر آگاہ بڑے عالم اور اردو کے سربرآوردہ شاعر ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک ضخیم دیوان کے علاوہ کئی مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ وہ نثر بھی اچھی لکھتے تھے آگاہ اور مولانا غلام علی آزاد میں بڑی دوستی تھی۔

والاجاہی خاندان کے مختصر سے دور میں علمی اور ادبی حیثیت سے بہترین زمانہ نواب محمد غوث خاں کا تھا۔ ان کی تعلیم بہت اچھی ہوئی تھی۔ ان کے والد اعظم جاہ کو علماء سے بڑی عقیدت تھی۔ اور بلند پایہ علماء ان کے زمانہ میں موجود تھے۔

حافظ محمد مکیؒ، مولوی غلام محی الدین، قاضی الملک مولوی محمد صبغتہ اللہ اور مولوی ارتضا علی خاں کے زیر نگران ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ فارسی اور اردو زبانوں میں وہ شعر کہتے تھے۔ اور اعظم تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے شمال اور جنوب کے اساتذہ اردو کے کلام کا مطالعہ کیا تھا۔ اور غزل بہت اچھی کہتے تھے۔ ایک غزل کے چند شعر ہیں ؎

سلسلہ برق کو پہنچے ہے دلِ سوزاں کا
دفترِ داغ کو میں نے جو اٹھا کر دیکھا

ایک قطرہ کو میرے اشک کے پہنچا نہ کبھی
تو نے اے ابر کئی سیل بہا کر دیکھا

غلام غوث خاں کی طبیعت میں آخری دالی ادد دتہ کی سی رنگارنگی تھی۔ اور ان کی دلچسپیاں وسیع تھیں، لیکن ان کی فضا تنگ تھی۔ نئے نئے کھانے ایجاد کرنے کا انہیں شوق تھا۔ رنگ بعض لوگوں کے لئے طرح طرح کی کشش رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں محمد غوث خاں کو رنگریزی کا بھی شوق تھا۔ کبھی وہ مناظروں میں حصّہ لیتے تو کبھی مشاعروں میں دلچسپی کا اظہار کرتے۔

انہوں نے تعلیم کی اشاعت اور ترقی کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ جو مدرسہ اعظم کے نام سے موسوم تھا، بعد میں وہ گورنمنٹ محمڈن کالج کہلایا۔ اس کالج نے مرحوم مولانا ڈاکٹر عبد الحق کی پرنسپلی کے زمانے میں بہت ترقی کی۔ اب وہ گورنمنٹ آرٹس کالج ہوگیا ہے۔

محمد غوث خاں اعظم کے ستھرے مذاقِ سخن اور علم دوستی کے مدنظر ان کے اطراف اچھے عالم اور سخن سنج اکٹھے ہوگئے تھے۔ ان کے دربار کے ملک الشعراء مستقیم جنگ نامی تھے۔ جو شعر و سخن کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ نامی کی ایک مثنوی " سلیمان نامہ " مشہور ہے۔

نواب محمد غوث خاں کی وجہ سے اردو شاعری کو جو محرک نصیب ہوا تھا۔ اس کے باعث مدراس اور اس کے دور دراز حصوں میں اردو شاعری کا ذوق ایسا پھیل گیا تھا، کہ مختلف حصوں سے صدہا شاعر اور نثر نگار پیدا ہوتے رہے لیکن ان میں ایسے بلند پایہ لکھنے والے کم ہیں۔ جنہیں اردو ادب کی تاریخ میں اونچا مقام دیا جا سکے۔

مغربی دھارا

اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط سے لیکر انیسویں صدی کے وسط تک بھارت کی سیاسی اور سماجی زندگی بہت پارہ پارہ رہی ایک طرف تو مرکزی حکومت کی کمزوری مرکز گریز طاقتوں کے سر اٹھانے کی محرک بنی رہی۔ دوسری طرف مغربی قوتیں اس وسیع ملک پر اقتدار جمانے کے لئے جس طرح برسرپیکار تھیں اور اسی کے لیئے جو طریقے اختیار کر رہی تھیں ان کی وجہ سے بھارت کی سیاسی تاریخ نہایت انتشار آفریں اور گھناؤنی بن گئی ہے۔ ڈچ قوم کو ولندیزیوں نے جلد ہی بے دخل کر دیا۔ اور ولندیزیوں سے فرانسیسیوں نے جگہ خالی کرائی۔ بالآخر انگریزوں کی سیاست سب پر غالب رہی۔ پہلے فرانسیسیوں نے ہندوستانیوں کو فوجی تربیت

دے کر انہیں اپنوں کے خلاف استعمال کرنے کا گُر سکھایا تھا۔ لیکن اُس گُر سے انگریزوں نے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ شمال اور دکن کی سلطنت کے آدھے حصے پر تسلط جما لینے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجر، آہستہ آہستہ ایک علاقے کے بعد دوسرے علاقے کو اپنے قبضے میں لاتے رہے۔ فرانسیسی ہاتھ پاؤں مارتے رہے مگر کمپنی بہادر کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی اور وہ سارے بھارت کو اپنے زیرِ نگیں لانے کے منصوبے بنانے لگی۔ لیکن اس وسیع ملک میں مرکزیت ایسی غائب ہوگئی تھی کہ کوئی نہیں رہا تھا جو ان قوتوں کا مزاحم ہو سکے۔

فرانسیسیوں کو بے دخل کرنے کے بعد انگریزوں نے آہستہ آہستہ اپنے مقبوضات میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ ۱۷۵۷ء میں مرشد آباد کے نواب کے خلاف، پلاسی کے میدان میں انگریزوں کی کامیابی نے ان کے حوصلے بڑھا دیئے۔ ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم کے فرمان سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی مل گئی اودھ میں سعادت علی خاں سے معاملہ کر کے انہوں نے آدھا ملک حاصل کر لیا۔ دکن میں نظام الملک کے انتقال کے بعد ان کے جانشین اور جانشینی کے دعویداروں کو آپس میں لڑا کر اپنے اقتدار کو آگے بڑھانے کے جو شرمناک طریقے انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اختیار کیے تھے وہ تاریخ میں یادگار رہیں گے۔

اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے انگریزوں کا تسلط بنگال بہار، اڑیسہ، اودھ کے ایک حصے اور مدراس اور بمبئی پر ہو گیا تھا۔ نئے ہتھیاروں سے لیس قوم کے لئے یہ اتنی بڑی قوت تھی کہ ملک میں اب جو نام نہاد آزاد حکومتیں رہ گئی تھیں وہ اس قوم کے مقابلے میں عاجز تھیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے تجارت کو بہانا بنایا تھا اور اس کی آڑ میں اُن کے عزائم بھارت پر تسلط جمانے کے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابتدا میں تجارت اور مالی منفعت سے آگے ان کی کوئی غرض و غایت نہیں تھی۔ ہندوستان آنے کے بعد یہاں کی حالت دیکھ کر ان کے حوصلے بڑھتے گئے۔ انگریزوں نے خود ساری جنگیں نہیں لڑیں بلکہ ہندوستانیوں کو ہندوستانیوں کے خلاف لڑا کر انہوں نے اپنا مقصد حاصل کیا۔ بھارت اس وقت لڑنے بھڑنے والے لوگوں سے بالکل خالی نہیں ہو گیا تھا۔ بلکہ یہاں اب بھی مرہٹے، پٹھان، مغل، راجپوت، سکھ، جاٹ سب ہی تھے پیشے سپہ سالار اور سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ بھی تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ ان میں سے کسی کے سامنے وطن کا مقصد نہیں تھا بلکہ ذاتی منفعت یا اپنے گروہ کا فائدہ ان کی سیاست کا اصل اصول بن گیا تھا۔

انگریزوں نے کچھ تو اپنی برتر قوت کی وجہ سے اور کچھ اپنی ذہانت

اور سیاست سے، لیکن زیادہ تر اپنے ظلم اور استبداد سے اس وقت بھی کہ ابھی وہ بھارت کے پورے حاکم نہ سمجھے ہوئے تھے ہندوستانیوں کے دلوں میں ایسی دھاک بٹھا دی تھی کہ سب ان کا لوہا ماننے لگے تھے، یہ صحیح ہے انگریز ایک سامراجی نظام سیاست لے کر آئے تھے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ وہ ایک برتر سماجی نظام بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ ترقی پسند خیالات اور ترقی یافتہ علوم اور خاص طور پر سائنسی علوم اور سب سے بڑھ کر ایک حکمی طریقہ فکر اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہوا کہ پڑھے لکھے ہندوستانیوں کی نظر جو پہلے بھارت یا زیادہ سے زیادہ مشرق قریب کے ملکوں تک محدود تھی، اب ان کے تصورات کا افق وسیع تر ہونے لگا تھا۔ وہ مغربی ملکوں کے بارے میں بھی کچھ جاننے اور کچھ سوچنے لگے تھے۔

انگریزوں کی سیاست کی ابتدائی کامیابیوں نے انہیں یہ سمجھایا کہ اب مغلیہ حکومت ایک لڑکھڑاتی ہوئی عمارت ہے، وہ گر کر رہے گی۔ انہیں حکومت کرنے کے لئے ہندوستانیوں سے قریب تر ہونے کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کچھ اور یورپی قوموں نے بھی مذہب کے پرچار کی غرض سے ہندوستانیوں سے قریب تر ہونے کی کوششیں کی تھیں، انھوں نے ہندوستانی زبانوں اور خاص طور پر ہندو...

کو سیکھا تھا۔ ا۔ ۱ بس کے بارے میں لکھا تھا۔ لیکن اٹھارویں صدی کے اختتام کے قریب انگریزوں نے سیاسی اور معاشی اغراض کے لیے ہندوستانی زبانیں سیکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ جب لارڈ ولزلی گورنر جنرل ہو کر آیا تو اس نے کلکتہ کے فورٹ ولیم میں نوجوان انگریز عہدہ داروں کی تعلیم و تدریس کے لئے ایک کالج قائم کرنے کی تجویز بنائی۔ یہ تجویز اپنی ابتدائی شکل میں بہت حاوی تھی چنانچہ اس میں عربی، فارسی، سنسکرت، بنگالی، اردو، تلنگی، مرہٹی، اور کنتڑی کے علاوہ تاریخ، مذہبی علوم، انگریزی، لاطینی اور یونانی زبانوں کی تعلیم و تدریس بھی شامل تھی۔ لیکن کمپنی کے نظماء نے یہ مکمل تجویز منظور نہیں کی۔ اس لئے ولزلی نے اُسے صرف السنۂ مشرقی کا کالج بنا دیا۔ لیکن عملاً اس کالج کے نصاب میں اردو کی تعلیم و تدریس کو اہمیت حاصل ہو گئی۔

کالج کی صدارت کے لئے ڈاکٹر گلکرسٹ کا انتخاب ہوا۔ اسے اردو سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس نے جب نصاب کے لئے کتابوں کا جائزہ لیا تو اُسے انگریز متبدیوں کو پڑھانے کے لئے بہت کم کتابیں دستیاب ہوئیں۔ اس وقت تک اردو نثر میں چند کتابیں جو لکھی گئی تھیں مشکل زبان اور اسلوب میں تھیں۔ اس لئے سب سے پہلے نثر کی سلیس اور سادہ زبان میں لکھی ہوئی کتابیں مرتب کرانے محسوس ہوئی۔ اس مقصد سے گلکرسٹ نے ہندوستان کے

کئی حصوں سے اُردو کے عالموں کو فورٹ ولیم کالج میں جمع کیا۔ ان کی تعداد کافی بڑی ہے۔ لیکن اُردو ادب میں جن کو زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ میر امن، نہال چند لاہوری، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، بہادر علی حسینی، مرزا علی لطف، شیخ حفیظ الدین اور کاظم علی جوان ہیں۔ خود گلکرسٹ نے بھی کئی اہم کتابیں اور رسالے تصنیف کئے۔ جن میں سے اس کی انگریزی ہندوستانی لغت اور اُردو کی صرف ونحو زبان سیکھنے کے لئے بنیادی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اجنبیوں کو زبان سکھانے کے لئے "رہنمائے اُردو"، بیاض ہندی، "اتالیق ہندی"، "مشرقی قصص"، اور ہندوستانی داستان گو" بھی بڑی کام کی کتابیں تھیں۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے چار سال کے اندر گلکرسٹ کو ہندوستان چھوڑ جانا پڑا۔ لیکن اس عرصہ میں کالج کی سرپرستی میں اُردو نثر کی کئی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ ان میں میر امن کی "باغ وبہار" کلاسیکی ادب کی اہمیت حاصل کر چکی ہے۔ میر امن کی سادہ اور سلیس زبان اور ان کے انداز بیان نے اِس کتاب کو لازوال اہمیت دے دی ہے۔ نہال چند لاہوری نے گل بکاؤلی کے قصے کو آسان زبان میں لکھا اور اس کا نام "مذہب عشق" رکھا۔ حیدر بخش حیدری بھی کالج کے سربرآوردہ عالموں میں سے تھے۔ چنانچہ انہوں نے "طوطا کہانی" کے نام سے طوطے کی کہی ہوئی کہانیوں کو سلیس اُردو میں لکھا۔

دوسرا مقبول کارنامہ "آرائش محفل" یا حاتم طائی کا قصہ ہے جو اردو میں بہت مقبول رہا۔ شیر علی افسوس نے سعدی کی شہرۂ آفاق کتاب "گلستاں" کا اردو ترجمہ "باغ اردو" کے نام سے کیا۔ بہادر علی حسینی کا کارنامہ "نثر بے نظیر" ہے۔ جو میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" پر مبنی ہے۔ حسینی نے سنسکرت کی قدیم اخلاقی حکایتوں کی کتاب "ہتو پادیش" کا ترجمہ بھی اردو میں "اخلاق ہندی" کے نام سے کیا تھا۔ اردو شعراء کا ایک تذکرہ "گلشن ہند" کے نام سے کالج ایک اور انشاء پرداز مرزا علی لطف نے مرتب کیا تھا۔ لطف اردو کے اچھے شاعر بھی تھے، وہ حیدرآباد میں ارسطو جاہ کے متوسل شعراء میں بھی رہے۔ سنسکرت کی کچھ اور مقبول اخلاقی حکایات کا ترجمہ عربی میں "کلیلہ دمنہ" کے نام سے کیا گیا تھا۔ فارسی کی مقبول کتاب "انوار سہیلی" اسی کا ترجمہ ہے۔ ان حکایتوں کو شیخ حفیظ الدین نے "عیار دانش" کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔

کالج کے تین اور صاحب طرز انشاء پرداز بھی قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک خلیل اللہ خاں اشک ہیں۔ جن کی داستان "امیر حمزہ" اردو کی مقبول داستانوں میں سے ہے۔ دوسرے مصنف مولوی اکرام علی ہیں۔ جنہوں نے عربی کی مشہور کتاب "اخوان الصفا" کا اردو میں "اخوان الصفا ہندی" کے نام سے ترجمہ کیا۔

مرزا کاظم علی جوانؔ نے سنسکرت کے ناٹک "شکنتلا" کو نثری قصے کی شکل میں لکھا۔ یہ ناٹک سنسکرت ادب کا شہ کار سمجھا جاتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں کچھ اور علماء جیسے بینی نارائن جہاںؔ، مرزا جان طپشؔ، سید حمید الدین وغیرہ بھی تھے۔ انہوں نے بھی کچھ قصے یا تاریخی کتابیں لکھ کر اُردو کے نثری سرمایہ میں اضافہ کیا۔

کالج میں ہندی کے علما جیسے للو لال بھی سدل مسر وغیرہ بھی مقرر کئے گئے تھے۔ انہوں نے ناگری میں کچھ کتابیں لکھیں جو اُردو میں بھی ترجمہ کی گئیں۔ للو لال کی لکھی ہوئی کتابوں میں "پریم ساگر"، "سنگھاسن بتیسی"، "راج نیتی" اہمیت رکھتی ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کی تصانیف اردو نثر کا ابتدائی اور قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔ میر امنؔ کی "باغ و بہار" آج بھی ویسی ہی دلکش ہے جیسی اپنے لکھے جانے کے وقت تھی لیکن ابتدا میں ان کارناموں کا زیادہ اثر کالج کے باہر کے انشاء پردازوں پر نہیں پڑا۔ چنانچہ لکھنؤ میں اس کے بعد رجب علی بیگ سرورؔ نے جب "فسانۂ عجائب" لکھا تو یہ صحیح ہے کہ انہوں نے کچھ آسان مرصع اسلوب اختیار کیا۔ لیکن میر امن کی زبان کا مضحکہ بھی اڑایا ہے۔ مولانا غلام امام شہید اور مولانا امام بخش صہبائی پرانے اندازی پر لکھتے رہے۔ ان انشاء پردازوں کے سامنے سادہ نگاری کی روایات نہیں تھیں۔ اور اُن کے ذہن جس ادبی فضا میں نشو ونما پائے تھے وہ سادہ نگاری کو ادب سمجھ نہیں سکتا تھا لیکن اس سے انکار نہیں

کیا جا سکتا ہے کہ اردو نثر کو ہماری بول چال کی معیاری ادبی زبان کی طرف لانے کی یہ پہلی کوشش اور پہلی تحریک تھی۔

انگریزی اقتدار اور تسلط کے ساتھ اور بھی کئی چیزیں آئیں اِن میں سب سے اہم چیز تعلیم کا نیا نظام تھا۔ ہماری پرانی تعلیم روایتی تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی چیز کو اس لئے مانتے تھے کہ وہ ہمارے اسلاف کی کہی ہوئی باتیں ہیں، وہ غلط نہیں ہو سکتیں۔ تنقید، چھان بین اور سند کا حلقہ اسی تصور کے اطراف گھومتا تھا۔ جب انگریزوں کا تسلط قائم ہوا تو پہلے پہلے دفتری ضرورتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے اور اس کے بعد اس کی اہمیت کا اندازہ کر کے بھارت والوں نے انگریزی زبان کو پڑھنا شروع کیا۔ انگریزی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت نے رفتہ رفتہ ایک نیا منظر آنکھوں کے سامنے کھول دیا۔ اور علوم و فنون اور ادب کے نئے نمونوں سے روشناس کرایا، یہ نیا ادب، صوری بندشوں کا کم سے کم پابند تھا۔ اور معنوی اعتبار سے اس میں بہت تنوع تھا۔ یہ ادب ایک برتر قوم کا اثاثہ بھی تھا۔ اس لئے اس کا اثر بہت جلد نمایاں ہونے لگا۔

جو قوم اب بھارت پر مسلط ہونے جا رہی تھی، اس کی سماجی زندگی ہمارے اطراف کی قوموں میں سے کسی قوم کی زندگی سے مشابہ نہیں تھی وہ اُن کے رہن سہن اور کھانے پینے کے طریقے اور ان کے لباس ہم سے بالکل مختلف تھے۔ ان کی دلچسپیاں مختلف تھی، اُن کا مذاق مختلف

تھا، اور ان کی فنکاری کے معیار مختلف تھے۔ اس کا اثر بھی ہمارے سماج پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ انگریزوں کے مقابلے میں ہندوستانیوں کو سیاسی اور فکری میدانوں میں برابر پسپائی ہوتی گئی۔ ایک خیال دلوں میں گھر کرنے لگا کہ ہمارے نظام زندگی میں کہیں نہ کہیں خرابی ضرور ہے۔

اس لئے ذہنی رجحان نے مختلف نقطۂ خیال رکھنے والوں کو مختلف طریقوں سے سوچنے پر ابھارا۔ چنانچہ کچھ لوگ جن کی واقفیت قدیم علوم سے گہری تھی وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ ہم کو اپنے ماضی کی طرف لوٹنا چاہیئے۔ اور پھر انہیں حالات کو پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے جو ماضی میں ہماری ترقی کا باعث ہوئے تھے۔ اسی خیال کے مدنظر بھارت کے مختلف نقطۂ خیال اور الگ الگ عقیدہ رکھنے والوں میں ایک ذہنی خلفشار نمایاں ہوا، اور سماجی زندگی اور مذہبی عقائد میں بڑی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں جس کے نتیجے کے طور پر بھارت میں ایک نئی روشنی طلوع ہونے لگیں اور بھارت قرون وسطیٰ سے نکل کر عہد جدید میں قدم رکھنے لگا۔ ان تحریکوں میں مولانا سید احمد بریلوی کی تحریک رام موہن رائے اور سوامی دیانند کی تحریکیں دوررس نتائج کی حامل تھیں مولانا سید احمد بریلوی کی تحریک مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاح پر حاوی تھی۔ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں جو لغو رسمیں اور عقیدے رائج ہو گئے تھے اور جنہیں مذہبی عقیدے

کی اہمیت دے دی گئی تھی، اُن کے خلاف جہاد کیا، ان کی مساعی کا ماحصل یہ تھا کہ ایسے سارے رسوم جو پیغمبرِ اسلام کے احکام اور زندگی کے خلاف ہیں۔ ترک کئے جانے چاہئیں۔ ان کے پیرووں میں مولوی عبد الحیٔ اور مولوی محمد اسمٰعیل شہید بڑا رتبہ رکھتے ہیں۔ مولوی اسمٰعیل شہید بڑے فصیح مقرر بھی تھے۔ انہوں نے اپنے خیالات کو پھیلانے کے لئے اردو میں ایک دو اہم کتابیں لکھی تھیں۔ یہ "صراط مستقیم" اور "تقویۃ الایمان" کے نام سے موسوم ہیں۔ "تقویۃ الایمان" میں ایک مقام پر توحید پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"سننا چاہیئے کہ اکثر لوگ پیروں کو، پیغمبروں کو اور اماموں کو اور فرشتوں کو اور پریوں کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں۔ ان سے مرادیں مانگتے ہیں۔ اور ان کی منتیں مانتے ہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا نام عبد النبی رکھتا ہے، کوئی علی بخش، کوئی حسین بخش، کوئی پیر بخش، کوئی مدار بخش، کوئی سالار بخش۔ کوئی غلام محی الدین، کوئی غلام معین الدین، اور ان کے جینے کے لئے کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بدھی پہنا تا ہے، کوئی کسی کے نام کے کپڑے پہنا تا ہے، کوئی کسی کے نام کی بیڑی ڈالتا ہے، کوئی کسی کے نام کے جانور ذبح کرتا ہے کوئی مشکل کے وقت دہائی دیتا ہے کوئی اپنی باتوں

ہیں کسی کے نام کی قسم کھاتا ہے۔ یہ جھوٹے مسلمان دعویٰ مسلمانی کئے جاتے ہیں۔ سبحان اللہ یہ منہ اور یہ دعویٰ!!

اردو کے مشہور شاعر مومن بھی، مولانا سید احمد بریلوی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ چنانچہ ایک مثنوی میں سید صاحب کی مدح اس طرح کرتے ہیں ؎

وہ خضرِ طریقِ رسولِ خدا
کہ جو پیرو اس کا سو ہے پیشوا
وہ نورِ مجسم وہ ظلِّ الٰہ
کہ سائے سے جس کے خجل مہر و ماہ
زہے سید احمد قبولِ خدا
سرِ امتانِ رسول فدا

راجہ رام موہن رائے کی اصلاحی تحریک بنگال سے سنہ ۱۸۲۸ء میں شروع ہوئی اور برہما سماج کے نام سے موسوم ہوئی۔ رام موہن رائے نے توحید کی تبلیغ سے اپنے مشن کا آغاز کیا۔ اور ہندوؤں میں مختلف دیوتاؤں پر عقیدہ رکھنے اور ان کی مورتیوں کو پوجنے اور رسوم کے طور طریقوں پر انہوں نے سخت حملے کئے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ وہ جن عقیدوں کا پرچار کر رہے ہیں، وہ ہندو پرانوں کے عین مطابق ہے اور جو غلط رسمیں اور توہمات ہندوؤں میں رائج ہو گئے ہیں، وہ

بدعتیں ہیں۔ اپنے خیالات کی تائید میں انہوں نے پرانوں کو بنگالی میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔

برہما سماج کے اصولوں کا پرچار راجا رام موہن رائے کے بعد ان کے کئی اور پیروؤں نے کیا۔ اور یہ پیشوا، رفتہ رفتہ دیوتا کے رتبہ تک اٹھائے گئے۔ اس لئے ۱۸۷۸ء میں ایک نیا سماج "سادھارن برہما سماج" کے نام سے قائم ہوا۔ مہاراشٹر کے علاقہ میں برہما سماج تحریک نے ایک نیا روپ اختیار کیا، اور وہ پرارتھنا سماج کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ ساری تحریکیں مغرب کی نئی در آمد شدہ عقلیت پسندی کا ردعمل تھیں۔

آریہ سماج تحریک کے بانی سوامی دیانند تھے، وہ سنسکرت کے بڑے اچھے عالم تھے، لیکن انگریزی تعلیم سے نا واقف تھے۔ ان کی اصلاحی تحریک کا مرکز یہ تھا کہ ہندو سماج سے بدعتی عقیدوں کو دور کر کے وہ ان کی اصلاح چاہتے تھے۔ ان کا نعرہ "ویدوں کی طرف رجعت" تھا۔ انہوں نے ذات پات کی تہود کے خلاف بھی آواز اٹھائی اور خدا کی توحید پہ زور دیا۔ شدھی کی تحریک انہیں نے شروع کی تھی جس کا مقصد غیر ہندوؤں کو ہندو بنانا تھا۔ آریہ سماج تحریک بھی برہما سماج تحریک ہی سے اٹھی تھی۔

ہندوؤں کے احیا کی تحریکیوں سے ملی ہوئی ایک تحریک تھیوسافیکل سوسائٹی کی تحریک بھی تھی جس کے بانی، مادام بلاوٹسکی

اور کرنل اوسکاٹ تھے۔ یہ تحریک امریکہ سے شروع ہوئی تھی۔ لیکن مسز اینی بسنٹ کی مساعی سے اس تحریک نے بھارت میں مدراس کے مقام اڈیار میں بڑا فروغ پایا۔ اینی بسنٹ کا خیال یہ تھا کہ ہندوستان کے موجودہ گوناگوں مسائل کا واحد حل بھارت کے پرانے آدرشوں اور اداروں کا احیاء ہے۔

برہما سماج تحریک جو دراصل نئے حالات کی پیدا کردہ تھی۔ اور مغرب کی عقلیت پسندی اور مشرق کی روایت پسندی کے درمیان سمجھوتہ کی حیثیت رکھتی تھی، جب ٹھیٹ احیائی اور رجعت پسندانہ تحریک بن گئی تو پھر سمجھوتے کی اور کچھ اور نئی تحریکیں اٹھنے لگیں۔ ان میں سے ایک علی گڑھ تحریک بھی تھی۔ مولانا سید احمد بریلوی کی تحریک کا پس منظر یہ تھا کہ مغلیہ سلطنت ابھی برائے نام صحیح، لیکن باقی تھی اور اس کے تن مردہ میں جان ڈالنا بھی اس تحریک کے بانی کے تحت شعور میں تھا۔

لیکن جب ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں نے اس مریض حکومت کا خاتمہ کر دیا، تو نئے انداز سے سوچنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اور یہ کام سرسید نے انجام دیا۔ سرسید کے پیش نظر نئے حالات سے مقابلہ کرنا تھا۔ جو اب حقیقت بن چکے تھے اور زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالنا تھا۔ یہ تحریک ایک اہم ادبی پہلو بھی رکھتی ہے۔ لیکن اس کی اصل بنیاد سماجی اور مادی تھی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کا اثر دہلی، میرٹھ، لکھنو اور دوسرے بڑے بڑے مقامات کے سربرآوردہ خاندانوں پر پڑا تھا۔ ہنگاموں کے فرو ہونے کے بعد، مغلیہ حکمراں اور ان سے نزدیک اور دور کا بھی تعلق رکھنے والے عمائدین کو ان ہنگاموں کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ یہ تحریک بازتعمیر کی کوشش تھی۔

سرسید احمد خاں کے اجداد کا تعلق قلعہ سے رہ چکا تھا۔ لیکن خود انھوں نے انگریزوں کی نوکری سے زندگی کا آغاز کیا۔ ان کے اسلاف مذہبی علوم کے حامل تھے اور اسی ماحول میں ان کی تربیت بھی ہوئی تھی۔ انہوں نے مولوی سید احمد بریلوی، مولوی اسمٰعیل شہید اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے خیالات کا مطالعہ کیا تھا اور ان سے متاثر بھی تھے۔ علوم دینی میں ان کی معلومات بہت زیادہ وسیع اور گہری نہیں تھیں، لیکن وہ ذہن رسا رکھتے تھے اور گردوپیش کے حالات کو سمجھنے والا ذہن انہیں عطا ہوا تھا۔

سرسید کو تاریخ سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ جب وہ دہلی میں تھے تو دہلی اور اس کے نواح کی عمارتوں کی تفصیلات اور تاریخ پر ایک کتاب "آثار الصنادید" کے نام سے لکھی تھی۔ سرسید کی دوسری دلچسپی تعلیم اور اشاعت علم تھی۔ ان کی یہ ساری دلچسپیاں ۱۸۵۷ء کے بعد کی زبوں حالی کے ردعمل کے طور پر نشوونما پانے لگیں۔ جو بالآخر اپنے مکمل روپ میں نمایاں ہو کر کبھی علی گڑھ تحریک کے نام سے

موسوم ہوئیں۔

سرسید کا بڑا کارنامہ علی گڑھ میں کالج کا قیام تھا۔ لیکن سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام اور رسالہ "تہذیب الاخلاق" کا اجرا بھی کچھ اہم کارنامے نہیں ہیں۔ ان کی مساعی کے خلوص نے سرسید کو اس میدان میں تنہا نہیں رہنے دیا۔ بلکہ جلد ہی اہل فکر و قلم کی ایک چھوٹی سی مگر موثر جماعت ان کی ہم نوا اور رفیق کار ہو گئی اس جماعت کے رکن رکین محسن الملک، وقار الملک حالی اور شبلی تھے۔

سرسید کی تصانیف "خطبات احمدیہ" اور تفسیر قرآن سے ان کی اصلاحی مساعی کا رخ ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے مذہب اسلام کو ان روایات سے ہٹ کر، جو عام طور پر اکٹھی ہو گئی تھیں۔ کسی قدر عقلیت پسندی کے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مغرب کی عقلیت پسندی کی صدائے بازگشت ہے۔

"رسالہ تہذیب الاخلاق" در اصل اپنے عہد کی اس انقلاب پسند جماعت کا ترجمان تھا۔ اور حالی اس جماعت کی سرگرمیوں کے گیت گانے والے "رسالہ تہذیب اخلاق" میں مذہب، تاریخ، ثقافت، تعلیم اور معاشرت، سب ہی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہے۔ لیکن ان کا رخ اصلاحی اور تشریحی ہے —

محسن الملک نے سرسید کا نہ صرف ان کی اصلاحی اور قلمی کوششوں میں ہاتھ بٹایا بلکہ کالج کے انتظامی بار کو بھی سنبھالا۔

سرسید کی ساری اصلاحی مساعی، جو سپرد قلم ہو چکی ہیں اپنی سادگی زبان اور سلاست اظہار کی وجہ سے اردو نثر میں ایک نئے اسلوب کے آغاز کی نشان دہی کرتی ہیں۔

حالی کی مساعی نے ادبی اصلاح کی کوششوں کو معین صورت دے دی۔ حالی سے کچھ پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے قیام پنجاب کے زمانے میں اردو شاعری میں غیر ضروری بندشوں کے خلاف اپنے ایک دو لکچروں میں آواز بلند کی تھی۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک نئی راہ پر ڈالنے کے مقصد سے انجمن پنجاب میں نئی طرز کے مشاعروں کی طرح بھی ڈالی تھی۔ ان مشاعروں میں طرح مصرعہ مقرر کرنے کی پرانی رسم کو ترک کر کے موضوعات پر نظمیں لکھنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ چنانچہ حالی نے اپنی بعض نظمیں اور نظم "برکھا رت" اسی مشاعرے کے لئے لکھی۔ اور پڑھ کر سنائی تھی۔ آزاد کی نظمیں "امید کی خوشی" اور "شب قدر دامن کا دربار" بھی اسی مشاعرے میں پڑھی گئی تھیں۔ لیکن آزاد کی توجہ دوسرے ادبی کارناموں کے سرانجام دینے میں مصروف رہی۔ اس لئے اردو شاعری کے مستقبل کے لئے انھوں نے کوئی نظام نہیں بنایا، آزاد ایک انوکھا اسلوب رکھنے والے نثر نگار تھے۔ چنانچہ انھوں نے

نثر میں دو کار نامے "آبحیات" اور "نیرنگ خیال" جو چھوڑے ہیں وہ اونچے پایہ کا ادب ہیں۔ "نیرنگ خیال" انگریزی ادب کے مطالعہ سے متاثر ہے۔

حالی غزل گو شاعر تھے۔ اور ان کی غزل جن اثرات کے تحت نشو و نما پائی۔ اس کی نشان دہی خود انہوں نے اپنے ایک شعر میں کر دی ہے ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

اپنے وطن پانی پت سے دہلی آنے کے بعد وہ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کی ملازمت میں رہے۔ اسی زمانے میں غالب سے بھی ان کے مراسم بڑھے، ملازمت کے سلسلے میں وہ لاہور میں بھی کچھ عرصہ رہے، جب وہ دہلی واپس آئے تو سرسید کے مشن نے انہیں ایک ذہنی توافق نظر آیا۔ اسی لئے وہ اس مشن کا ایک جزو بن گئے۔

حالی کی اصلاحی مساعی نظم اور نثر دونوں پہ حاوی ہیں۔ اردو غزل کو انہوں نے تخیلی اور تغزل کے مضامین سے ہٹ کر حقائق اور اخلاقی اقدار سے روشناس کرانے میں ان کی کوششیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ عاشقانہ غزل کے بارے میں ان کا دلچسپ معذرت نامہ ہے ؎

ہوئی ریعان جوانی کی بہار آخر حیف
طبع رنگین تھی مٹے، حسن کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ اُمنگ
سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
آپ بیتی نہ ہو جو ہے وہ کہانی بے لطف
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زبان ٹکسالی
ہاں مگر کیجیئے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں
لایئے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی

شعر کے نئے تصور کی وضاحت میں انہوں نے جو قطعہ لکھا ہے وہ اردو شاعری کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کہتے ہیں سے

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو

حسن اپنا گرد کھا نہیں سکتا جہاں کو
آپ کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری
قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجیو نماز تو

یہ گویا نئی شاعری کا اعلامیہ ہے۔ اس کے علاوہ حالی نے شعری تنقید پر بھی ایک مستقل کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" کے نام سے لکھی تھی۔ جس میں شعر کی ماہیت، ضرورت اور اس کے لوازم اور خصوصیات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کتاب کے آخر میں اردو شاعری کی مختلف اصناف کی اصلاح کے لئے مشورے بھی دیئے ہیں "مقدمہ" سے اردو ادب میں شعر کی اصولی تنقید کا آغاز ہوتا ہے۔

حالی نے ایک طویل نظم "مسدس مد و جزر اسلام" کے نام سے بھی لکھی تھی۔ جو اپنے موضوع، فکر اور اسلوب ہر لحاظ سے اردو میں ایک نئی بیداری کا اعلان کرتی ہے۔ حالی اردو میں نئی سوانح نگاری کا بھی آغاز ہوا۔ ان کے کارنامے "حیاتِ سعدی"، "یادگار غالب" اور "حیات جاوید" اس موضوع کی ابتدائی تصانیف جیسے سیرت، شمائل، تواریخ وغیرہ سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ ان میں افراد کو جن کی سوانح لکھی جا رہی ہیں، انسان کی حیثیت سے جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو ادب میں ان اصلاحی اور توسیعی

مساعی کے نتیجے کے طور پر تنقید شعر، حیات یا سوانح عمری کے علاوہ انشائیہ یا مضمون نگاری کا آغاز ہوا۔ انشائیہ کی طرز کے کچھ پاروں کے ابتدائی نمونے ہم کو غلام امام شہید کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ ان کے بعد ماسٹر رام چندر نے حقیقت میں اردو انشائیہ کو ایک معین شکل عطا کی۔ ماسٹر رام چندر دہلی کالج کے ریاضی اور سائنس کے استاد تھے۔ مولوی ذکا۔ اللہ ان کے شاگرد خاص تھے۔ انہوں نے "محب ہند" اور دوسرے کئی اصلاحی اخبارات بھی جاری کئے تھے۔ اس تعلق سے انہیں انشائیہ نگاری کو ترقی دینے کے کافی مواقع ملے۔ چنانچہ انہوں نے مختلف موضوعات پر سینکڑوں انشائیے لکھے۔ وہ "تذکرۃ الکاملین" کے بھی مصنف ہیں۔

سرسید احمد خاں کے ہاتھوں میں انشائیہ کا رنگ روپ نکھرا۔ حالی نے بھی کئی انشائیہ لکھے جو "مقالات حالی" اور "مضامین حالی" کے مجموعوں میں شائع ہوئے ہیں۔ لیکن حالی انشائیہ نگاری میں سرسید کے پیرو ہیں، گو یہ صحیح ہے کہ ان کا اسلوب اپنا ہے۔ اور ان کے موضوع زیادہ ادبی ہیں۔

اردو ادب سے ایک نئی صنف، ناول اسی زمانے میں روشناس ہوئی۔ ناول جس کے لئے ہندی کے علمار نے "اپنیاس" کی اصطلاح وضع کر لی ہے لیکن اردو والوں نے اس صنف کے ساتھ اس کی اصطلاح بھی مغربی ادب سے مستعار لے لی ہے، اپنے آغاز کے

لحاظ سے ایک مغربی صنف ادب ہے۔ اور اس کی نشو ونما وہیں ہوئی۔ اس سے پہلے بھارت میں لمبی لمبی کہانیاں تھیں۔ قصے در قصے کی شکل کی داستانیں تھیں لیکن زندگی کو ایک اعتدال کا طول رکھنے والی فنی قصے کی شکل میں پیش کرنے کا فن ہم نے مغرب سے سیکھا۔

ناول کا آغاز اصلاحی مساعی کی ایک کڑی کے طور پر ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے فرو ہو جانے کے بعد، جو معاشی، ذہنی، اخلاقی اور علمی پستی ہندوستان کے بعض طبقوں اور خاص طور پر مسلمانوں میں پیدا ہو چکی تھی، اس کو سہارا دینے کی بھی ضرورت تھی اس سے پہلے انہیں یہ بھی بتانے کی ضرورت تھی کہ ان کی زندگی میں بعض ایسی برائیاں پیدا ہو گئی ہیں جو تباہ کن ہیں اور ان کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے یہ کام بڑی خوبی سے انجام دیا۔ وہ مسلمانوں ہی کی زندگی۔ اور ان کے سماجی اور اخلاقی عیوب کو خوب جانتے تھے اور جو کچھ وہ جانتے تھے، اس کو خوبی سے بیان کرنے پر قدرت بھی رکھتے تھے۔

نذیر احمد نے کئی ناول لکھے۔ ان کا سب سے بہتر ناول "توبۃ النصوح" سمجھا جاتا ہے۔ اس ناول میں دہلی کے ایک خاندان کی ذہنی اور اخلاقی تباہی اور پھر اس کی اصلاح کی تفصیل لکھی ہے۔ اس ناول میں بعض طول طویل مواعظ سے قطع نظر، ساری کہانی

خوبی سے کہی گئی ہے۔ اس میں کئی لازوال کردار ہیں۔ ایک ظاہر دار بیگ کا مثالی کردار ہے، دوسرا کلیم کا، کچھ کردار دہلی گڑھی کے مولویوں کے ہیں۔ اس ناول سے انسانی سرشت سے نذیر احمد کی گہری واقفیت پر روشنی پڑتی ہے۔ نذیر احمد کو دلی کی صاف ستھری اور بامحاورہ زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اسی لئے یہ کارنامہ ان کا شاہکار مانا گیا ہے۔

نذیر احمد کے دوسرے ناولوں میں "ابن الوقت" بھی اہم ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء کے زمانے کی ایک کہانی لکھی ہے۔ "محصنات" یا "فسانہ مبتلا" بھی اُن کے اچھے ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ کچھ ناول انہوں نے خاص طور پر لڑکیوں اور خواتین کی اصلاح کے لئے لکھے تھے۔ اُن میں "مراۃ العروس" "بنات النعش" اور "رویائے صادقہ" قابلِ ذکر ہیں۔

نذیر احمد نے قانون تعزیرات ہند اور قرآن کا ترجمہ بھی اردو میں کیا تھا۔

تاریخ نگاری اور سوانح نگاری کے نئے تصور کو اس عہد میں شبلی نے سب سے زیادہ مقبول بنایا۔ ذکاء اللہ جو انشائیہ نگاری میں بہت آگے تھے، تاریخ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی بھارت کی ایک تاریخ لکھی ہے جو دس جلدوں میں شائع ہوئی ہے لیکن تاریخ نگاری میں ان نئے تحقیقی اصولوں سے وہ زیادہ متاثر نہیں

معلوم ہوتے، حالانکہ ان کی پہنچ میں بہت بڑی جدت تھی۔ وہ ریاضی کے بھی اچھے عالم تھے، لیکن ان کا خاص میدان انشائیہ نگاری تھی! انھوں نے اخلاقی، تاریخی اور ادبی موضوعات پر سینکڑوں انشائیے لکھے ہیں، اور بعض انشائیوں میں ہندوستان کے انشاء پردازوں اور ادبی نظریوں پر بھی جدید نقطہ نظر سے بحث کی ہے۔ ذکاء اللہ دلی کالج کے طالب علم تھے۔ جہاں نذیر احمد، اور مولوی محمد حسین آزاد بھی ان کے ساتھ پڑھتے تھے۔ ذکاء اللہ، ماسٹر رام چندر کے خاص شاگردوں میں بہت ممتاز تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان کا تقرر دہلی کالج ہی میں پروفیسر ریاضی کی حیثیت سے ہوگیا تھا۔ بعد میں وہ سنٹرل کالج الہ آباد میں عربی اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے تھے۔

ذکاء اللہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں سے اکثر کتابیں بچوں کے درس کی ہیں۔ انشائیہ مضمون، وہ تہذیب اخلاق، سائنٹفک گزٹ (علی گڑھ) رسالہ حسن (حیدرآباد) وغیرہ میں التزام کے ساتھ بھیجا کرتے تھے۔

اس اصلاح اور تحریک کے دور کے سب سے زیادہ سربرآوردہ مورخ اور تاریخی سوانح نگار شبلی نعمانی ہیں۔ ٹھیٹ تاریخ پر ان کی کوئی تصنیف نہیں۔ لیکن تاریخی شخصیتوں کی سوانح عمریاں انھوں نے لکھی ہیں۔

ہیروز آف انڈیا کے نمونے پر اردو میں ہیروز آف اسلام کا

سلسلہ شبلی نے شروع کیا تھا۔ جس کی پہلی کڑی "المامون" ہے۔ مامون عباسی خلفاء میں اپنے علم و فضل کی سرپرستی کی وجہ سے بہت نمایاں ہے شبلی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ حیات کے نجی واقعات سے زیادہ اپنے ہیرو کے تاریخی ماحول، واقعات اور کارناموں پر زور دیتے ہیں۔ ان کی دوسری تصنیف، الفاروق، آنحضرت کے دوسرے خلیفہ عمر فاروق کی حیات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔ شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ سیرۃ النبی" ہے۔ جس میں عقیدت مندی کے ساتھ ساتھ انھوں نے واقعات کی چھان بین اور تحقیق کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ "سیرۃ النعمان" بھی ان کی مشہور تصانیف میں سے ہے۔

شبلی علم و فضل کے لحاظ سے بہت فضیلت رکھتے تھے۔ تاریخ کے علاوہ فلسفہ، منطق اور ادب سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی اسلامی فلسفہ میں ان کی کتاب "علم الکلام" سے نئے عہد کی بیداری کے پورے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ فارسی شعراء کا ایک تحقیقی اور تنقیدی تذکرہ بھی انہوں نے "شعر العجم" کے نام سے لکھا ہے۔ جس میں شعر اور تنقید شعر کے عام معیاروں سے بھی بحث کی گئی ہے۔ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد، تنقید شعر کے نئے زاویوں کی تشریح میں یہ دوسرا اہم کارنامہ ہے۔

عملی تنقید میں شبلی کا کارنامہ "موازنہ انیس و دبیر" بھی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن شبلی کی تنقید میں کسی قدر جانب داری ہوتی ہے۔ وہ

ہر حیثیت سے انیس کو دبیر پر فوقیت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

شبلی فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔ اردو میں ان کی نظموں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ تاریخ سے ان کو جو دلچسپی تھی، اس نے نظموں کے لیئے بھی تاریخی واقعات کو موضوع بنانے کی انہیں ترغیب دی۔ چنانچہ ان کی نظمیں "عدل جہانگیر" اور "ہمارا طرز حکومت" تاریخی نظموں کے پاکیزہ نمونے ہیں۔ شبلی نے ایک مثنوی بھی "صبح امید" کے نام سے لکھی تھی۔ اس مثنوی میں مسلمانوں کے شاندار مستقبل کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ شبلی کے زمانے ہی سے انگریزی حکومت کے خلاف جذبات ابھرنے لگے تھے۔ چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ دونوں بھارت کے لوگوں میں تنظیم اور بیداری پیدا کر رہے تھے۔ شبلی مسلم لیگ کے ہمنوا نہیں تھے اس لیئے وہ لیگ پر تنقید کرتے ہیں۔ شبلی ابتداء میں سرسید کے بھی مداح تھے۔ لیکن بعد میں ان کے خیالات اور کام کے طریقوں سے وہ اختلاف کرنے لگے تھے۔ اس کا اندازہ ان کی دو نظموں کے اقتباس سے ہو سکتا ہے۔ مثنوی "صبح امید" میں شبلی نے سرسید کی تصویر اس طرح پیش کی تھی ؎

وہ کشتۂ قوم وہ فدائی

اٹھا لیئے کاسۂ گدائی

ایک ایک سے عرض حال کرنا
در وہ پھرا سوال کرنا
ہر بزم ہر انجمن میں پہنچا
ہر باغ میں ہر چمن میں پہنچا
گذارا وہ ہر ایک رہ گذر پر
دی اس نے صدا ہر ایک در پر

لیکن بعد میں جب انہیں سرسید کے سیاسی خیالات سے اختلاف ہوگیا تھا وہ سرسید کے کاموں کی تنقیص اس طرح کرتے ہیں ؎

آپ نے ہم کو سکھائے ہیں جو یورپ کے علوم
اس ضرورت سے نہیں قوم کو ہرگز انکار
بحث یہ ہے کہ وہ اس طرز سے بھی ممکن تھا
کہ نہ گھٹتا کبھی ناموس شریعت کا وقار

سرسید اور ان کے دوسرے رفقا کے مغرب کی طرف رجحان کے خلاف یہ ایک دوست کی آواز تھی جو نیچے سروں میں اٹھی تھی۔ لیکن اکبر الہ آبادی کی شاعری میں یہ اپنے اونچے سروں میں سنائی دیتی ہے۔

اکبر اردو کے سب سے زیادہ نمایاں مزاح اور طنز نگار شاعر ہیں۔ ان کا تعلق ادبی زندگی کے آغاز میں "اودھ پنچ" سے

رہ چکا تھا۔" اودھ پنچ" اصل میں اس زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات اور خاص طور پر علی گڑھ کی اصلاحی تحریک کے خلاف ردّ عمل تھا۔ اس میں سیاسی سماجی، ادبی، سب ہی طرح کے مضامین اور انشائیے چھپتے تھے۔ لیکن اس کے لکھنے والوں نے طنز و مزاح کو سیاسی امور اور حکومت کی تنقیدوں کے لئے آڑ بنایا تھا۔ سر سید کو پنچ بہادر کے دربار سے "پیر نیچر" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ اور ان سے مرتدوں اور ملحدوں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ "اودھ پنچ" کے دوسرے انشائیہ نگاروں میں منشی سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، منشی جوالا پرشاد برق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، سید محمد آزاد وغیرہ بہت پیش پیش تھے۔ "اودھ پنچ" کی مساعی نے کچھ اچھا سیاسی مزاحیہ اور طنزیہ ادب اردو میں پیدا کر دیا ہے، گو یہ صحیح ہے کہ اس کا مذاق ہمیشہ یکساں اونچے معیار پر نہیں رہا۔

"اودھ پنچ" کے ایک سر برآوردہ لکھنے والے پنڈت رتن ناتھ سرشار تھے۔ ان کے کارنامے "فسانۂ آزاد" "سیر کہسار" اور "جام سرشار" میں بھی قدیم اور جدید تصورات کا تصادم نظر آتا ہے ان کو سیاست سے براہ راست تعلق نہیں تھا۔ لیکن ان کے یہاں کہیں کہیں سیاسی تعریفوں کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ وہ جب نئی تہذیب کے بارے میں لکھتے ہیں تو جا بجا وہ سنجیدہ لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں، لیکن ان کی سنجیدگی پر شبہ ہوتا ہے۔

اکبر الہ آبادی علی گڑھ مسلک کے مخالف تھے۔ وہ مغربی طور طریق پر بڑی سخت تنقید کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے لئے مزاحیہ انداز اور طنزیہ لب و لہجہ اختیار کیا تھا۔ ان کے طنز کے تیروں کا نشانہ، اُن کے زمانے کے سارے واقعات بنتے رہے، وہ سیاسی، ادبی، علمی، سماجی، غرض ہر مسئلے پر اپنے خاص نقطۂ نظر سے طنز کرتے ہیں۔

سرسید احمد خاں کی مساعی کے بارے میں انہوں نے ایک رباعی لکھی تھی۔۔۔ ۵

سید صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور
کہتا نہیں تم سے میں کہ اس سے ہو نفور
سوتوں کو جگا دیا انہوں نے لیکن
اللہ کا نام لے کے اٹھنا ہے ضرور

مغربی اثرات سے بھارت میں نئے سیاسی، معاشی، سماجی اور تعلیمی مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ اور پرانے اور نئے تصورات میں ابھی کوئی ترکیب عمل میں نہیں آئی تھی۔ پرانے سماج اور عقائد نے ابھی ہتھیار نہیں ڈال دیئے تھے۔ لیکن نئے تصورات کی دھارا بڑی تیزی کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں میں پھیل رہی تھی۔ فطرتاً نئے اور پرانے تصورات میں تصادم ہو رہا تھا۔ اس کے پورے نقوش اکبر کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ اُن کے کئی شعر ایسے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ بھارت

کے صاحب فکر کس طرح حالات میں سمجھوتہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں ؎

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

سرشار کے نو عمر معاصرین میں، اُردو ناول کو بہ حیثیت ایک ادبی روپ کے مقبول بنانے کا سہرا سب سے زیادہ شرر کے سر ہے۔ وہ مورخ بھی تھے، صحافی اور ادیب بھی۔ انہوں نے اپنے ناولوں کا موضوع اسلامی موضوع کے فیصلہ کن واقعات کو بنایا اور تاریخ اسلام کے تقریباً ایسے سارے واقعات پر انہوں نے ناول لکھے ہیں۔ چنانچہ "جویائے حق" آنحضرت کے حالات پر لکھا گیا ہے" فلپانا" حضرت عمر کے عہد خلافت سے تعلق رکھتا ہے۔ "ملک العزیز ورجنا" "فتح اندلس" "فلورا فلورنڈا" "منصور موہنا" سب شرر کے ایسے ہی تاریخی ناول ہیں۔ ناول کے فن کے اعتبار سے شرر کا شاہکار "فردوس بریں" سمجھا جاتا ہے۔

شرر نے انشائیے اور مضامین بھی بہت لکھے ہیں۔ اور ہر موضوع پر لکھے ہیں۔ ان کا رسالہ "دلگداز" اردو کی ادبی تاریخ کا ایک جز بن گیا ہے۔ شرر نے بلینک ورس "یعنی نظم غیر مقفیٰ کو بھی اردو میں رائج کیا۔

کی کوشش کی تھی، اور اس معاملے میں علی حیدر نظم طباطبائی نے بھی ان کی ہمنوائی کی، لیکن وقت اس کے لئے سازگار نہیں تھا۔ اس لئے یہ تحریک دب گئی۔

علی حیدر طباطبائی، عربی، فارسی، کے جید عالم اور اردو کے شاعر تھے۔ وہ ادبی اصناف میں انقلاب کے نہیں، بلکہ ارتقا کے قائل تھے۔ چنانچہ انھوں نے روایت کے حدود کے اندر رہ کر بغاوت کی تھی۔ یعنی قافیہ کی روایتی ترتیب سے ہٹ کر، انھوں نے قصیدے لکھے تھے اور بندوں کی صورت میں بھی قصیدے لکھے۔ بعض وقت رباعی کے اوزان بھی انھوں نے طویل نظموں، بندوں اور قصیدوں کے لئے اختیار کئے ہیں۔

طباطبائی کے دو بہت بلند پایہ کارنامے ہیں۔ ان میں سے ایک اُن کی مثنوی کا "ساقی نامہ شمشقیہ" ہے۔ جو شراب کی برائیوں پر لکھی گئی ہے دوسرا انگلستان کے مشہور شاعر گرے کی ایلجی کا اردو ترجمہ "گورِ غریباں" ہے۔ گورِ غریباں میں اسٹانزا کی قسم کے بندوں کو جس کامیابی کے ساتھ برتا گیا ہے، انہیں اردو نظموں میں اس خوبی سے کم برتا گیا ہوگا۔ طباطبائی نے غالب کے دیوان کی ایک شرح لکھی ہے۔

اردو میں صوری اور معنوی حیثیت سے ناول کے پایہ کو بلند کرنے والوں میں مرزا رسوا کا بھی شمار ہوتا ہے مرزا رسوا وسیع دلچسپیوں کے انسان تھے۔ لیکن ان کا ناول "امراؤ جان ادا" ان کا شاہکار ہے

اور اردو کی ادبیات عالیہ میں شمار ہوتا ہے۔ رسوا نے دو اور ناول "ذات شریف" و "شریف زادہ" بھی لکھے تھے لیکن وہ اتنے مقبول نہیں ہو سکے۔

حالی کی اصلاحی کوششوں کا اثر ملک کے نوعمر سخن سنجیوں پر بہت پڑا تھا۔ چنانچہ حالی کے بعد مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی اور شوق قدوائی جیسے شاعر اٹھے۔ محمد اسمٰعیل کے یہاں یہ اثر شعوری تھا۔ چنانچہ انھوں نے "جریدۂ عبرت" کے نام سے ایک ترکیب بند لکھا ہے۔ اس میں مروجہ اردو شاعری پر جو تنقید کی ہے وہ حالی کے خیالات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں ؎

سخنوران زماں کی بھی ہے یہی حالت
کہ اس قدیم ڈگر کو نہ چھوڑ یئے زنہار
سوائے عشق نہیں سوجھتا انہیں مضمون
سو وہ بھی محض خیالی گھڑت کا اک طومار
ہے شاعری میں یہ پہلا اصول موضوعہ
کہ جھوٹ موٹ کے بنجائیں ایک عاشق زار
نہ لکھتے ہیں کبھی نیرنگ حکمت وقدرت
نہ واقعات کے وہ کھینچتے ہیں نقش ونگار
تمام اگلے زمانے کا ہے یہ لیس خوردہ
کہ کر رہے ہیں جگالی وہ جس کو سو سو بار

اسمٰعیل میرٹھی کا بڑا کارنامہ ان کی فطری مناظر اور گھریلو موضوعات پر لکھی ہوئی نظمیں ہیں۔ وہ سادہ اور سلیس زبان میں دیہاتی اور گھریلو مناظر کے نقشے خوب کھینچ سکتے ہیں۔ "صبح کی آمد" اور "ہوا چلی" "برسات"، "گرمی کا موسم" وغیرہ ان کی نفیس نظمیں ہیں۔ اسمٰعیل نے ایک بے قافیہ نظم "تاروں بھری رات" کے عنوان سے لکھی ہے اس نظم میں ایسا ترنم ہے کہ اس کی وجہ سے قافیہ کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

اسمٰعیل نے غزل کا کافی سرمایہ چھوڑا ہے۔ غزل میں ان کا انداز عام طور پر متصوفانہ ہے۔

مناظر کی عمدہ تصویریں شوق قدوائی بھی خوب کھینچتے ہیں۔ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "گنجینہ" کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں بڑے متنوع موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں۔ چنانچہ ایک نظم "حسن" پر اور ایک "مہمانی" پر ہے۔ اس کے علاوہ ایک نظم "سائنس اور مذہب" پر لکھی ہے "سائنس اور مذہب" دراصل عہد نو کے ذہنی خلفشار کی مظہر ہے۔ سائنس اور نئے سائنسی علوم ابھی ابھی ہندوستان میں روشناس ہوئے تھے۔ اور بعض قدامت پرست یہ سمجھنے لگے کہ سائنس پڑھنے سے دین و ایمان جاتا ہے۔ شوق نئی روشنی کی تائید کرنے والوں میں سے تھے انہوں نے اس خیال کی تردید مذکورہ بالا نظم کے ذریعے کی ہے، وہ کہتے ہیں ؎

تم آخر سائنس کو مذہب کا دشمن کیوں سمجھتے ہو
غلط فہمی سے نادانی کے کانٹوں میں الجھتے ہو

اُن کا خیال یہ بھی ہے کہ سائنس حقیقت میں مظاہر قدرت کا علم ہے اور سائنس کی معلومات میں گہرائی، انسان کو منکر خدا سے زیادہ یزداں پرست بنا دیتی ہے کہتے ہیں سہ

جما دیتا ہے وہ ایمان کو خلاق ہستی پر
حوصلہ دیتا ہے وہ انسان کو یزداں پرستی پر

شوق نے نظم میں کچھ نئے تجربے بھی کئے تھے، مثلاً ان کی ایک طویل نظم " عالم خیال " ہے، جو دراصل پرانے بارہ ماسہ کا عکس ہے اُس میں ایک عورت کی زندگی کے تین رُخ دکھائے گئے ہیں۔ عورت کا شوہر سفر پر گیا ہوا ہے۔ پہلے رُخ میں وہ اُس کی یاد میں بے چین نظر آتی ہے اور اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے۔ دوسرے رُخ میں شوہر کا خط آنے کے بعد اس کے جذبات میں جو ہیجان برپا ہوتا ہے، اس کی نفسی تصویر کھینچتی ہے اور تیسرا رخ شوہر کے لوٹنے کے بعد کا ہے۔ شوق نے " قاسم وزہرہ " کے نام سے ایک منظوم ڈراما بھی لکھا تھا۔ انہوں نے غزلوں کا بھی ایک دیوان چھوڑا ہے، جو " فیضان شوق " کے نام سے موسوم ہے۔

انگریزی تسلط کے جلو میں جو نئی چیزیں بھارت میں آئیں اور جن کا اثر بھارت کی زندگی پر بڑا گہرا ہے ان میں چھاپہ خانہ اور اخبار بہت

اہمیت رکھتے ہیں۔ لیتھو کے چھاپے خانے بعض شہروں میں انیسویں صدی کے آغاز ہی میں قائم ہو گئے تھے۔ محمد حسین آزاد کے والد باقر حسین نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے "اردو اخبار" جاری کیا تھا اس میں خبروں کے علاوہ غزلیں اور مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ دہلی کالج کے استاد ماسٹر رام چندر کے اخبار "فوائد الناظرین" کے علاوہ "قران السعدین"، "اخبار مالوہ" وغیرہ بھی اسی زمانے میں شائع ہونے لگے

مبقاتی رسالوں میں "تہذیب الاخلاق"، سر عبدالقادر کے رسالے "مخزن"، اور حیدر آباد کے رسالے "حسن" نے اردو میں رسالوں کا بڑا اونچا معیار قائم کیا۔

ہندوستان ہمارا

سامراجی تسلط یوں تو ہر صورت میں نامطبوع اور ناخوشگوار رہا ہے۔ لیکن ہندوستان کی صورت میں انگریزوں کا تسلط نہایت ہی بے مزہ اور بدکیفی پیدا کرنے والا بھی ثابت ہوا۔ جن حالات میں اور جن حربوں سے یہ تسلط قائم ہوا تھا، اس کے نقوش ہندوستانیوں کے ذہنوں سے کبھی محو نہ ہو سکیں۔

یہ اس قدیم ملک اور عظیم ملک اور اس کے باشندوں کی توہین تھی کہ چالیس کروڑ نفوس بھیڑ بکریوں کی طرح پاسبانی کے دعویدار انسان نما بھیڑیوں کے حوالے ہو جائیں۔

ہندوستانیوں میں ملی احساس جلد ہی بیدار ہوا۔ اور ۱۸۵۷ء کی آزادی کی جنگ لڑی گئی۔ لیکن اس میں آزادی چاہنے والی قوتوں کو

شکست ہوئی۔ اور سامراجی قوتوں کا بول بالا رہا۔ طبعی حیثیت سے اور چالبازیوں کے مقابلے میں ہندوستانیوں کے ہار جانے کے بعد سامراجیوں نے اخلاقی اور ذہنی حیثیت سے بھی ان کو ہرانے کی کوشش کی۔ چنانچہ دار وگیر اور استبداد کا بازار سالہا سال تک گرم رہا۔ بالآخر ۱۸۸۳ء کے قریب سامراجی استبداد کی تاریک فضا سے قومی بیداری کی کرن پھوٹنے لگی۔ بنگال کے ایک برطرف شدہ آئی۔ سی۔ ایس بنرجی قومی خدمت کے لیئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں ملک و ملت کی خدمت انجام دینے کا ایک موقع جلد ہی ہاتھ آیا۔ اسی زمانے میں البرٹ بل کا ہنگامہ برپا ہو اتھا۔ ہندوستان میں انگریزوں نے قاعدہ یہ مقرر کیا تھا کہ یہاں کے رہنے والے یورپی لوگوں کے مقدمات کی سماعت کسی یورپی جج کے ذریعہ سے ہوئی تھی۔ البرٹ بل اس مراعات کو منسوخ کرنے کے لیئے پیش کیا گیا تھا۔ اس پر اینگلو انڈین اور بھارت میں رہنے والے یورپین لوگوں نے ایک ڈیفنس کونسل قائم کی۔ روپیہ جمع کیا۔ اور اس مراعات کو برقرار رکھنے کی جد و جہد کی۔ جس میں انہیں کامیابی ہو گئی۔

ہندوستانیوں کے لیئے یہ بات بڑی ناگوار تھی۔ چنانچہ اس زمانے کے اخباروں نے اس کے خلاف بہت کچھ لکھا، اور سربرآوردہ ادیبوں نے حکومت پر سخت تنقیدیں کیں۔ انہیں میں منشی جوالا پرشاد برق بھی تھے۔ وہ اردو کے اچھے شاعر اور انشا پرداز تھے، اور "اودھ پنچ"

(لکھنؤ) کے حلقے کے لکھنے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے مزاحیہ پیرائے میں بل کے بارے میں لکھا تھا۔

"پیارا بل ہاتھ سے بے ہاتھ ہو گیا۔ اس کی پیدائش پر کیا کیا ناز تھے۔ اس کے والدین نے اُسے کیسے کیسے لاڈ سے پالا تھا۔ مگر دشمنوں کی نظریں کھا گئیں۔

"انصاف اُلٹے اُستر سے مونڈا گیا۔ بغاوت نے نقارۂ فتح کر دم دھڑام بجا دیا۔"

اس مایوس کن فضا میں بنرجی نے متحد ہند کی تحریک کا آغاز کیا تو امید کی کچھ کچھ روشنی دکھائی دینے لگی۔ انھوں نے سارے بڑے بڑے شہروں میں گھوم کر تقریریں کیں اور رائے عامہ کو بیدار کیا۔

اُسی زمانے میں ہیوم نے ہندوستانیوں کو مشورہ دیا تھا کہ ان کی اپنی کوئی ایسی تنظیم ہونی چاہیئے، جس سے حکومت ضرورت کے وقت اہم مسائل کو رہ جوتا کر سکے۔ اور رائے معلوم کر سکے۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کی بنیاد اس ضرورت کو پورا کرنے کے مقصد سے رکھی گئی۔ اس کے قریبی زمانے میں مسلم لیگ کی ایک علیحدہ تنظیم بھی قائم ہوئی جس کا مقصد بھی ہندوستان کے لئے حصولِ آزادی تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کی تنظیم تھی اور ان کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتی تھی۔

کانگریس کے قیام کے ابتدائی ایام میں، حکومت اس سے بدظن نہیں تھی۔ چنانچہ حکومت کے بڑے بڑے عہدہ دار اور انگریز عہدہ دار اس کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ انگریز عہدہ دار کانگریس کی کارروائیوں کے مخالف ہونے گئے۔ اور انجام کار وہ باغی تنظیم قرار پائی۔

کانگریس کا بنیادی مطالبہ حکومت خود اختیاری یا سوراج تھا ابتدا میں کانگریس نے حکومت کی نامناسب کارروائیوں پر تنقید کو اپنا مطمح نظر بنایا تھا۔ لیکن جیسا جیسا زمانہ گذرتا گیا آزادی کے حصول کی جدوجہد میں وہ آگے بڑھتی گئی۔

لارڈ ڈفرن گورنر جنرل کے زمانے سے حکومت کے نقطۂ نظر میں تبدیلی ہونے لگی۔ حکومت کانگریس کے مطالبوں کو یہ کہہ کر ٹھکرا دینے لگی کہ وہ ملک کے پڑھے لکھے لوگوں کے مطالبات ہیں۔ جن کی تعداد بہت قلیل ہے اور عام ہندوستانیوں کو ان سے کوئی سروکار نہیں۔ اس زمانے کی ایک اہم شخصیت سرسید کی بھی تھی۔

سرسید بنیادی طور پر ایک قوم پرست تھے۔ چنانچہ انہوں نے البرٹ بل کے سلسلے میں سارے محب وطن لوگوں کی ہمنوائی کی لیکن کانگریس کی تحریک کی سے انہیں زیادہ ہمدردی نہیں تھی۔ اس کا سبب مسٹر ماجومدار نے یہ بتایا ہے کہ سرسید خلوص کے ساتھ اس بات پر اعتقاد رکھتے تھے کہ مسلمانوں کا کانگریس کی سیاسی تحریکوں میں ساتھ

دنیا ان کی توجہ کو تعلیمی اور سماجی اصلاح سے ہٹا دینے کا باعث ہوگا اور وہ اس زمانے میں مسلمانوں کے لئے تعلیم اور سماجی اصلاح کو سارے مسائل پر فوقیت دیتے تھے۔ انہیں سیاسی مسئلوں میں شبلی اور سرسید میں اختلاف ہو گیا تھا۔ شبلی اور ان کے ساتھ اکثر مسلمان کانگریس کے مساعی کے ساتھ تھے۔ موجودہ جمعیتہ العلماء ہند نے شبلی اور ان کے ہم خیال علماء کے تصورات سے حب وطن، اور قومی خدمت کے جذبہ کو ورثے میں پایا ہے۔

آزادی کی تحریک میں تیزی پیدا کرنے کی غرض سے کئی تنظیمیں قائم ہوئی تھیں اور ان سب کے مقاصد تقریباً ایک سے تھے۔ لیکن ہر ایک کے طریقہ کار الگ الگ تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس ان ساری جماعتوں میں جلد ایک موثر تنظیم بن گئی تھی جس میں ہر نقطہ خیال کے محب وطن شامل تھے۔ اس کے پلیٹ فارم سے بڑے بڑے قومی خدمت گار اٹھے۔ جن میں مہاتما گاندھی، نوروجی دادا بھائی رانا ڈے، پنڈت نہرو، محمد علی جناح، حسرت موہانی، سردار ولبھ پٹیل آنجہانی، تلک آنجہانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی سروجنی نائیڈو، مولانا ابوالکلام آزاد، کے نام احترام سے لئے جاتے ہیں۔ کانگریس کی تحریک نے آزادی کا ایسا جذبہ بھارت کے خواص اور عوام میں پیدا کر دیا تھا کہ آزادی کے پرستاروں نے جان و مال کی قربانیاں دے کر بھی آزادی کی تحریک کو آگے بڑھایا اور رفتہ

رفتہ اسے ہندوستان گیر بنا دیا۔

ایک سو سال سے کچھ کم مدت میں آزادی کی تحریک اتنی نشو و نما پا گئی تھی، بھارت کے سب لوگ اسے اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگے تھے ان حالات میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات کا ابھرنا ایک فطری بات تھی۔ حکومت نے صورت حال سے مقابلہ کی ہر ممکنہ کوشش کی۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد سے انگلستان کی حکومت کے لئے ہندوستان کو اپنے قابو میں رکھنا دوبھر ہو گیا تھا۔

اس صدی کے آغاز میں کانگریس کی قیادت گاندھی جی کے ہاتھ میں آئی۔ انہوں نے اپنی خاموش طبیعت اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی عادت کی بدولت آزادی کی منزل تک پہنچنے اور پہنچانے کے لئے بہت تیزی سے راہیں سوچیں، نئے طریقے آزمائے۔ جن میں سے ایک عدم تعاون کی تحریک تھی۔ دوسری تحریک سول نافرمانی کی تحریک تھی۔ گاندھی جی کی پیدا کی ہوئی ان تحریکوں نے اور خاموش مقاومتوں نے انگریز جیسی ترقی یافتہ اور سامانِ حرب سے لیس قوم کے بھی ناک چنے چبوا دیئے۔ اور انگریز اتنے بے دست و پا ہو گئے کہ شاید ہی کسی اور تحریک سے ہوئے ہوں گے۔ انہیں تحریکوں کے سلسلے کی ایک اور تحریک سودیشی تحریک بھی تھی جس کا ایک پہلو انگلستان میں بنے ہوئے مال کو خریدنے کا بائیکاٹ کرنا تھا۔ اس تحریک کی اشاعت اور ترقی نے انگریز تاجروں کے تن سے جان ہی کھینچ لی تھی۔

آزادی کی تحریک زینہ بہ زینہ چڑھتی ہوئی اسی صدی کے وسط میں اتنی آگے بڑھ گئی تھی کہ اس کا لازمی منتہا اگست ۱۹۴۲ء کے اجلاس میں ہندوستان چھوڑو" کی قرارداد کی منظوری تھی حکومت نے اس تحریک کو کچلنے کی کوشش کی اور سارے سربرآوردہ قائدین کو نظر بند کر دیا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ انگلستان کی سامراجی طاقت کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے آگے جنگ اپنے مقصد کے مطابق انجام تک پہنچانا تھا۔ اس وقت چرچل کی قدامت پرست جماعت برسرِ اقتدار تھی۔ لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد انگلستان میں لیبر جماعت برسر اقتدار آئی۔ لیبر جماعت کے قائد اور وزیر اعظم اٹلی حالات کا صحیح جائزہ لے سکے اور بالآخر ہندوستانی قائدوں سے گفت وشنید شروع کی۔

کانگریس جس زمانے میں ملک میں بیداری پھیلا رہی تھی، اسی زمانے میں مسلم لیگ بھی برسرعمل تھی اور یہ تنظیم بھی اپنے اصول کے مطابق، اور اپنے حلقہ اثر یعنی مسلمانوں میں تنظیم اور بیداری پیدا کرنے کا کام انجام دے رہی تھی۔ مسلم لیگ نے بالآخر اسی برصغیر میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ خطے کے تصور کو اپنا آدرش بنا لیا تھا۔ اور جیسا جیسا کانگریس اپنے آزادی کے آدرش کی طرف آگے بڑھتی گئی، مسلم لیگ بھی منزل تک پہنچنے کے لئے تیز تیز قدم اٹھاتی گئی۔ محمد علی جناح کی قیادت میں مسلم لیگ نے اتنی مستحکم تنظیم بنالی تھی کہ ملک کی سیاسی زندگی میں

وہ بھی ایک موثر طاقت بن گئی۔

انگریزوں نے کچھ عرصہ تک مسلم لیگ کے مطالبے کی آڑ لینے کی کوشش کی، لیکن آزادی کے معاملے میں مسلم لیگ بھی کانگریس کے تصورات سے بہت دور نہیں تھی۔

اس ساری کش مکش کا نتیجہ یہ ہونا تھا، کہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہندوستان کے قائدین نے بھی آزادی کی خاطر یہ گوارا کر لیا۔ بالآخر انگلستان کی پارلیمنٹ کو قانون بنا کر ۱۴ اور ۱۵ اگست کو پاکستان اور بھارت کو اقتدار منتقل کر دینا پڑا۔

انگریزوں کے تسلط کے آغاز ہی سے اردو کے ادیب اور شاعر کچھ مضطرب اور بے چین سے دکھائی دے رہے تھے۔ کیونکہ وہ بدلے ہوئے حالات سے جلد سمجھوتہ نہیں کر پائے۔ ایسے شاعر اور ادیب جن کی وفاداریاں شخصی تھیں۔ وہ بھی اپنے شخصی تعلقات کی بنا پر انگریزوں کے تسلط اور چیرہ دستی کے شکوہ سنج تھے لیکن ایک پرانے شاعر مصحفی نے اپنے عہد سے بہت آگے کی ایک بات کہہ دی، جب انہوں نے یہ شعر کہا تھا ؎

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

اس زمانے میں بھی جب انگریزوں یا انگریزی حکومت کے خلاف کسی طرح کے معاندانہ اشارہ کو بغاوت پر محمول کیا جاتا تھا۔ اردو کے

ادیبوں اور شاعروں نے شعر کے پردے میں اپنا دردِ دل سنانا شروع کر دیا تھا۔ حالی نے نئے حاکموں کی مغلوب قوم کے ساتھ جو ہمدردی ہوتی تھی، اس کو ایک قصاب کی اپنی بھیڑوں پر کی ہوئی عنایتوں سے تشبیہ دی تھی۔ حالی کا شعر یہ ہے ؎

صحرا میں کل بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمہارے آگئے یاد احسان ہمیں

حالی نے نئے انصاف کے معیاروں کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہا تھا۔

دادِ طلب جب غیر ہوں اور سب نوان میں کسی پاس نہ ہو
دکھلائی ہے زمانے نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں۔

اسی طرح کی دبی ہوئی کراہ کی آوازیں پہلی جنگ آزادی کے زمانے تک سنی جاتی رہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس میں وطن کے خدمت گاروں کی شکست نے، ساری صورت حال بدل دی تھی اب تک شہنشاہ ہند کا نام باقی تھا۔ اودھ میں بھی حکمران تھے۔ گو وہ انگریزوں کے زیر اثر آ چکے تھے۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال تھا کہ اس مریض کو شفا ہوگی۔ اور پھر وہ چلنے پھرنے اور حرکت کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ لیکن قومی عزائم کے فتح ہو جانے کے بعد، وہ پردہ جو سلطنت تھا، یکایک ہٹ گیا۔ اور ہماری قومی زندگی کی لامرکزیت اور بے دست و پائی کا احساس ہوا۔ اس کے علاوہ غلط سہاروں پر تکیہ

کر کے اطمینان سے بیٹھ رہنے کی جو عادت لوگوں کو تھی، اس میں ہل چل پیدا ہونے لگی۔

بے دست و پائی کا احساس سب سے پہلے اُن بے شمار قطعوں، مسدسوں، خطوط اور مضامین کے روپ میں ظاہر ہوا۔ جو دہلی کی تباہی پر لکھے گئے۔ اس دار و گیر میں بڑے بڑے خاندان اور سربرآوردہ ادیب اور شاعر بھی کام آئے تھے۔

مولانا محمد حسین کے والد محمد باقر پر جو "دہلی اردو اخبار" کے ایڈیٹر تھے۔ بغاوت کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کالج کے پرنسپل ٹیلر کے قتل کرنے کا بھی ان پر الزام تھا۔ اس لئے انہیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد، اردو اور فارسی کے اچھے عالم اور شاعر تھے، ان کو بھی بغاوت کے الزام میں قید کر دیا گیا۔ اور ان کی ساری جائداد ضبط کر لی گئی۔ مولانا امام بخش صہبائی بھی اردو کے اچھے شاعر اور صاحب طرز انشاء پرداز تھے، انہیں بھی بغاوت کے الزام میں گولی مار دی گئی۔ ہنگاموں نے بے شمار لوگوں کی جانیں لیں۔

اس کے بعد دار و گیر نے دہلی کے سربرآوردہ لوگوں اور ادیبوں پر ایسی تباہی نازل کی کہ عملاً اس کا ماضی اس کے حال سے منقطع ہو گیا اور مستقبل کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، کیونکہ یہ غیر ہمدرد قوم کے ہاتھوں میں تھا۔

اس زمانے میں غالب نے اپنے شاگرد، منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک خط لکھا تھا۔ اس میں دلّی کی زبوں حالی، اور لوگوں کی بے چارگی کا جو نقشہ کھینچا تھا، اس کا اندازہ، اس اقتباس ہو سکے گا۔ لکھتے ہیں:۔

"مبالغہ نہ جاننا، امیر و غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے، جاگیر دار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ، کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمان قلعہ پر شدت ہے، اور بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔"

آگے لکھتے ہیں:۔

"اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پائے جاتے ہیں جرنیلی بند و بست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔"

تباہی سے پہلے کی دہلی سماجی زندگی کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن اردو شاعروں نے دہلی کی تباہی پر جو نظمیں لکھی ہیں۔ وہ در اصل دہلی کے مرثیے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ دہلی کے مرثیے نہیں

ایک عہد کے مرثیے ہیں۔ ان نظموں اور مرثیوں سے غالب کے خطوط سے اور بعض عینی شاہدوں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ اس اجڑتی اور بستی نگری نے مغلیہ دور کے طویل عرصہ میں جمالیات اور کچھ حیاتی قدروں کو اس طرح نشو و نما دیا تھا اور سماجی زندگی میں کچھ ایسی شائستہ اور حسین روایات کو ترقی دی تھی کہ ان کی تباہی، زندگی کی تباہی، سماج کی تباہی اور حسین روایات کی تباہی تھی۔ چنانچہ میر نے دہلی کے بارے میں جو یہ کہا تھا۔

" دلی جو ایک شہر تھا، عالم میں انتخاب "

وہ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ دہلی کی اگلی بساط الٹ جانے پر، سب ہی نوحہ خواں تھے۔

دہلی کی تباہی پر جتنی نظمیں اور جتنی اچھی اچھی نظمیں لکھی گئیں اور اردو کے جتنے بڑے بڑے شاعروں نے نظمیں لکھیں، اتنی نظمیں، شاید ہی کسی ایک شہر کی تباہی پر کبھی لکھی گئی ہوں گی۔ یہ صحیح ہے کہ یہ جاگیرداری عہد کے ختم کا ماتم تھا۔ اور اگلی روایات کے ختم ہونے کا ماتم تھا۔ لیکن یہ بھی غلط نہیں ہے کہ یہ قومی عزت ووقار اور علم وفضل کا بھی ماتم ہے۔

مفتی صدرالدین خاں آزردہ نے دہلی کی تباہی پر ایک مسدس لکھا تھا جس کا ایک بند ہے سہ

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوش جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے، جی ہی پہ بن جاتی ہے
مصطفےٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم صہبائی ہو

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ جو جہانگیر آباد کے رئیس اور اردو فارسی کے بڑے بالغ نظر شاعر تھے بغاوت کے الزام میں قید کر دیئے گئے تھے اور ان کی ساری جائداد ضبط کر لی گئی تھی مولانا امام بخش صہبائی اور ان کے خاندان کے تمام افراد کو بغاوت کے الزام میں گولی مار دی گئی تھی۔

داغ نے اسی موقع پر جو مسدس لکھا تھا۔ اس کا پہلا بند حسب ذیل ہے :۔

فلک زمین و ملائک آب تھی دلی
بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دلی
جواب کاہے کو تھا، لاجواب تھی دلی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلی

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اُسے کھا گئی نظر کس کی

حالی کے دل پر دلی کی تباہی کا صدمہ اتنا گہرا تھا کہ انھوں نے ایک غزل نما مرثیہ میں کہا تھا ؎

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

حالی کے معاصر شبلی کا سیاسی شعور بہت بیدار تھا۔ چنانچہ ان کے سیاسی رجحانات نے ان کی زندگی کے آخری ایام میں ان کی جدوجہد کا ایک مخصوص لائحہ عمل مرتب کیا تھا۔ سرسید سے انھیں اختلاف ہو گیا تھا، اور علی گڑھ سے بھی انھوں نے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا۔ شبلی اُردو میں ایجیٹیشن کی شاعری کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے "مسلم گزٹ" اور چند دوسرے اخبارات میں مضامین بھی لکھے تھے۔ ایک مضمون میں جو ۱۹۱۲ء میں شبلی نے مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ پر لکھا تھا۔ کہتے ہیں :-

"ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے اور خود اپنے تئیں انگلش ملٹری ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور اگر ہم سلف رسپکٹ کا کچھ بھی اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھانا چاہیئے کہ بلا شبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار

ہے مگر لوگوں کی دلوں پر نہیں"

شبلی نے بہت سی جوشیلی نظمیں بھی لکھی تھیں۔ ان کی ایک نظم کا عنوان تھا "آپ ظالم نہیں زنہار یہ مظلوم ہیں"۔ اس نظم کے کچھ شعر یہ ہیں ؎

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا نہ اب ہے انکار
کہ ہر ایک شہر میں ہے آپ کے انصاف کی دھوم
آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سر مو
فیر کا حکم دیا آپ نے جب بہرہ ہجوم
یہ حقیقت بھی مگر قابل انکار نہیں
کہ بیک چشم زدن ہوتا گر نقصان عموم
واقعہ یہ ہے غرض کوئی نہ مانے نہ سہی
آپ ظالم نہیں زنہار، یہ ہم ہیں مظلوم

آزادی کی تحریک کو اردو اخبارات سے بھی بڑی تقویت ملی چنانچہ اردو کے اولین اخبار، جیسے کہ "دہلی اردو اخبار" اس تحریک میں بہت پیش پیش تھے۔ چنانچہ "اردو اخبار" وغیرہ کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر کو بغاوت کے الزام میں سولی دے دی گئی۔

آزادی کی جدوجہد میں "اودھ پنچ" کی خدمات بھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔ یہ اخبار ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین بہت حریت پسند انسان تھے پہلے پہلے اس اخبار

کے پیش نظر ان مذموم سماجی حالات کا مضحکہ اڑانا تھا جو مغرب کی تقلید میں ہماری قوم میں رائج ہونے لگے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے منشی صاحب نے اور اخبار کے دوسرے لکھنے والوں نے مزاحیہ اور طنزیہ انداز کو آڑ بنایا تھا۔ منشی صاحب کے اطراف کئی اچھے اچھے طنز نگار جمع ہو گئے تھے۔ ان میں اکبرالہ آبادی سرفہرست ہیں۔ اکبر کے علاوہ منشی جوالا پرشاد برق، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، سید محمد حسین آزاد، برج نرائن چکبست وغیرہ اس اخبار کے قابل اہل قلم میں سے تھے۔ اکبر سرکاری ملازمت میں تھے لیکن کبھی کبھی اطراف کے حالات سے وہ ایسے تنگ آجاتے تھے کہ وہ بھی استبداد کے خلاف آواز اٹھانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ انہوں نے " انقلاب " کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی، جس میں استعارہ کی آڑ لے کر کہتے ہیں سے

بدگمانی تری قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی
بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
آتی آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

" اودھ پنچ " کے لکھنے والوں کی جدوجہد کے باعث، اردو میں اسی، تعلیمی، اور سماجی مسائل پر کافی وسیع ادب پیدا ہو گیا ہے منشی سجاد حسین خود ایک اچھے انشاء پرداز تھے۔ وہ " کھلا خط، سربستہ مضامین " کے عنوان سے لکھا کرتے تھے اور حکومت کے ذیلی اداروں پر بڑی جرأت سے تنقید کیا کرتے تھے بنام ملکہ وکٹوریہ

قیصر ہند" انھوں نے جو خط شائع کیا تھا، اس کی ایک مختصر سا اقتباس حسب ذیل ہے:

"سکندر حشم، دامت ظلہا، میں نے اپنے پہلے خط میں دوسرے کا وعدہ کیا تھا۔ اسی جہت سے اگرچہ مجھے ساری دنیا کے تکھیڑوں اور تم کو اپنی پارلیمنٹ کے جھگڑوں، وزراء کے استعفیٰ سے مہلت کم ہے مگر ایفائے وعدہ کرتا ہوں۔"

"مثل مشہور ہے۔ آپ کاج مہا کاج۔ تمہاری قوم بڑی خود غرض ہے۔ اور خود مطلب ہے۔ سے تو چاہتی ہے کہ خدمت لے، مگر تمہاری خدمت پر توں: چرا کرتی ہے۔ بس ایک نصیحت آخری تم کو کرتا ہوں اگر اس پر عمل کیا، تمہارا ہی فائدہ ہوگا ورنہ گلیڈسٹن کی طرح اس کان سے سنا اس کان سے اڑا دیا۔ تم جانو تمہارا کام جانے۔"

"اودھ پنچ" کے ایک اور لکھنے والے پنڈت برج نرائن چکبست تھے۔ جو بہ حیثیت ایک شاعر اور ایک انشا پرداز کے بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے علمی اور تنقیدی مضامین "مضامین چکبست" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "صبح وطن" بھی کئی حیثیتوں سے ممتاز ہے۔ چکبست کا دل وطنی اور ملی جذبات سے

معمور تھا، ان کی غزل میں اور غزل کے علاوہ نظموں میں بھی وطنی اور قومی جذبات پھوٹ پڑتے ہیں۔ چکبست کی شاعری کے محرکات میں حب وطن، وطنی تاریخ، وطنی مناظر، اور عقائد کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور یہ رجحانات نئے عہد میں ہماری شاعری میں بہت نمایاں ہوگئے تھے۔ چکبست اپنی ایک غزل میں آزادی کے سلب ہونے کا دکھڑا اس طرح سناتے ہیں ؎

رہے آج کل کی ہوا میں وفا کی بربادی
سنے جو کوئی تو سارا چمن ہے فریادی
قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی
اڑا ہے باغ سے بو ہو کے رنگ آزادی
ہوائے شوق سے غنچے بکس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

چکبست نے "رامائن" کے کچھ کھنڈروں کا ترجمہ بھی اردو میں مسدس کی شکل میں کیا ہے۔ اس نظم میں ان کا انداز میر انیس کا سا ہے۔ مناظر پر بھی ان کی بعض نظمیں پاکیزہ اردو مرقعوں کے نمونے ہیں۔

چکبست اچھے انشا پرداز بھی تھے۔ ان کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک شگفتہ اسلوب کے مالک تھے۔ اگر ان کا انتقال کم عمری میں نہ ہو گیا ہوتا تو بڑے پائدار کارناموں کی فہرست

اُن سے توقع ہو سکتی تھی۔

چکبست کے انداز کے ایک اور شاعر سرور جہاں آبادی تھے۔ سرور نے بھی قومی احساس کو ابھارنے میں اپنی فکر اور اپنے فن سے مدد لی۔ ان کا دل بھی قومی اور وطنی جذبات سے مملو تھا۔ اور کچھ نظمیں انھوں نے بھی قومی اور وطنی موضوعات پر لکھی ہیں۔

آزادی کی جد و جہد میں جن اخباروں نے حصہ لیا، ان میں "الہلال" اور "البلاغ" کا مقام سب سے اونچا ہے۔ اس کے مدیر، مولانا ابو الکلام آزاد، ایک صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔ "الہلال" میں مولانا کے جو مضامین چھپے ہیں وہ اُن کی فکر اور ان کے اسلوب دونوں لحاظ سے اونچے درجے کا ادب ہے۔ مولانا نے اور بھی کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ لیکن ملی زندگی میں جو ہلچل اُن کے "الہلال" کے مضامین نے پیدا کر دی تھی، وہ کسی اور تحریر سے نہیں ہو سکی۔ مولانا کانگریس کے آدرش سے متفق تھے۔ اور انہیں آگے بڑھانے کے لئے انہوں نے سعی بلیغ کی۔

مولانا محمد علی اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی بھی آزادی کی جنگ کے سپاہی تھے۔ محمد علی بڑے اچھے شاعر اور انشاء پرداز تھے۔ جس طرح اُن کے مضامین میں خلوص، جذبات اور سادگی زبان کی بدولت ممتاز ہیں اسی طرح اُن کی شاعری میں بھی خصوصیات جھلکتی ہیں۔ مولانا محمد علی کی تحریروں میں ایک پرکار سادگی ہوتی ہے۔

ایک دفعہ وائسرائے کی مجلس قانون ساز کی عمارت کے افتتاح کا دعوت نامہ انہیں وصول ہوا تھا، اس بارے میں لکھتے ہیں:۔

"تارک موالات ہوں، حکومت کی بے وفائی پر وفاداری کا حلف نہ اٹھانے کا حلف اٹھا چکا ہوں اسمبلی اور کاونسلوں کی جنگ زرگری کو شاعری سے زیادہ بے کار سمجھتا ہوں مگر ملک و ملت کی خبرگیری نے خبر رسانی کو میرا پیشہ بنا دیا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی اسمبلی کے اجلاس میں جا کر "کامریڈ" کے ذریعے اسمبلی والوں کی خبر لیا کرتا تھا مگر سال بھر سے وہ سلسلہ بھی بند تھا۔ البتہ ہمدرد نے مجبور کیا کہ اس افتتاحی جلسے میں شریک ہوں!"

محمد علی کا کلام پڑھتے ہوئے ان کے خلوص کے علاوہ ایک والہانہ جوش کا بھی احساس ہوتا ہے۔ وہ بڑے نڈر انسان تھے۔ اُن کی ایک غزل نما نظم کا پہلا شعر ہے

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوس زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

اس کا مقطع ہے

نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر
کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

مولانا محمد علی کے علاوہ لالہ لاجپت رائے نے اپنے مضامین کے ذریعے سے اور حسرت موہانی اور ظفر علی خاں نے اپنی شاعری اور نثر دونوں کے ذریعے آزادی کی چنگاری کو ہوا دے کر بھڑکانے کی امکان بھر کوششیں کیں۔ اردو کے اہل صحافت میں دیانرائن نگم مدیر "زمانہ" اچھے ادیب اور سنجیدہ انشاء پرداز تھے وہ کانگریس کے آدرش سے ہمدردی رکھتے تھے۔ چنانچہ جب انہیں موقع ہاتھ آتا "زمانہ" کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

پریم چند جو ناول اور مختصر قصہ نگار کی حیثیت سے اردو میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ کانگریس اور مہاتما گاندھی کے نصب العین کا پرچار کرنے میں اپنے دل و دماغ کی قوتوں سے بہت شائستہ انداز میں کام لیتے رہے۔ انہوں نے ابتدا میں اپنی پانچ کہانیوں کا جو مجموعہ "سوز وطن" شائع کیا تھا۔ ان کہانیوں کو گورنمنٹ نے بغاوت کی آگ کو ہوا دینے والا ادب قرار دیا۔ اور اس کی ساری کاپیاں ضبط کر لیں۔

پریم چند نے دس بارہ ناول لکھے اور سینکڑوں کہانیاں قلمبند کیں۔ ان کی ساری تصانیف بلند ادبی مرتبہ رکھتی ہیں ان تصانیف کے ذریعے انہوں نے ملک میں سیاسی بیداری پھیلانے کی کوشش کی اور سماجی اصلاح کی ضرورت کی طرف لوگوں کی توجہ منعطف کرائی۔ لیکن یہ سارا کام انہوں نے اس خوش اسلوبی سے اور

فنکارانہ انداز میں انجام دیا کہ پڑھنے والے کو اس کا احساس نہیں ہوتا اور وہ ان کے خیالات سے متاثر ہوتا جاتا ہے۔ ہندوستان کے دیہاتیوں کی زندگی کی حسین اور موثر تصویریں کھینچنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے اس سلسلے میں ان کا ناول "گودان" ان کا شاہکار سمجھا جاتا ہے پریم چند کو آنے والے صنعتی انقلاب کا اچھا احساس تھا۔ وہ طبقاتی کشمکش کے بڑھتے ہوئے آثار کو بھی دیکھ رہے تھے اور اس سے ملک کو خبردار کرنے کی کوشش کی۔

پریم چند کے کردار ہمارے جانے بوجھے انسان ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنے آپ کو ان کے غم درنج میں اور ان کی دلچسپیوں میں شریک پاتے ہیں۔ ناول کو ختم کرنے کے بعد بھی وہ حقیقی افراد کے طور پر، جن سے ہم زندگی میں مل چکے ہیں، ہمارے ذہنوں میں محفوظ رہ جاتے ہیں۔

بھارت کی تاریخ میں یاس انگیزی کا یہ دور عالمی اہمیت کے ادبی کارناموں کے لئے بہت زیادہ سازگار نہیں تھا۔ تاہم قومی ادبار کے اس دور میں بھی ان سخن سنجوں اور ادیبوں سے ہٹ کر جن کے کارناموں سے ماحول کے ناسا عد حالات کے خلاف کشمکش کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ کئی ایسے شاعر اور ادیب بھی منظر عام پر آئے جنہیں براہ راست اس کشمکش سے واسطہ نہیں دکھائی دیتا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد کی جدوجہد سے

بے تعلق رہ کر، اپنے روایتی انداز میں شعر و ادب کی دلچسپیوں میں محو رہے۔ بظاہر ان کے افکار اور انداز سے ماحول سے فرار کے تصورات قائم ہوتے ہیں۔ لیکن جب ہم ذرا گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو یہ بات سجھائی دیتی ہے کہ اکثر شاعر جو غزل کی شاعری کی روایتی قنوطیت میں پناہ لے رہے تھے وہ ماحول سے سرے سے بیگانہ نہیں تھے۔ بلکہ انھوں نے سخن کو اپنے احساسات کا پردہ بنایا تھا اور غم جاناں کو پھیلا کر غم دوراں بنا لیا تھا۔ انہوں نے روایتی استعارہ اور کنایہ میں اپنے جذبات کو ملبوس کر کے پیش کیا ہے۔

میر کا یہ شعر اس رمز کو ظاہر کرتا ہے ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ، کہ صاحب میں نے
رنج و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

شاعروں میں فانیؔ، اصغرؔ، جگرؔ، اثرؔ، عزیزؔ اور صفیؔ، غزل کی روایات پر قائم رہے۔ لیکن ان کی غزل میں اپنے عہد کی فکر و فن کی ترقی کے اثرات چھن کر پہنچے ہیں۔ محسنؔ کاکوروی اور نیرؔ شکوہ آبادی نے نعتیہ شاعری میں اپنے حرماں کی تسلی ڈھونڈلی تھی۔

نیازؔ فتحپوری اور سجاد حیدر یلدرم اردو ادب میں نئی رومانیت کے پیش رو ہیں۔ نیازؔ نے اپنے ناولٹ "شہاب کی سرگزشت" اور

اپنے افسانوں اور تنقیدی مضامین کے ذریعے، اور سجاد حیدر یلدرم نے اپنی کہانیوں اور انشائیوں کے ذریعے نوجوان نسلوں کے ذہنوں سے اخلاقی اور مذہبی عقیدہ پرستی کے اثر کو دور کرنے کی سعی کی سر عبدالقادر اردو کے سنجیدہ صحافیوں میں تھے، جنہوں نے اپنے رسالے "مخزن" کے ذریعے سے نئے علوم کی روشنی کو ملک میں پھیلانے میں بڑی مدد دی۔ وہ اچھے انشائیہ نگار بھی تھے مولوی عبدالحق اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے بہ حیثیت نقاد اور محقق کے سنجیدہ ادبی رجحانات کو آگے بڑھایا۔ یہ دونوں صاحب طرز انشاء پرداز بھی ہیں۔

سید احمد دہلوی، اس عہد کے سب سے بڑے لغت نگار ہیں۔ جن کی "فرہنگ آصفیہ" آج بھی حوالے کی کتاب بنی ہوئی ہے۔ ناصر نذیر فراق، صاحب طرز انشاء پرداز تھے، جن کے انشائیے اور افسانے دراصل دہلی مرحوم کے گرد گھومتے ہیں۔ اور اسی رجحان کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو داغ، حالی وغیرہ کی شاعری میں ظاہر ہوتے ہیں اس اس گھٹے گھٹے ماحول سے کچھ ایسے ادارے بھی نمودار ہوئے جن کی خدمات اردو زبان اور ادب کی ترقی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں جامعہ عثمانیہ اور اس کے دار الترجمہ، انجمن ترقی اردو اور دار المصنفین کی مساعی نے اردو کے علمی پایہ کو بہت مستحکم کیا۔

یہ عہد بلاشبہ تحریکوں کا عہد تھا۔ اور ہمہ گیر تحریکیں ہر سو اٹھ رہی

تھیں۔ انہیں میں سے ایک تحریک خلافت کی بھی تھی۔ جس کا مقصد ترک خلیفہ کی حیثیت کو قائم رکھنا اور اس کے لئے جدوجہد کرنا تھا۔ خلافت کی تحریک کے علمبرداروں میں اور کانگریس کے لیڈروں میں ایک سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے یہ دونوں گروہ آزادی وطن کے لئے ایک ساتھ مل کر کام کرنے لگے تھے خلافت کی تحریک کے سلسلے میں جب انگریزوں کے رویے سے مایوسی ہوئی، تو ہندوستان کے کئی مسلمان خاندان ترک وطن کرکے بخارا، سمرقند، تاشقند اور دوسرے مسلم علاقوں میں ہجرت کر جانے کے خیال سے چلے گئے تھے یہ مقامات اشتراکی روس کے اثر میں آ چکے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان ملکوں کی حکومتوں کے غیر دوستانہ برتاؤ کی وجہ سے وہ ہندوستان واپس لوٹنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن لوٹتے ہوئے اشتراکی تصورات کی سوغات بھی اپنے ساتھ لائے۔ روس کے عوامی انقلاب کی داستانیں بھی ادیبوں کے سامنے تھیں۔ اور یہ ربط ہمارے لکھنے والوں کا نیا نیا قائم ہوا تھا۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد یہ لوگ اشتراکی نظام کے پرچار کا ذریعہ بن گئے۔ حسرت موہانی اور ظفر علی خاں اشتراکی خیالات کا استقبال کرنے والوں میں سب سے آگے تھے۔

حسرت موہانی غزل کے سربرآوردہ شاعر تھے لیکن ان کی غزل اپنے عہد کی نظمیہ شاعری کے ارتقا اور اس کے ارتسامات سے پوری طرح متاثر تھی۔ چنانچہ انہوں نے غزل کو بھی اس کے ہاتھی دانت

کے برج سے نیچے اتار کر عملی زندگی کی کشمکش کے میدان میں لانے کی کوشش کی۔ اس سے اردو غزل نے حیات نو پائی۔ اور نظم کی مدمقابل بن کر نمودار ہوئی۔

حسرت موہانی نے سوویٹ نظام کو عربی "سوویت" یعنی مساوات سے متعلق کرلیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے بارے میں لکھا تھا۔

ہدایت کا زمانہ تشنہ تھا، اہل سوویت نے
دکھائی سب کو راہ حریت بے خوف دیں ہوکر

اردو شاعروں نے آزادی کی جدوجہد میں حالات کی سست رفتاری سے بے صبر ہورہے تھے، اشتراکیت کو بھی اس جنگ میں جھونکنے کی کوشش کی اور اس ذریعے سے مزدوروں اور فاقہ کش عوام کے جذبات کو مشتعل کرنا چاہا۔ ظفر علی خاں نے اپنی ایک نظم میں انقلاب کی آمد آمد کا گیت اس طرح گایا تھا ؎

آرہی ہے باغ گیتی میں ہوائے انقلاب
کھپ گیا آنکھوں میں رنگ لالہ زار انقلاب
قالب مشرق میں پھونکی جارہی ہے روح نو
نغمہ ہائے قم سے معمور تار انقلاب
جان استعمار کھینچی جارہی ہے ہند میں
کس بلا کا روح فرسا ہے فشار انقلاب

وہ لاہور میں روس کے آنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ لکھتے ہیں:-

آ پہنچا لاہور میں روس ۔۔۔ شملہ کی چھاتی کا کابوس

ہیں یہی لینن کے درباں ۔۔۔ پیٹ کے بھوکے آ پہنچے

آ پہنچے کبھی آ پہنچے ۔۔۔ پیٹ کے بھوکے آ پہنچے

جوش در اصل رومانی شاعر تھے، اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے جلد محب وطن گروہ میں شامل ہوگئے۔ انقلاب کا نعرہ انہوں نے جس زور سے بلند کیا اردو کے کسی اور شاعر نے نہیں کیا۔ انھوں نے بہت سی ہل چل پیدا کر دینے والی نظمیں بھی لکھیں اور یہ ان کی قابل قدر نظمیں ہیں۔ یہ عجیب اور متضادیات معلوم ہوتی ہے کہ اقبال، جو مسلمانوں کے شاعر سمجھے جاتے ہیں، قومی اور وطنی شاعروں میں نہ صرف سب سے آگے ہیں بلکہ انھوں نے بھارت، اس کے حسین مناظر اور اس کے مشاہیر پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ نہ صرف اردو میں بلکہ دنیا کے قومی اور وطنی ادب میں بلند تر رتبہ رکھتی ہیں۔ وہ اس معنی میں مسلمانوں کے شاعر ہیں کہ وہ مسلمان تھے اور اسلام سماجی مساوات اور وحدانیت اور رسالت پر عقیدہ رکھتے تھے۔ حقیقت میں وہ شاعر ملت تھے، اور پھر شاعر انسانیت کے روپ میں ہمارے سامنے آئے۔ اردو شاعروں میں اقبال کو یہ بے مثل مقام حاصل ہے کہ انہوں نے قومی اور وطنی شاعری کو عقیدت مندی یا نشریہ کے درجے

اٹھاکر، بلند ترین ادبی معیار تک پہنچایا۔

اقبال کی نظمیں "ہمالہ" "تصویر درد" "صدائے درد" "نیا شوالہ" وغیرہ حب وطن اور قومی درد کے جذبات سے مملو ہیں۔

اقبال کی شاعرانہ زندگی، بعض وقت ان کے بعد کے تصورات اور خیالات کی بنا پر دو پارہ سمجھی جاتی ہے اور ان کی بعد کی شاعری، ان کے افکار کا تناقص بتائی جاتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی شاعری کے ابتدائی دور اور آخری ادوار میں ارتقائی رشتہ موجود ہے۔ ان کے تصورات، قومی اور وطنی سطح سے بلند ہو کر بعد میں انسانیت کی سطح تک پہنچ گئے تھے اور وہ سارے مبتلائے آفت انسانوں کے ساتھ ہمدردی کرنے لگے تھے۔ وہ دنیا میں جغرافیائی، نسلی، قومی کشاکش سے نجات اور انسانوں کی بھلائی اس اسلامی نظام میں پاتے تھے۔ جو ایک عالمی برادری تھی، اور جس میں رنگ، نسل، وطن کی بنا پر کوئی افتراق پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

اقبال نے اپنی فکر بلیغ کے ذریعے اردو شاعری میں فلسفیانہ تعمق اور روحانی بالیدگی بھی پیدا کی۔ انہوں نے سب سے پہلے ادب اور زندگی کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو بھی جوڑا، اور شعر و فنکاری میں شاعر اور فن کار کے خلوص پر بھی بہت زور دیا۔ اقبال کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ہم کو زیک نئے

انسان اور عظیم انسان کا تصور دیا۔

اردو کے شاعروں میں اقبال نے اپنی نظم "خضر راہ" میں سب سے پہلے غریب دہقانوں اور مزدوروں کے درد کو اپنا کر پیش کیا ہے۔ چنانچہ اس نظم کا مشہور شعر ہے ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اردو میں وطنی نظموں کا جو سرمایہ فراہم ہو چکا ہے، اس میں غالباً اقبال کی نظم "ترانہ ہندی" کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ یہ نظم اس برصغیر میں سارے وطن دوستوں کی جان بنی رہی ہے اور عرصہ تک قومی ترانے کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔ اقبال کا تعلق اگر پاکستان کی تحریک سے نہ ہو گیا ہوتا، تو شاید یہی نظم قومی ترانے کے طور پر اختیار کیا جاتا۔ اس نظم کے کچھ اشعار ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا
یونان، مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشان ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
اقبالؔ، کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

شکست اور تعمیر نو

بھارت کی سیاسی، سماجی اور شعوری زندگی، اس صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے تک اس منزل پر پہنچ چکی تھی کہ جہاں سے کئی نئی راہیں پھوٹ رہی تھیں ایک طرف بیرونی دنیا سے وسیع تر تعلقات کی وجہ سے، ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنی افق میں توسیع ہو چکی تھی اور کچھ تو ان کے براہ راست یا بالواسطہ اثر سے اور کچھ زمانے کے اقتضا سے عوام کی ذہنی فضا میں بھی وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ دوسری طرف حیات کی تیز رفتاری نے دور دراز ملکوں کو قریب تر لا کر بھارت کے شعور کو بھی بہت سے نئے نئے مسائل سے روبرو کھڑا کر دیا تھا۔

پہلی جنگ عظیم نے یورپ کے لئے اور یورپ سے دنیا

نزدیک کسی طرح کا بھی تعلق رکھنے والے ملکوں کے لئے نئے نئے سیاسی سماجی اور معاشی مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ جن نئے مسائل سے یورپ کی قومیں دوچار تھیں وہ عالمی مسائل بھی تھے کیونکہ آمد و رفت کی سہولتوں میں جو اضافہ اس زمانہ میں ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے دنیا کے دور دراز ملک بھی ایک دوسرے سے قریب آ گئے تھے جنگ سے پہلے بھی مختلف ملک۔ اپنی گوناگوں ضروریات کے لئے ایک دوسرے پر منحصر ہوتے جا رہے تھے۔ انحصار کے اسی احساس نے بین قومی تنظیم کے تصورات کو نشو و نما دیا تھا، جس کا نتیجہ لیگ آف نیشنز کے قیام کی سعی ناکام تھی۔ جنگِ عظیم کے بعد مختلف ملکوں میں ربط کے مواقع اور ضرورتیں اور بھی بڑھ گئیں۔

جنگِ عظیم نے جو مسائل پیدا کئے تھے۔ ان میں ملکوں کی معاشی حالت میں توازن پیدا کرنے کا سوال بہت اہم تھا۔ اس مسئلے کی حد تک، جنگ میں جیتنے والی اور ہارنے والی قومیں دونوں ہی برابر تھیں کیونکہ مثل مشہور ہے" جنگ میں جو جیتا وہ ہارا اور جو ہارا وہ مرا"۔ اسی معاشی ابتری کو دور کرنے کے لئے مختلف ملک نئے نئے تجربے کرنے پر مائل ہوئے اور اہل فکر نئے نئے نظریوں کو نشو و نما دینے لگے۔

ان نظریوں میں کچھ تو فاستی قسم کے تھے اور کچھ اشتراکی انہیں آدرشوں کو حاصل کرنے اور اپنی اپنی اقتصادی باز تعمیر کے لئے

یورپ کے مختلف ملکوں، جیسے اٹلی، جرمنی اور روس میں انقلاب برپا ہوئے اور عرصہ تک زندگی اتھل پتھل رہی فاستی تصورات جمہوریت پسند قوموں کے لئے بہت ہی ناخوشگوار تھے۔ اس کے مقابلے میں کئی قوموں کو اشتراکی تصورات میں نجات کی صورت نظر آ رہی تھی۔ دنیا کی ساری جمہوریت پسند قوموں نے اور قوموں کے افراد نے فاستی تصورات کی سختی سے مخالفت کی اور اس مخالفت میں مختلف ملکوں کے مفکروں کے ساتھ ادیب اور شاعر بھی شریک تھے۔ ان کے افکار کا اثر ہندوستان پر بھی پڑنے لگا تھا۔

ان عالمی تحریکات کے پس منظر میں بھارت اپنے خاص مسائل کے ساتھ کشمکش میں داخل ہوا۔ آزادی کے حاصل کرنے کے لئے بھارت میں جو ہل چل جاری تھی اس میں نئے حالات کی وجہ سے ایک نیا موڑ آیا۔ اور وہ یہ کہ آزادی کی جدوجہد کا مقصد صرف سیاسی آزادی نہیں رہا، بلکہ اس میں معاشی اور سماجی مسائل بھی شامل ہو گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام جو اس سے پہلے آزادی کی جدوجہد سے صرف ذہنی تعلق رکھتے تھے، اب اس میں عملی دلچسپی لینے کے لئے تیار ہو گئے اور یہ تحریک پھیلنے لگی۔

بھارت کے اس نئے سیاسی اور سماجی ماحول میں ا۔ اس کے لکھنے والوں کے اس وسیع تر ذہنی اور بعض عورتوں میں طبعی ربط ضبط کی

وجہ سے، زندگی کے ہر شعبے میں نئے نظریئے رجحانات ابھرنے لگے، جن سے بھارت میں ذہنی انقلاب پیدا ہونے لگا۔ ذہنی انقلاب کے ہر دور میں زندگی اور زندگی کے سارے شعبوں میں شکست و ریخت اور تعمیر نو کا جذبہ ابھرتا رہا ہے۔ چنانچہ اردو کے ادیبوں میں بھی یہ جذبہ ابھرا نئے ذہن اور مادی ماحول سے توافق پیدا کرنے کے لئے ادب اور اس کے سارے مسائل کی نئے سرے سے چھان بین ہونے لگی۔ اور ادب اور ادبی مسائل نئے .... پہلو اور نظریئے سامنے آنے لگے، ہمارے پرانے ادیب اور شاعر، ادب کو ذہنی مسرت زائی کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور ان کے آگے ادب کے جائزے کے وہ معیار نہیں تھے جو جدید یورپ سے قریب تر ربط کے باعث سامنے آنے لگے۔

یورپ کی ادبی تاریخ میں، ابتدا سے لے کر، اب تک ادب کے بارے میں بہت سے خیالات پیدا ہوتے اور نظریئے بنتے رہے تھے اور یہ نظریئے کم و بیش سارے یورپی ملکوں میں پھیلتے گئے وہاں بھی ایک عرصہ تک ادب کے بارے میں یہ تصور رہا کہ وہ ذہنی حظ اور مسرت زائی کا ایک وسیلہ ہے۔ اس نظریئے کو ادب برائے ادب کا نظریہ کہا جاتا ہے لیکن زندگی کی ہمہ گیری، اس کے شیونات اور اس کے ہر جہتی دباؤ سے واقفیت بڑھنے کے بعد، ادب اور زندگی میں رشتے یا رشتوں کی تلاش ہونے لگی تھی اور ان رشتوں کے نئے نئے گوشے چھان بین کی زد میں آنے لگے تھے۔ چنانچہ ادب کے نئے نئے نظریئے جو مختلف

زبانوں میں نشو ونما پاتے رہے جن کی تفسیریں حقیقت (ریئیلزم) فطرت (نیچرلزم) تصوریت (آئڈیلزم) تاثریت یا ارتسامیت (امپریشنزم) اظہاریت (اکسپریشنزم) تمثالیت (امیجیزم) رمزیت یا اشاریت (سمبولزم) وغیرہ ہیں۔ ان نظریوں کی پرچھائیں ہمارے عہد کے اردو ادب پر بھی دکھائی دیتی ہیں۔

حقیقت یا حقیقت نگاری کی ایک ہمہ گیر تحریک یورپ میں انیسویں صدی کے وسط سے اٹھنے لگی تھی۔ اس سے پہلے یورپی ادب پر کلاسکیت کا اثر چھایا ہوا تھا۔ کلاسکیت میں پرانے یونانی اور لاطینی شاہکاروں کو معیار مانا جاتا تھا۔ اور فنی کارناموں میں توازن اور حدود کو ملحوظ رکھنے پر زور دیا جاتا تھا توازن اور حدود کی نگہداشت معنوی اور لفظی یا صوری ہر لحاظ سے ضروری تصور کی جاتی تھی۔

لیکن جب یورپ کے لکھنے والوں کی طبیعتیں ان قیود سے اکتا گئیں، تو وہاں رومانیت کی تحریک اٹھی، یہ تحریک جو کلاسکیت کے خلاف اٹھی تھی۔ اس کا مطمح نظر یہ تھا کہ عقلی قوانین اور ضابطوں سے فن اور ادب کو آزاد کیا جائے اور جذبات کی گوناگونی اور ان کی ہنگامہ آرائی کے اظہار کے موقع بہر صورت فراہم کئے جائیں۔

رومانیت کی تحریک نے بڑا گہرا اثر یورپ کے ادب پر ڈالا اور یہ اثر ادب سے آسانی سے محو نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم انیسویں صدی کے وسط سے یورپی ادب میں حقیقت یا حقیقت نگاری کی وہ تحریک اٹھی جو بہت جلد سارے یورپ میں پھیل گئی اور فنی اور ادبی کارناموں کا معیار بن گئی۔ کچھ ادبی تحریکیں جو بعد میں مختلف نظریوں کے لیے اٹھیں، وہ بھی دراصل حقیقت یا حقیقت نگاری کے شاخسانے تھے۔

چنانچہ انہیں تحریکوں میں سے ایک تحریک فطرت یا فطرت نگاری کی تحریک تھی جو حقیقت نگاری کو منتہا تک پہنچانے کے خیال کی علمبردار تھی۔ اس میں عالم خارجی کی حقیقتوں کے علاوہ عالم داخلی کی حقیقتیں بھی آ جاتی ہیں اس تحریک کے موئد ادبی کارناموں میں تخیل کی رنگ آمیزی سے بچنے اور تجربوں کو ان کی ابتدائی اور اصلی شکل میں پیش کرنے زور دیتے ہیں تاکہ یہ محسوس ہو کہ تجربات بلا واسطہ واردات کی حیثیت سے پیش ہوتے ہیں۔

حقیقت ہی کی ایک اور شکل ارتسامیت یا تاثریت ہے اس کا منشا یہ ہے کہ حقیقت کے جو نقوش ہمارے ذہنوں پر مرتسم ہوں یا جو ہمارے تجربوں سے پیدا ہوں، انہیں بلا تصرف پیش کر دیا جائے۔ اظہاریت، اس کی ضد ہے۔ اس میں اظہار پر زور دیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کا موجد اطالیہ کا مشہور مفکر، کروچے تھا کے نزدیک

فن، وجدان ہی کے اظہار کا نام ہے۔ اس کے خیال کے مطابق وجدان اور اظہار ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو شکلیں: ظاہری اور باطنی ہیں۔ اسی لئے اظہار کا یہاں یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ فن کار اپنے وجدان کا اظہار بعینہٖ کر دے اور اس کی نگاہ اپنے تجربوں سے ہٹ کر نہ تو خارجی دنیا کے واقعات کی طرف جائے اور نہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کی طرف۔

اشاریت یا رمزیت کی تحریک کا ماحصل یہ ہے کہ فن کار اپنے فن کے ذریعے حقیقت کی عکاسی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا ہر ایک اظہار ایک رمز ایک اشارہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اظہار خود مقصود اصلی اور علت غائی نہیں بلکہ وہ حقیقت میں کسی دوسرے تجربے کی نشاندہی کرتا ہے اسی لئے ایسے شعرا جو صوفیانہ تجربات بیان کرتے ہیں، وہ خاص طور پر رمز یا اشارہ سے کام لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ رمزیت کے نظریہ کا بانی فرانسیسی مفکر ملارمے تھا۔

تمثالیت، ادب کا وہ نظریہ ہے جس میں تمثال کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اس نظریہ کے حامیوں کا خیال ہے کہ فن یا شاعری، حقیقت خارجی کی عکاسی نہیں کرتے بلکہ اس حقیقت سے جو تصورات یا تمثال پیدا ہوتے ہیں ان کی عکاسی کرتے ہیں۔

حقیقت کے ایک اور روپ پر بھی حالیہ دور میں زور دیا جاتا رہا ہے۔ جسے سُرریلیزم یا ماورا حقیقت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس نظریہ کے حامی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اظہار کے لئے کسی طرح کی قید و بند کو ملحوظ نہیں رکھنا چاہیئے۔ بلکہ حقیقت کو اس کے انتہائی حد تک پہنچا دینا چاہیئے اور حقیقت سے ماورا جو حقائق ہیں ان کی تلاش کی جانی چاہیئے اور انہیں گرفت میں لانا چاہیئے۔

ایک اور رجحان جس کا گہرا اثر اس زمانے لعبض لکھنے والوں پر نظر آتا ہے۔ وہ فرائڈ جنسی نظریہ اور نفسی تحلیل ہے۔

حقیقت یا حقیقت نگاری کی تحریک اردو ادب میں تنہا نہیں پیدا ہوئی بلکہ بہت سی انقلابی، سیاسی، سماجی اور معاشی تحریکوں کے ساتھ گتھم گتھا ہوکر ہمارے ادب اور شاعری میں نمودار ہوئی ایک طرف محبان وطن کی آزادی کی کشمکش، آزادی کی جو کھوٹ پر کھڑی نظر آرہی تھی، دوسری طرف آزادی کی تحریک سماجی اور اشتراکی تحریکوں کے ساتھ گتھ کر انقلاب کے لئے راہ ہموار کر رہی تھی۔

یہ ساری تحریکیں ایک دوسرے کے ساتھ شامل ہوکر ترقی پسند تحریک کی صورت میں نمایاں ہوئیں اور تقسیم ملک تک اس کا

گہرا اثر اُردو کے ادیبوں اور شاعروں پر رہا۔ اس کا اہم پہلو محنت کش عوام، کسان اور مزدور کی زندگی کو پیش منظر میں لانے کی کوششیں تھیں۔

آزادی اور تقسیم ملک کے کوئی دو قرن بعد یہ تحریک نئے اور نئی شاعری کی تحریک کے نتیجے میں پس منظر میں پڑ گئی۔ اور ادب کے لئے نئے اور غیر رسمی معیار تلاش کئے جا رہے ہیں۔

شاعری

حقیقت نگاری کی تحریک کے اثر میں نوجوان طبقے کے لکھنے والے بہت جلد آ گئے۔ کیونکہ ان کے ادبی شعور کی آنکھ نئی ہنگامہ خیز فضا میں کھلی تھی۔ ان کے علاوہ بہت سے پرانے لکھنے والے، ادیب اور شاعروں پر بھی یہ تحریک اثر انداز ہوئی۔

چنانچہ حسرت اور جوش جو اس زمانے کے سربرآوردہ شاعر ہیں، ان کے کلام پر بھی اس تحریک کا اثر نمایاں ہے۔ حسرت کے یہاں حقیقت نگاری کے رجحانات ان کی غزل کی رومانیت کے ساتھ شیر و شکر ہو کر ایک نئی رومانیت کی شکل میں جلوہ گر ہوئے جس سے ان کی غزل چمک اٹھی ہے۔ اور نئی سانس لینے لگی ہے۔ حسرت نے جلد ہی اشتراکی اثرات کو قبول کر لیا تھا۔ یہی حال ظفر علی خاں کا بھی تھا۔ اقبال کے شاعرانہ شعور نے ساری نئی تحریکوں کو اپنے

اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ اور یہ صحیح ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے انقلاب کا نعرہ لگایا تھا۔ لیکن ان کا انقلاب، ادب کا معنوی انقلاب تھا۔ وہ ان کی شاعری اور ان کے توسط سے عام طور پر اردو شاعری میں معنوی لحاظ سے انقلاب کا باعث ہوا۔ لیکن ہیئت کو چھوئے بغیر گذر گیا۔ پرانی اصناف میں ان کے نئے تصورات نے نئی جان ڈال دی۔ ان کی فکر کی گہرائی نے اردو شاعری میں زندگی کی حقیقتوں کو متلاطم کیا۔ اور ان کے جذبات کے خلوص نے ان کی شاعری کو آب و رنگ بخشا۔

جوش عام طور پر شاعر انقلاب کے لقب سے ملقب کئے جاتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر ہیں۔ لیکن جب حقیقت نگاری کے اثرات پھیلنے اور مستحکم ہونے لگے، تو وہ بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ ان کی طبیعت میں جو بے چینی تھی۔ اس کے باعث وہ جلد ہی اس تحریک میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ انقلاب پسند شاعروں کے امام کہلانے لگے۔

جوش کا تصور انقلاب کسی حد تک رومانیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ چنانچہ جب وہ انقلاب، انقلاب کے نعرے لگا کر دل دہلا دینا چاہتے ہیں۔ تو ان کا حسن بیان اور ان کے فنکارانہ رجحانات، ان کی انقلابی شاعری کو بھی پڑھنے اور لطف اندوز ہونے کے قابل چیز بنا دیتے ہیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس عہد میں شعر کی ہیئت اور

فنی لوازم کا جتنا لحاظ جوش کے یہاں نظر آتا ہے دوسروں کے یہاں کم دکھائی دیتا ہے۔

زبان اور بیان میں بھی رومانی شاعری کا سارا لطف وہ انقلابی شاعری میں صرف کر دیتے ہیں۔ جوش نے اپنی شاعری سے عوام اور خصوصاً محنت کش عوام اور کسانوں کی زندگی سے ہمدردی کے جذبات کو اکسانے کا بھی کام لیا۔ کسانوں کی حالت پر جوش نے بعض بڑی عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔

ان کی ایک نظم کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے، شام کے فریب کا منظر کھینچنے کے بعد وہ ایک کسان کی اہمیت اس طرح جتاتے ہیں ؎

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بوِ گلشن پناہ
نازپرور لہلہاتی کھیتوں کا بادشاہ
وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امید و بیم
محرمِ آثارِ باراں، واقفِ طبعِ نسیم
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تنِ انسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

جوشؔ اردو میں نئی رومانیت کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اس میں اخترؔ شیرانی بھی ان کے ساتھ شامل ہیں۔ لیکن دونوں کی دلچسپیوں میں بڑا فرق ہے۔ جوشؔ کی شاعری کے اہم موضوع سیاست اور انقلاب ہیں۔ لیکن اخترؔ شیرانی محض عشق و محبت کی وارداتیں بیان کرنے والے شاعر ہیں۔ اخترؔ کی شاعری میں زبان کی ایک نئی معنویت کا احساس نمایاں ہے۔ اخترؔ رہینِ عشق شاعر ہے۔ اور عشق و محبت کی قدر اس کے پاس زندگی کی دوسری ساری قدروں سے زیادہ ہے۔ اس کی نظموں نے اردو شاعری کو ایک نیا آہنگ اور ایک نیا شعور عطا کیا۔

اخترؔ کے علاوہ حفیظؔ جالندھری اور ساغرؔ نظامی بھی رومانی شاعر ہیں۔ ان دونوں نے آزادی کی کشمکش کے زمانے میں بڑی موثر نظمیں بھی لکھی تھیں۔

اسلامی تاریخ پر حفیظؔ کا "شاہ نامۂ اسلام" ایک طویل یادگار نظم ہے۔ جو کئی جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ حفیظؔ کا مخصوص میدان اردگرد کے دلکش موضوعات ہیں۔ منظر کشی ہیں۔ انہیں ان میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں رسیلی نظمیں لکھنے کے طریقے کو انہوں نے اردو میں بہت مقبول بنایا۔

فیضؔ احمد فیضؔ کو فطرت نے ایک ساعر ادل، ایک

سوچنے سمجھنے والا دماغ اور حسن گویائی کی ساری نعمتیں عطا کی ہیں اسی لئے وہ حقیقت نگار اور ترقی پسند شعراء میں سر بلند ملنے جاتے ہیں فیض کی شاعری میں انسانیت کی قدریں بہت اونچے مرتبہ پر دکھائی دیتی ہیں۔

ان کے کلام کے تین مجموعے "نقش فریادی"، "دست صبا" اور "زنداں نامہ" شائع ہو چکے ہیں۔

وہ حقیقت نگار شاعر ہیں۔ اور سماج، کسان اور مزدور، سب کی زندگی پر وہ حقیقت شناس نظر ڈالتے اور حقائق کو استعارے اور تشبیہ اور حسن بیان کے دلکش پیراہنوں میں ملبوس کر کے پیش کرتے ہیں۔

وہ پرگو شاعر نہیں ہیں۔ فیض کے کلام میں ایک جاذبیت ایک دل گدازی اور ایک شگفتگی ہے۔ فیض محب وطن اور محب انسانیت دونوں ہیں اور ان کی شاعری میں دونوں جذبے نمایاں ہیں۔

مفلوک الحال انسانوں اور ان کی جہالت اور بھوک کا خیال کر کے ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ فیض کی شاعری کسی مخصوص تکنیک کی پابند نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنی طبیعت کے بہاؤ کے اعتبار سے خیالات کے لباس میں کتر بیونت کر لیتے ہیں۔ ان کی ایک مختصر نظم کے دو شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ جن میں شگفتہ تشبیہوں

کی ندرت پڑھنے والے کے ذہن میں حسن تخیل کی ایک لہر دوڑا دیتی ہے اس کا عنوان "اشعار" ہے سہ

رات یوں دل میں تری سوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

رمزیہ انداز میں کہنے والے شاعروں میں مخدوم محی الدین بھی نمایاں ہیں۔ اپنے معاصر شعراء کی طرح مخدوم بھی سماج کی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں ہیں اور اس نظام کو زیر و زبر کر دینے کا ایک بے پناہ جذبہ ان کی نظموں میں پنہاں نظر آتا ہے۔ مخدوم کی نظموں کی نمایاں خصوصیت ان کے انداز گفتار کا ٹھنڈا پن ہے، جس کی تہ میں بے پایاں جوش کی رو میں چھپی رہتی ہیں۔ دوسری چیز ان کے اظہار کا ترنم ہے۔ جو ان کی نظم کے آہنگ کو بلند کر دیتا ہے۔ مخدوم کو اپنے اپنے مقصد کے ساتھ جو خلوص ہے وہ بھی ان کی نظموں سے جھلکتا ہے۔

رومانیت یا تاثریت کا پرتو مجاز، ساحر اور جذبی کے کلام میں اور کسی حد تک فیض کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے مجاز بنیادی طور پر ایک تغزل پسند شاعر تھے۔ ان کے تغزل کے انداز ان کی فکر کے ہر گوشے سے نمایاں ہیں۔ عشق و محبت کی وارداتیں وہ بہت کھل کر اور نئے نئے انداز میں سناتے ہیں۔ انقلاب کے جذبات سے

بھی ان کا دل ہوشیار رہتا تھا۔ آوارہ گرد انسانوں کی زندگی میں مجاز کے لیئے ایک دماغی کشش تھی۔ لیکن مجاز کی رومانیت میں ایک انقلاب پسندی بھی مضمر ہوتی ہے۔ زبان اور اسلوب کا رس ان کے فن میں گھل مل گیا ہے۔

مجاز کی طرح جذبی کی شاعری میں بھی تغزل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ان کے اور فراق کے یہاں غزل خود بھی اتنی تبدیل ہوجاتی ہے کہ بعض وقت نظم اور غزل کے درمیان خط فاصل کھینچنا مشکل ہوجاتا ہے۔ انقلاب پسندی میں جذبی بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمنوا ہیں، لیکن ان کے سُر مدھم ہیں۔ اس لیئے ان کی گفتار میں لذت کا احساس پیدا ہوجاتا۔

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، اس عہد میں غزل کے بڑے علمبرداروں میں سے ہیں۔ فراق کی غزل کی قدریں کلاسیکل غزل کے مقابلے میں بہت بدل ہوئی ہیں۔ وہ بھی عشق و محبت کی وارداتیں بیان کرتے ہیں۔ لیکن ان کا انداز فکر اور انداز گفتار مخصوص ہے۔

فراق نقاد بھی ہیں اور شاعر بھی، لیکن وہ شاعری میں نقاد کو گھسنے نہیں دیتے۔ اس کے برعکس کبھی کبھی تنقید میں شاعر گھس پڑتا ہے۔ فراق نے کچھ نظمیں اور کچھ رباعیاں بھی لکھی ہیں لیکن تغزل کا

رنگ ان پر اتنا چھایا ہوا ہے کہ نظموں میں بھی غزل کا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے۔

میراجی اور ن۔م راشد کی شاعری اشاریت سے مملو ہے۔ راشد کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے آزاد نظم کو اردو میں مقبول بنایا اور اپنے اسلوب اور الفاظ کے ترنم کے بل بوتے پر، بحر اور قافیہ کے سہاروں کو کامیابی کے ساتھ ترک کر دیا ہے۔

ہئیت اور اظہار کو عزیز رکھنے اور انہیں کلاسیکی معیاروں کے ساتھ برتنے والے شاعروں میں سکندر علی وجد بھی اہمیت رکھتے ہیں وہ غزل اور نظم دونوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ان کی غزل میں رومانیت کے ساتھ حقیقت نگاری کا پرتو بھی موجود ہے۔ نئے انقلابی تصورات ان کی نظموں اور غزلوں دونوں میں ملتے ہیں۔

چنانچہ ان کے موضوع، ان کی تشبیہیں اور استعارے، ان کی شاعری کو ایک نیا آہنگ بخشتے ہیں۔ وجد کی نظمیں تاج محل" اور " اجنتا" مرقع نگاری کے بڑے نفیس نمونے ہیں۔ " اجنتا" کا ایک اقتباس، اس کتاب کے پہلے باب کے آخر میں دیا گیا ہے۔

انقلابی عہد میں ہر ادبی تحریک، مواد کے ساتھ ہئیت کو بھی متاثر کرنے لگتی ہے۔ یہ درست ہے کہ انقلابی تحریکوں میں مواد پہلے

پہلے متاثر ہوتا ہے، اور ہیئت میں بھی بہ تدریج ارتقا عمل میں آتا ہے۔ لیکن بھارت کی زندگی میں اس عہد میں اتنے سارے سماجی، معاشی اور ادبی مسائل اٹھ کھڑے ہوتے تھے کہ ہمارے لکھنے والوں کو صبر و سکون سے بیٹھ کر سوچنے اور اپنے فن کو معنوی اور صوری حیثیت سے نکھارنے کے مواقع نہیں تھے اس لئے اس عہد نو کے طلوع ہی میں، مواد کے ساتھ روپ اور ہیئت میں بھی شکست و ریخت اور تعمیر نو کے رجحانات ابھرنے لگے۔

ناول اور افسانے

منشی پریم چند نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں اپنے عہد کے سماجی اور عوامی تقاضوں کی رعایت ہمیشہ ملحوظ رکھی۔ نئی انقلابی تحریکوں کی اشاعت کے بعد وہ جلد ہی ان کا ایک جز بن گئے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی تو وہ اس کے صدر منتخب کئے گئے تھے۔

پریم چند جیسے سربر آوردہ ادیب کے ترقی پسند تحریک میں شامل ہو جانے سے اس تحریک کو بڑا سہارا ملا۔ پریم چند اتنے بڑے فنکار تھے کہ انھوں نے محنت کش عوام اور خاص طور پر کسانوں کی زندگی کے جو نقشے اپنے ناولوں میں پیش کئے ہیں وہ بہت مؤثر نقشے ہیں۔

خاص طور پر ان کا ناول ,, گئو دان ،، دیہات اور کسانوں کی زندگی کا نفیس ترین مرقع مانا جاتا ہے ۔

اُردو میں ہیئت کے جو نئے نئے تجربے ہوئے ، ان میں قاضی عبدالغفار کا ناول ,, لیلیٰ کے خطوط ،، ایک دلچسپ تجربہ ہے قاضی صاحب ایک صاحب طرز انشاء پرداز ہیں ۔ ,, لیلیٰ کے خطوط ،، اٹھارویں صدی کے فرانسیسی اور انگریزی مکاتیباتی ناول کا ایک عمدہ نمونہ پیش کرتا ہے ۔ اس ناول میں ایک بیسوا کی آپ بیتی کے چوکھٹے میں سماج کی اس روندی ہوئی صنف کے جذبات کا احساسات کی حقیقت پسندانہ تصویر پیش کی گئی ہے ۔

حقیقت نگاری اور ترقی پسند ادب کی نئی تحریک نے جہاں کہنہ مشق ادیبوں کو متاثر کیا ۔ بہت سے نئے ادیبوں کو منظر عام پر لانے کا بھی باعث ہوئی ۔ اس تحریک کے آغاز ہی میں احمد علی اور رشید جہاں اور سجاد ظہیر نے سب سے پہلے اپنے قصوں کا مجموعہ ,, انگارے ،، شائع کر کے اردو دنیا کو چونکا دیا تھا ۔ احمد علی نے دہلی کے بے حس سماج اور خاص طور پر کبوتر بازوں کے کرداروں کے نہایت عمدہ نقوش اپنی کہانیوں کے ذریعے پیش کئے ہیں ۔

ناول اور افسانوں میں نئے تجربوں کا ایک نمونہ سجاد ظہیر کی

تصنیفہ "لندن کی ایک رات" بھی ہے۔ جو ایک مختصر ناول بھی کہلا سکتی ہے۔ اور ایک طویل افسانہ بھی۔ سجاد ظہیر نقاد بھی ہیں اور انہوں نے ایک دو اچھے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک، پریم چند کے اسکول کے افسانہ نگار ہیں۔ جن کے موضوع عموماً ادنے طبقے کے لوگوں کی زندگی، اس کی دل، کشی اور اس کی برائیاں ہوتی ہیں ان کا انداز سلیس اور اور دل کش ہے۔

اس اسکول کے دوسرے افسانہ نگار علی عباس حسینی اور سدرشن بھی ہیں۔ عوام کی زندگی سے بڑھتی ہوئی دلچسپی کے مدنظر دیوندر ستیارتھی نے ہندوستانی گیتوں کو اکٹھا کرنے کا بیڑا اٹھایا اور دیہات میں گھوم گھوم کر گیت جمع کئے جو "گائے جا ہندوستان" کے مجموعے میں شائع ہوئے ہیں۔

حقیقت نگاری اور فطرت نگاری کی طرف جو توجہ ہو گئی تھی اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ دیہات سے لوگوں کی دلچسپی بڑھنے لگی ہے۔ چنانچہ دیہاتی گیتوں میں زندگی کی کچھ ایسی حقیقتیں نظر آنے لگی ہیں جن کا شائبہ شہریوں کی زندگی اور اونچے طبقے کے ادب میں نہیں مل سکتا۔

کرشن چندر انقلابی دور کے غالباً سب سے زیادہ مقبول افسانہ نگار ہیں۔ ان کی طبیعت کے جوہر افسانے میں جیسے چمکتے ہیں۔

کسی اور صنف ادب میں نہیں چمکتے۔ کرشن چندر کی انسان دوستی اور اپنے مقصد کے ساتھ خلوص نے انہیں اپنے دور کے حقیقت نگار ادیبوں اور ترقی پسند مصنفین کی صف اول میں لا کھڑا کر دیا ہے۔ ان کی انسان دوستی ان کے بعض افسانوں میں بڑی حسین رومانیت اور فطریت کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔

کرشن چندر کا ناول "شکست" بعض حیثیتوں سے ایک الوکھا ناول ہے۔ جس میں ہندوستانی عورت کی بے چارگی اور مظلومیت کی کہانی بڑے موثر پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ جذبات کی عکاسی اور منظر کشی کرشن چندر کے فن کی خصوصیات ہیں۔ ان کے کچھ ناٹک جو "دروازہ" میں شائع ہوئے ہیں، فنی لحاظ سے ان کے افسانوں کے معیار کے نہیں ہیں۔

بھارت کی تقسیم کے بعد، جو انسانیت سوز ہنگامے برپا ہوئے تھے۔ وہ بھی کرشن چندر کے بہت سے افسانوں کے موضوع بنے۔ یہ ان کے اپنے ذاتی تجربے ہیں، جن پر انہوں نے اس خوبی سے لکھا ہے کہ پڑھنے والوں کی انسانی حس متحرک ہو جاتی ہے۔ بڑی خوبی کی بات ہے کہ ان تلخ واقعات کے بیان میں کبھی وہ اپنی انسانی دوستی کے جذبے کو نہ تو وہ سرحدوں میں بھٹکنے دیتے ہیں اور نہ مذہبی۔

اسلوب بیان کے لحاظ سے اور ان کے ناول اور ان کے

افسانے بہت دلچسپ ہیں انہیں زبان پر پورا قابو حاصل ہے اور ان کے اظہار کا انداز براہ راست اور سادہ ہوتا ہے۔ اس سادہ اسلوب میں نئی تشبیہوں اور انوکھی بندشوں سے وہ جان پیدا کر دیتے ہیں۔

علی عباس حسینی، راجندر سنگھ بیدی، اور عصمت چغتائی بھی مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان میں سے ہر ایک زندگی اور اس کے حقائق تک پہنچنے اور ان کو پیش کرنے کا اپنا اپنا مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہے۔

علی عباس حسینی اور بیدی، دونوں کے موضوع دیہات کی زندگی، اس کی دلچسپیاں اور اس کے مسائل ہیں۔

علی عباس حسینی اتر پردیش کے دیہات کی زندگی اور اس کے مسائل سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور ان کا انداز بیان سادہ اور سلیس ہے۔ انسان دوستی کا گہرا احساس بھی ان کے افسانوں میں نمایاں دکھائی دیتا ہے "سکھی" "بہو کی ہنسی" "ایک ماں دو بچے" ان کے دلچسپ افسانے ہیں۔

بیدی کے افسانوں میں حقیقت اور رومانیت کا ایک خوشگوار امتزاج ملتا ہے۔ وہ اس امر کے قائل ہیں کہ حقائق کو من وعن پیش کر دینے کی بجائے اسے تخیل اور رومانیت کے

امتزاج کے ساتھ پیش کرنا چاہیئے۔ نچلے طبقوں کی زندگی کے نقشے وہ بڑی خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ زندگی کی تلخیوں کو پیش کرنے کا ان کا خاص انداز ہے۔ محبت اور ہمدردی بنا دیتے ہیں۔

عصمت چغتائی کے ناول اور افسانے بھی اپنے گوناگوں رجحانات کی وجہ سے معرکتہ الآرا رہے۔ کہانی کہنے اور لطف کے ساتھ کہنے کا انہیں بڑا سلیقہ ہے، اور زندگی کے انوکھے پہلو وہ اپنے موضوعات کے لئے انتخاب کر لیتی ہیں۔ متوسط اور نیچے طبقوں کے مصائب اور خاص طور پر عورتوں کی زندگی کے آلام کو پیش کرتے ہوئے وہ سماج کے من مانے نظام پر بڑے گہرے طنز بھی کرتی ہیں۔ ان کا ناول "ٹیڑھی لکیر" اس عہد کے عمدہ ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔

عصمت چغتائی کے افسانوں کے بعض موضوعات نے ان میں اور سعادت حسن منٹو میں مشابہت پیدا کر دی ہے۔ منٹو زندگی کو ایک مخصوص نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ فرائیڈ کے نظریوں کے تحت دبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

انہیں عام اور معتدل زندگی سے ہٹے ہوئے موضوعات اور جنسی موضوعات سے بہت دلچسپی ہے۔ اسی لئے ترقی پسند

ادیب بھی جو تنگنائے حیات اور اس کے مسائل کو پیش کرنے میں تھوڑی سی بہت فراخی روا رکھتے ہیں. منٹو کے رجحانات پر معترض ہوتے ہیں۔ انہیں منٹو میں انسانیت اور محبت کا وہ احترام نظر نہیں آتا جو اونچے ادیب کی شان ہوتی ہے

عصمت چغتائی کے یہاں بھی اسی طرح کے رجحانات نمودار ہوئے تھے لیکن انھوں نے ان پر جلد ہی قابو پالیا۔

سماجی زندگی کو اخلاقی معیاروں کے ساتھ پیش کرنے میں صالحہ عابد حسین کا ناول "آتش خاموش" بڑی اہمیت رکھتا ہے صالحہ عابد حسین نے جو حالی کی نواسی ہوتی ہیں۔ حالی پر اچھی تنقید بھی لکھی ہے

تنقید

شاعری، افسانہ اور ناول کی طرح اردو تنقید بھی اس انقلابی دور میں نئے نئے مسائل سے دوچار ہونے لگی۔ اس وقت تک اردو تنقید میتھو آرنلڈ، ملٹن، بیکن، ورڈسورتھ، کولرج، رسکن، وکٹر ہوگو، کوسائیں، سانت بو، ہرڈر، شوپن ہاور، نطشے وغیرہ کے تنقیدی اصولوں اور ادبی تصورات سے روشناس تھی لیکن اس عہد میں ہمارے ادیبوں اور نقادوں کے وسیع تر

ذہنی رشتے اور یورپ کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے لکھنے والوں سے ان کی واقفیت نے ان کے سامنے یورپ کی دوسری زبانوں کے نقادوں اور ان کے اصولوں اور نظریوں سے واقفیت کی راہیں کھول دیں۔

چنانچہ موجودہ عہد میں نئے تنقیدی اصولوں کی فراوانی نظر آتی ہے۔ ادب کی ماہیت، اس کے مقصد، مصرف اور اس کی خصوصیات کے بارے میں بھی کافی وسیع سرمایہ پیدا ہو گیا ہے ادب اور تنقید کے نظریوں میں جن ادیبوں اور مفکروں کے نظریات اور تصورات اس زمانے میں روشناس ہوئے۔ ان میں اینگلز، رچرڈز، اسکاٹ جیمز، ڈنکل وغیرہ کے علاوہ مارکس اور لینن بھی قابل ذکر ہیں۔

اردو کے پرانے نقادوں میں سے مولوی عبدالحق، نیاز فتحپوری اور عبدالماجد دریابادی نے سنجیدہ علمی اور محققانہ تنقیدوں کا بڑا اچھا سرمایہ چھوڑا، لیکن ان اساتذہ کی تنقیدیں زیادہ تر ذوقی تنقیدیں ہیں۔ اس کے مقابلے میں اس عصر کے تنقید نگار، جدید ترین نظریوں کو اردو پڑھنے والوں سے روشناس کرانے کا باعث ہوئے ہیں۔

موجودہ عصر میں تنقید پر لکھنے والوں کی تعداد بہت وسیع ہے بلکہ ہر صاحب قلم تنقید بھی لکھ سکتا ہے اور لکھ رہا ہے، اور

اس طرح جو تحریریں فراہم ہو گئی ہیں ان میں تنقید کے اصولوں اور نظریوں کے بارے میں بھی تھوڑا بہت مواد اکٹھا کر دیا گیا ہے اس کے علاوہ پرانے اور نئے ادیب پر تنقیدوں کا بھی کافی سرمایہ فراہم ہو گیا ہے۔ ان ادیبوں میں سے مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، فراق گورکھپوری، اور خواجہ احمد فاروقی نے نقاد کی حیثیت سے ایک گونہ تخصیص حاصل کر لی ہے۔

ان نقادوں کی مساعی نے اصولی تنقید کے بارے میں مغرب کے سر برآوردہ مفکرین کے نظریوں سے روشناس کرایا اور ادب کے نئے نئے گوشوں پر روشنی ڈالی۔

اس کے علاوہ ان کی تحریروں نے عملی تنقید کا بھی کافی وسیع سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔ یہ تنقیدیں اپنی معلومات کی وسعت لب و لہجہ کی سنجیدگی اور اسلوب بیان کی شگفتگی کی وجہ سے اردو کا شائستہ ادبی سرمایہ بھی ہیں۔

اردو تنقید کو نئی راہوں پر ڈالنے اور اسے نئی وسعتیں عطا کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، اس کے نتیجے کے طور پر، تنقید کے نئے نئے پہلو اجاگر ہو رہے ہیں۔ چنانچہ حکمی تنقید، ذوقی تنقید، تنقید اور ادب، غرض اس موضوع کے سارے پہلوؤں پر ازسر نو نظر ڈالی گئی ہے۔

تنقیدی معیار کو اونچا اٹھانے کی اس ہمہ گیر خواہش کے

باوجود اور عملی تنقیدوں کی جد وجہد کی اس فراوانی کے دور میں تنقیدی اصولوں اور نظریوں پر مستقل، مربوط اور بسیط کتابیں بہت کم لکھی گئی ہیں " روح تنقید"، آج سے تیس برس پہلے لکھی گئی تھی. اور " تنقیدی اصول اور نظریئے " بھی، جو کچھ بعد میں .... لکھی گئی، ان افکار پر حاوی نہیں ہے، جو بعد کے لکھنے والوں نے نشوونما دیئے ہیں۔ صرف بعض تنقیدی مضامین کے مجموعوں میں ایک آدھ مضمون، تنقید کے اصولوں سے متعلق بھی مل جاتا ہے۔

تنقیدی مضامین یا عملی تنقیدوں کے جتنے مجموعے اس دور میں شائع ہوئے ہیں، وہ کسی دور میں بھی شائع نہیں ہوئے۔ ان میں مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، فراق گورکھپوری ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر اختر اورینوی ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وقار عظیم، ادیس احمد ادیب، اور چند اور نقادوں کے مجموعے اہمیت رکھتے ہیں. تنقید کے ارتقاء کی تاریخ لکھنے والا بعد میں تنقیدی ادب کے ذخیرے سے نظریوں اور اصولوں کو اخذ کرکے کتاب مرتب کرسکتا ہے۔ اس وقت ادبی تنقید کے ارتقاء کی ایک مبسوط تاریخ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے " اردو تنقید کا ارتقا " کے نام سے مدون کی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔

ڈراما

اُردو میں پرانے عہد کے پانچ یا تین منظری ناٹکوں کو بہت زیادہ فروغ نہیں ہو سکا۔ کچھ ڈرامے جو موجود ہیں زیادہ تر انگریزی کے مشہور ڈراما نگاروں اور خاص طور پر شیکسپیر کے ترجمے ہیں۔ جو ناٹک کمپنیوں کی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے لکھے گئے تھے۔ ان میں ”خون ناحق“ (ہیملٹ) ”بزم فانی“ (رومیو جولیٹ) ”چلتا پرزہ“ ”صید ہوس“ (کنگ جان) ”شہید ناز“ (میژر فار میژر) قابل ذکر ہیں۔

کچھ ناٹک ہندوستانی دیومالا یا تاریخی حصوں پر بھی مبنی تھے جن میں ”بلوا منگل“ ”آنکھ کا نشہ“ ”بن دیوی“ ”ہریشچندر“ ”سنسار“ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ڈراما نگاری اسٹیج منشی مراد علی مراد، سید مہدی حسن احسن لکھنوی اور خاص طور پر آغا حشر کاشمیری کی مساعی کی مرہون منت ہیں۔

جدید دور میں زندگی کی بڑھتی ہوئی مصروفیتوں اور میقاتی رسالوں کی ضرورتوں نے جہاں کہانی یا مختصر قصے کو نشوونما دیا ایک منظری ڈراما یا ایکانکی ناٹک کو بھی فروغ دیا۔

یک منظری ناٹک کو اردو میں جامعہ ملیہ دہلی کے ادیبوں،

ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور پروفیسر محمد مجیب نے بہت مقبول بنا دیا تھا۔ ان ادیبوں کے لکھے ہوئے ناٹکوں نے یک منظری ناٹک لکھنے کا ذوق پھیلایا۔ چنانچہ حقیقت نگار گروہ سے تعلق رکھنے والے اکثر ادیبوں نے ڈراما کی طرف توجہ کی اور ان کے معیار کو کافی بلند کیا۔

ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے ادیبوں میں سے بعضوں نے اچھے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ڈراما بھی سیاسی، ادبی اور سماجی تصورات کی اشاعت کا ذریعہ بنا ہے۔

کرشن چندر کے مجموعہ "دروازہ" میں کئی دلچسپ اور موثر ڈرامے ہیں۔ جن میں "دروازہ" "شیل کنٹھ" اور "سرائے سے باہر" واقعات کی ترتیب اور ڈراما کی پیش کشی کے لحاظ سے عمدہ ڈرامے ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک جو اچھے افسانہ نگار ہیں، ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔ اس زمانے کے ادیبوں میں سعادت حسن منٹو نے شاید سب سے زیادہ ڈرامے لکھے ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر ریڈیو ڈرامے ہیں۔ ہمارے زمانے میں ڈراما نگاری کا بڑا محرک آل انڈیا ریڈیو رہا ہے۔ اور بعض اچھے ڈرامے اسی کی تحریک پر وجود میں آئے۔

انشائیہ یا مضمون

انشائیہ یا مضمون نگاری، جدید عہد کے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ایک نہایت سہولت بخش صنف کی حیثیت سے پہنچی اور اس عہد کی سیاسی، سماجی اور ادبی ضرورتوں کے مدنظر بہت جلد مقبول ہو گئی چنانچہ ماسٹر رام چندر، سرسید، ذکا اللہ اور محمد حسین آزاد کے زمانے سے اس صنف ادب نے نئے سماجی، معاشی اور ادبی تصورات اور خیالات کی اشاعت میں بڑی مدد دی۔ اور اردو دنیا میں بیداری پھیلانے کا ذریعہ بنی رہی۔ علی گڑھ تحریک اور اس کی مخالف تحریکیں خاص طور پر "اودھ پنچ"، اور اس کے ہم خیالوں کی تحریکیں انشائیہ کے بل بوتے ہی پر آگے بڑھیں۔

اردو ادب کے موجودہ عہد کو بعض وقت انسانوں اور انشائیوں یا مضمون نگاری کا عہد کہا گیا ہے۔ ان دونوں اصناف میں تحریروں کی فراوانی کو دیکھتے ہوئے یہ بات غلط بھی نہیں معلوم ہوتی۔ اردو کے تمام کہنہ مشق لکھنے والے اور نومشق سب ہی انشائیے کو برت رہے ہیں۔ چنانچہ موجودہ عصر کے انشائیہ نگاروں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ جاتی ہے۔ تاہم ان میں جو سربر آوردہ لکھنے والے ہیں۔ ان کی تعداد بہت بڑی نہیں ہے۔ ان میں کبھی آل احمد سرور، احتشام حسین،

اختر اورینوی، مجنوں گورکھپوری، اختر رائے پوری، فراق گورکھپوری ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر عبادت بریلوی قابل ذکر ہیں۔ ان ادیبوں نے نئی ادبی بیداری اور تنقیدی شعور کو پھیلانے میں انشائیہ اور مضمون سے جتنا کام لیا ہے، کسی اور ادبی صنف سے نہیں لیا۔ اسی لئے انشائیہ کی صنف اردو میں اس وقت کافی نشوونما پا چکی ہے، اور اس میں اظہار کے اچھے اچھے سانچے مہیا ہو گئے ہیں۔

ختم شد

گلشن پبلیشرز سرینگر کی مطبوعات

۱۹۹۲ — ۹۳

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱	اردو کشمیری بول چال	مفتی محمد مقبول	۱۵/-
۲	مولانا سید ابوالحسن ندوی تعارف	پیرزادہ مقصود احمد	۲۵/-
۳	تلاش	میر محی الدین	[illegible]
۴	کیڑے	ابن اسماعیل	۲۵/-
۵	رہنمائے معلمین اردو	ڈاکٹر دیوا ندر گپتا	۵۰/-
۶	اردو کی ادبی تاریخ	پروفیسر عبدالقادر سروری	۵۰/-
۷	شباب کشمیر	محی الدین فوق	۵۰/-
۸	جموں کشمیر کے کوچر	آر۔ آر۔ کھجوریہ	۳۵/-
۹	مختصر تاریخ کشمیر	محمد امین پنڈت	۲۵/-
۱۰	ایک چہرہ پرچھائیاں کا	ڈاکٹر شکیل الرحمن	۱۵/-
۱۱	نفسیات اور تعلیمی مسائل	عبدالاحد شاہ	۲۰/-
۱۲	کشمیر اور ڈوگرہ راج	فضل حسین	۲۰/-
۱۳	اقبال کی مابعد الطبعیات	عشرت حسین انور	۵۰/-
۱۴	گھر سے مسجد تک	سید محمد سید قادری	۴۰/-
۱۵	عشق رسول	ڈاکٹر محمد طاہر	۵۰/-
۱۶	ذکر حبیب مکمل سیٹ	"	۱۵۰/-
۱۷	تفسیر اقبال	بہار الہ آبادی	۷۵/-
۱۸	تاریخ اقوام کشمیر مکمل سیٹ	محی الدین فوق	۲۲۵/-
۱۹	ارمغان شیدا	مرزا کمال الدین شیدا	۴۵/-
۲۰	خلاصۃ التواریخ	"	۹۰/-
۲۱	اقبال اور نظریۂ خودی	سید محمد سید قادری	۳۵/-
۲۲	کشمیری مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد	مرزا شفیق حسین	۴۰/-
۲۳	اردو طنز و مزاح	ابن اسماعیل	[illegible]
۲۴	تعلیل و تاویل	ظہور الدین	[illegible]
۲۵	ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب	حامدی کشمیری	[illegible]
۲۶	ولی عہد	ڈاکٹر کرن سنگھ	[illegible]
۲۷	سید میر علی ہمدانی	ڈاکٹر سید [illegible]	[illegible]
۲۸	معارف غوث اعظم	شیخ عبدالقادر [illegible]	[illegible]
۲۹	دست قضا	ابن اسماعیل	[illegible]
۳۰	وسطی دور	ایس۔ ایم۔ الیاس	[illegible]
۳۱	تصویر کشمیر	ڈاکٹر ایم۔ ایس۔ ناز	۱۸۰/-
۳۲	بہجۃ الاسرار		[illegible]
۳۳	اردو کے تصنیفی و تالیفی ادارے	دیو ندر گپتا	۷۵/-
۳۴	لالہ دید اردو	جیالال کیرو	۹۰/-
۳۵	اقبال اور فنون لطیفہ	ڈاکٹر شکیل الرحمان	۲۵/-
۳۶	درد جگر	محمد شفیع محجوب	۴/-
۳۷	نظم و نسق مدرسہ و اصول تعلیم	عبدالاحد شاہ	۲۰/-
۳۸	تعلیم بالغان	محمد اقبال	۲۰/-
۳۹	رہبر بالغان	"	۲۰/-
۴۰	اقبال ایک سیاستداں	محمد صدیق قریشی	۱۰۰/-
۴۱	چراغ حرم	ابن اسماعیل	۶۰/-